إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ
شیعیت
تحلیل وتجزیہ
محمد نفیس خاں ندوی
ادارہ اشاعت حق
ڈی-۱۰۱، فرسٹ فلور، رزاق کامپلکس، مولوی گنج، لکھنؤ

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُواْ دِيْنَهُمْ وَكَانُواْ شِيَعاً لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ﴾

شیعیت

تحلیل و تجزیہ

مصنف

محمد نفیس خاں ندوی

ناشر

ادارہ اشاعت حق-لکھنؤ

طبع دوم

ذی الحجہ ۱۴۳۷ھ - ستمبر ۲۰۱۶ء

ادارہ اشاعت حق-لکھنؤ

نام کتاب :شیعیت-تحلیل وتجزیہ

مصنف :محمد نفیس خاں ندوی

تعداد اشاعت :۵۵۰

صفحات :۳۳۶

قیمت :-/Rs. 200

ملنے کے پتے :

☆ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی

☆مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، ☆ مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ

☆ مکتبۃ الشباب العلمیۃ، ندوہ روڈ لکھنؤ

محمد نفیس خاں ندوی

(Email- nafeesnadwi@gmail.com)

شیعیت کی تاریخ

امامت-شیعیت کی اساس

تقیہ اور کتمان

شیعہ اور قرآن

متعہ کا عقیدہ

بداء کا عقیدہ

رجعت کا عقیدہ

تناسخ کا عقیدہ

مذہبی رسومات وتقریبات

یہودیت اورشیعیت کا باہمی امتزاج

شیعوں کے اعتراضات اوران کے جوابات

شیعہ-اکابر امت کی نظر میں

حرف آخر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نذر عقیدت

تاریخ انسانی کا یہ وہ عہد زریں ہے جس کے حدود اربعہ چالیس لاکھ مربع میل پر مشتمل ہیں، اس عظیم الشان مملکت میں مہذب ترین انسانی آبادی کا ملجا و ماویٰ، ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مقصود، ریگزارِ حجاز کا مرکزی مقام مدینۃ الرسول (ﷺ) ہی ہے، قیصر وکسریٰ کی ہزار سالہ عظیم الشان سلطنتیں صفحۂ ارضی سے نیست و نابود ہو چکی ہیں، ذات پات، حسب ونسب، بے جا فخر وافتخار کے سارے بت پاش پاش ہو چکے ہیں، وحدت دین، وحدت فکر اور وحدت انسانی کا یہ عدیم المثال دور ہے، امن وفراغت، آسودگی وخوشحالی اور للّٰہیت کا یہ عالم ہے کہ کوئی زکوۃ قبول کرنے والا نہیں ملتا، اس عظیم الشان سلطنت کا فرمانروائے اعظم وہ ہستی ہے جو علم الٰہی میں ”رحماء بینھم“ ہے، ملاء اعلیٰ کی زبان میں ”ذوالنورین“ ہے، ساکنین سطح ارضی کی زبان میں ”أمیر المؤمنین“ ہے اور حجاز کے بدو اسے عثمان بن عفانؓ کے نام سے بھی جانتے اور پہچانتے ہیں۔

ناطق بالصدق والصواب خلیفۂ دومؓ مجوسیت کے بغض وکینہ کا شکار ہو چکے ہیں، یہودیت ابن سبا کی شکل میں اپنے بال وپر نکال چکی ہے، ”رحماء بینھم“ کی نرم دلی، رحمت ورأفت اور تواضع وانکساری نے یہودیت ومجوسیت کو گٹھ جوڑ کا موقع دے دیا ہے، سبائیت نے پوری مملکت میں تخریبی سرگرمیوں، افواہوں اور پروپیگنڈہ کا جال پھیلا رکھا ہے، امیر المؤمنین کو خبریں پہنچتی ہیں تو وہ سب کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر تخریبی عناصر مدینہ میں گھس کر قصر امارت کو گھیر لیتے ہیں، جلیل القدر صحابہ وتمام بزرگ

ہستیاں خدمت عالیہ میں حاضر ہو کر عرض کرتی ہیں:

''امیر المؤمنین! آپ حکم دیجیے کہ ان باغیوں اور سرکشوں کو بزور شمشیر مدینہ سے باہر نکال دیا جائے، ہم گرچہ مختصر ہیں لیکن ان کے لیے کافی ہیں۔''

امیر المؤمنین نے فرمایا: ''نہیں میرے بھائیو! مجھے کسی قیمت یہ گوارہ نہیں کہ میری ذات کی خاطر نبی کریم (ﷺ) کے شہر میں خون کا ایک قطرہ بھی گرے، میں ہر ایک کو خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ اپنی تلواریں نیام میں رکھ لیں، مجھے یہ بھی گوارہ نہیں کہ میری خاطر کسی صاحب ایمان کا پچھنے کے برابر بھی خون بہے۔''

تاہم چند نوجوان صحابہ دروازہ پر تعینات ہو جاتے ہیں، کچھ جھڑپیں بھی ہوتی ہیں لیکن باغی عقبی دیوار پھاند کر اندر گھس جاتے ہیں اور روئے زمین کی اس عظیم الشان سلطنت کے اس افضل ترین انسان کو بے رحمی سے شہید کر دیتے ہیں۔

ملت اسلامیہ کا یہ وہ المیہ ہے جو آگے چل کر جمل وصفین کے معرکوں میں ہزاروں شہادتوں کا موجب بنا، مگر شہادت عثمانؓ کا یہ قصاص بھی صاحب قدر و قضا کے نزدیک پورا نہ اترا، اور ربع صدی تک پورا عالم اسلام خاک وخون میں تڑپتا رہا، اور فتنوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا آج بھی وہ شیعیت کی شکل میں پنپ رہا ہے۔

بندہ ناچیز اپنی حقیر ترین کوشش کا یہ نذرانہ اسی عظیم ترین ومظلوم ترین شخصیت، **شهید اعظم حضرت ذوالنورینؓ** کے حضور میں عقیدتمندانہ پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے، اس دعا کے ساتھ کہ اللہ رب العزت اسے قبول فرمائے اور اس شہید اعظم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس سعادت میں راقم کے والدین، اہل خانہ، جملہ اساتذہ کرام، تمام معاونین کو بھی شریک فرمائے، اور خاص کر استاذ محترم داعی اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کے لیے صدقہ جاریہ فرمائے جن کی خصوصی توجہ اور ہمت افزائی سے یہ سعادت نصیب ہوئی۔ آمین!

یکم محرم الحرام ۱۴۳۷ھ (جمعرات) — محمد نفیس خاں ندوی

شیعیت کی تاریخ

تاریخی پس منظر

اللہ کے رسول (ﷺ) کی بعثت کے وقت دو طاقتیں اس ربع ارضی پر حکمراں تھیں، ایک عیسائی اور دوسرے مجوسی، مگران دونوں طاقتوں کے علاوہ ایک تیسری طاقت یہودیوں کی بھی تھی جو کسی ملک کی حکمراں تو نہ تھی مگران دونوں طاقتوں سے زیادہ خطرناک، چالاک اوراپنے عیارانہ حربوں میں بے مثال تھی۔

اسلام کی آمد اوراس کی اشاعت سے سب بڑا دھکا یہودیوں اور مجوسیوں کو لگا تھا، ان کی چودہراہٹ اور اقتدار عالم کی آرزؤں پر کاری ضرب لگی تھی، اسی وجہ سے انہوں نے اول وقت سے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف سازشیں رچیں اور مسلم طاقت کو کمزور کرنے کی سعی پیہم کی، مگر جب ان کی تمام تدابیر مسلمانوں کے ایمان ویقین کے سامنے ٹھہر نہ سکیں اور جذبۂ جہاد سے لبریز کائنات کی عظیم ہستی کے ساتھیوں نے میدان جنگ میں ارباب کفروشرک کو پسپا کردیا تو انھوں نے اپنے طریقۂ کار میں نمایاں تبدیلی پیدا کی، اور اسلام کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں پر فکری یلغار اوران کے اعتقادات کو پاش پاش کرنے کی خفیہ جدوجہد شروع کی، جس میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے، اوران کی کامیابیوں ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ''شیعیت'' پوری مضبوطی کے ساتھ عالم اسلام کے سینہ پر مونگ دل رہی ہے۔

شیعیت کا آغاز یہودیت اور مجوسیت کے گٹھ جوڑ اوران کی سازشوں کے نتیجہ میں

ہی ہوالیکن اس کے تاریخی اسباب اور خفیہ سازشوں کا جاننا بھی ضروری ہے تاکہ شیعیت کی حقیقت اور اسلام واہل اسلام کے خلاف ان کے منصوبوں کو سمجھنا آسان ہو سکے۔

یہودیت

سرکار دو عالم (ﷺ) کی ہجرت کے وقت مدینہ میں مشرکین عرب کے دو بڑے قبائل اوس وخزرج آباد تھے، ان دونوں کے علاوہ رومی مظالم سے بھاگ کر آنے والے یہودی بھی بڑی تعداد میں یہیں بسے ہوئے تھے، ان یہودیوں نے گرچہ عربوں کی بود و باش اختیار کر لی تھی لیکن نسلی عصبیت اور قومی تفاخر میں ہمیشہ گرفتار رہے، جادوٹونا، فال گری اور کچھ مذہبی تعلیمات رکھنے کی وجہ سے خود کو صاحب علم وفضل سمجھتے تھے، اور اسرائیلی عصبیت کی وجہ سے خود کو قائد وپیشوا اور عربوں کو نہایت حقیر جانتے تھے، اپنے سازشی ذہن، تلون مزاجی، مفاد پرستی اور دولت کمانے کے فن میں مہارت کی بنا پر رفتہ رفتہ مدینہ کی معیشت پر ان کا کنٹرول ہو گیا، جس میں سب سے اہم رول ان کے سودی نظام کا تھا، وہ عرب کے شیوخ اور سرداروں کو بڑی بڑی رقمیں سودی قرض پر دیتے، جسے وہ شیوخ اپنے نام ونمود اور حصول شہرت میں خرچ کر دیتے، ان قرضوں کے بدلے یہودی ان کی زمینیں، باغات اور گھر وغیرہ بطور رہن رکھ لیتے اور ایک مدت گذرنے کے بعد وہ ان کے مالک بن جاتے۔

اس کے علاوہ جنگ وفساد کی آگ بھڑکانے میں بھی یہ بہت ماہر تھے، قبائل کو ایک دوسرے کے خلاف اکساتے پھر ان کی جنگوں کا تماشہ دیکھتے، انصاری قبیلے؛ اوس اور خزرج کے مابین سالوں چلنے والی جنگ بُعاث کی آگ بھی انہی کی بھڑکائی ہوئی تھی، ان جنگوں کی وجہ سے ان کے سودی کاروبار کو زبردست فائدہ حاصل ہوتا، اس طرح مدینہ پر گویا انہی کی حکمرانی تھی۔

مدینہ میں یہودیوں کے تین مشہور قبیلے آباد تھے: ۱- بنو قینقاع ۲- بنو نضیر،

۳-بنوقریظہ۔بنوقینقاع کا قبیلہ مدینہ کے اندر آباد تھا اور خزرج کا حلیف تھا، یہ قبیلہ فن سپہ گری، سناری اور ہتھیار سازی میں ماہر تھا جبکہ بنونضیر کا قبیلہ مدینہ منورہ سے دو تین میل کی دوری پر وادی بطحان کی بلندی پر رہتے تھے جو کھجوروں اور کھیتوں سے مالا مال تھی اور بنوقریظہ مدینہ کے جنوب میں چند میل پر واقع مہزور کے علاقے میں رہتے تھے،ان تین بڑے قبیلوں کے ماتحت متعدد شاخیں بھی تھیں، تاہم ان قبیلوں میں آپسی رنجشیں بھی قائم تھیں۔(۱)

یہودیوں کا مقصد مدینہ کی معیشت کے ساتھ ساتھ وہاں کی سیاست پر بھی قبضہ کرنا تھا،لیکن عربوں کے قبائلی مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ ممکن نہ تھا کہ زمام اقتدار وہ خود سنبھال سکتے، چنانچہ انھوں نے عبداللہ ابن اُبی ابن سلول کو اپنا آلۂ کار بنایا، اور اس کی تاج پوشی کی تیاریاں شروع کردیں،لیکن اسی دوران اللہ کے رسول (ﷺ) نے مکہ سے ہجرت فرمائی، اور مدینہ منورہ تشریف لے آئے، اور پھر یہ علاقہ مسلمانوں کا ایک مضبوط قلعہ بن گیا، جس کی وجہ سے ایک طرف عبداللہ ابن ابی کی حسرتوں پر پانی پھر گیا تو دوسری طرف اس کی سیدھی چوٹ یہودیوں کے مقاصد پر پڑی اور ان کا خواب چکنا چور ہوا، ان کے مذہبی وقار میں کمی آنے لگی، ان کا معاشی نظام بری طرح متاثر ہوا اور مشرکین میں پھیلتی ہوئی یہودیت دفعۃً رک گئی۔

خیال رہے کہ یہودی خود کو انبیاء کی اولاد میں شمار کرتے تھے، اور انھیں نبی کریم (ﷺ) کی بعثت کا نہ صرف یقین تھا بلکہ پوری شدت سے وہ منتظر بھی تھے، جس کے تحت حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ یہودی سب سے پہلے اسلام قبول کرتے اور اس کے زبردست حامی و پشت پناہ ثابت ہوتے،لیکن چونکہ نبی کریم (ﷺ) کی ولادت اور بعثت ان کے خاندان میں نہیں ہوئی تھی اور آپ (ﷺ) کی تعلیمات اُس یہودیت کے بالکل خلاف تھی جس کے وہ مدعی و مبلغ تھے، چنانچہ انھوں نے اسلام کی

(۱) نبی رحمت: صفحہ ۲۳۰، از مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

مخالفت کو ہی اپنا نصب العین بنالیا اور مسلمانوں سے سخت نفرت کرنے لگے، اور کسی بھی قیمت پر اسلام کی اشاعت انھیں گوارہ نہ تھی، تاہم اپنے بزدلانہ مزاج اور عسکری کمزوری کی وجہ سے ان کے اندر کھل کر مقابلہ کی ہمت نہ تھی، چنانچہ انھوں نے اپنا طبعی طریقہ اختیار کیا اور مسلمانوں کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی سازشیں شروع کیں، اور اپنے ہمنواؤں کی ایک بڑی تعداد کو اسلام کے لبادہ میں مسلمانوں کی جماعت میں شامل کردیا، اور اس طرح انھوں نے اسلام کے قلعہ میں پہلا نقب لگانے اور مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش شروع کی لیکن جلد ہی ان کی ان کوششوں نے خود انھیں ایک فرقہ بنادیا اور تاریخ اسلام میں وہ ''منافقین'' کے نام سے جانے گئے، قرآن مجید میں ان کی انہیں کوششوں کی طرف اشارہ ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعاً﴾ (الروم:۳۲) (اوران مشرکوں میں سے نہ ہوجانا جنھوں نے ان کے دین میں تفریق پیدا کی اور وہ شیعہ (ایک فرقہ) ہوگئے)

﴿إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُواْ دِينَهُمْ وَكَانُواْ شِيَعاً لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ﴾ (الانعام:۱۵۹) (بے شک جن لوگوں نے ان کے دین میں تفرقہ ڈالا وہ شیعہ (ایک فرقہ) تھے، تمھارا ان سے کوئی تعلق نہیں)

میثاق مدینہ

اللہ کے رسول (ﷺ) نے مدینہ منورہ پہنچ کر سب سے پہلے اوس وخزرج کے انصار اور مہاجرین کے مابین مؤاخات کراکر انھیں ایک لڑی میں پرودیا، اور سالوں سے چلنے والی آپسی دشمنی کو پیار ومحبت میں تبدیل کردیا، پھر چونکہ مسلمانوں کا بنیادی مقصد مذہب اسلام کی اشاعت اور اس کا استحکام تھا جس کے لیے اندورنی امن وسکون سب سے زیادہ ضروری تھا، اس لیے اللہ کے رسول (ﷺ) نے مدینہ اور اس کے اطراف کے مشرک قبائل کے ساتھ امن وامان کا ایک تحریری معاہدہ کیا، جس میں اس

بات کی ضمانت تھی کہ کوئی کسی کے حقوق پر دست درازی نہ کرے گا، اور بیرونی دشمن کے مقابلہ میں متحد ہوکراس کا سامنا کریں گے۔عرب کے قبائل آپسی جنگوں سے نڈھال ہو چکے تھے، اور انھیں بھی امن وسکون کی ضرورت تھی اور چونکہ مسلمانوں اور مشرک قبیلوں کے مابین کسی قسم کا تعارض بھی نہیں تھا اسی لیے کسی نے بھی اس معاہدہ سے انکار نہیں کیا۔

مدینہ کے یہودعرب قبیلوں اور سرداروں کی حمایت میں رہتے تھے اس لیے انھیں بھی اس معاہدہ میں شریک ہونا پڑا، مسلمانوں کے بڑھتے رسوخ اوراوس وخزرج کی مواخات کے سامنے انھوں نے معاہدہ کرنا ہی غنیمت سمجھا، چنانچہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جن امور پر معاہدہ ہوا تھا وہ حسب ذیل تھے:

۱-یہودیوں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات دوستانہ ہوں گے۔

۲-خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے رائج تھا وہ بدستور قائم رہے گا۔

۳-یہودیوں کو ان کے مذہب کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔

۴-کوئی فریق قریش کو امان نہیں دے گا۔

۵-مدینہ پر کوئی حملہ ہوا تو دونوں مل کر دفاع کریں گے۔

٦-یہود یا مسلمان کو کسی سے بھی جنگ کی نوبت آئے گی تو ایک فریق دوسرے فریق کی مدد کرے گا۔

۷-کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی کرے گا، البتہ مذہبی لڑائی اس سے مستثنٰی رہے گی۔(۱)

یہودیوں نے حالات کے پیش نظر مسلمانوں سے سمجھوتہ تو کرلیا تھا لیکن جلد ہی اپنی معاندانہ روش کا اظہار کرنے اور منافقوں کے ساتھ مل کر زیر زمین سازشیں کرنے لگے۔اللہ کے رسول (ﷺ) کی مجلس میں پہنچتے تو **السلام علیکم** (تم پر سلامتی ہو)

(۱) تفصیلات کے لیے دیکھئے: سیرت ابن ہشام، اور ”مجموعة الوثائق السياسية فی العهد النبوی والخلافة الراشدة“

کے بجائے السام علیکم (تمہاری موت ہو) کہتے، نامعقول اور غیر منطقی چیزوں کی فرمائش کرتے، الٹے سیدھے سوالات کرتے تاکہ مسلمان تشویش میں مبتلا ہوں، مومنوں میں شبہات پیدا کرنے کے لیے صبح کو اسلام قبول کرتے اور شام ہوتے ہوتے مرتد ہوجاتے، گاہے گاہے قبائلی اور جاہلی تعصّبات کو ہوا دیتے، حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عصمت پر تہمت لگائی، آنحضرت (ﷺ) کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی سازش رچی، اس کے علاوہ مدینہ کی ساری خبریں مکہ کے مشرکین تک پہنچاتے اور جنگوں میں چوری چھپکے ان کی ہتھیاروں اور پیسوں سے مدد بھی کرتے۔

بنوقینقاع کی عہد شکنی

بنوقینقاع کا قبیلہ سب سے مضبوط قبیلہ تھا، فن سپہ گری میں کسی کو اپنا ثانی نہیں سمجھتا تھا، سناری اور اسلحہ سازی کے ساتھ ساتھ بازار کے چودھری بھی تھا، ایک بازار کا نام بھی اسی سے منسوب تھا، اپنی بہادری وجوانمردی پر اسے بڑا غرّہ تھا، مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ میں وہ بھی شریک تھا لیکن اس کے نزدیک اس معاہدہ کی کوئی اہمیت نہ تھی، مدینہ کے اندرون میں آباد ہونے کی وجہ سے مسلمانوں سے آئے دن چپقلشیں ہوتی رہتیں، منافقین کا گروہ بھی اس کی سرپرستی میں تھا، اپنی فتنہ انگیزیوں سے مسلمانوں کو ہراساں کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا، جنگ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی پر اس قبیلہ کو خاص کر دلی تکلیف پہنچی تھی، مسلمانوں کی کامیابی دیکھ کر بنوقینقاع کے سینہ پر سانپ لوٹ جاتے، وہ فقرے کستے، طنز کرتے، کمزوروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے، رفتہ رفتہ حالات کشیدہ اور خراب ہوتے گئے، اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ ایک دن ایک مسلم خاتون بنوقینقاع کے محلّہ میں دودھ بیچنے گئی، ایک یہودی سنار نے اس کے ساتھ بدتمیزی کی، اور سر بازار اسے برہنہ کردیا، عورت کی چیخ وپکار سن کر ایک مسلمان وہاں آ پہنچا، مسلم عورت کو بے عزت دیکھ کر وہ غصہ میں بے قابو ہوگیا اور اس نے اس فساد انگیز یہودی کو قتل کردیا، اس پر بہت سے یہودی جمع ہوگئے، سب نے ہنگامہ کیا، بلوہ کیا اور

اس مسلم نو جوان کو شہید کر دیا۔

اللہ کے رسول (ﷺ) کو واقعہ کی خبر ہوئی تو پہلے افہام وتفہیم کا طریقہ اختیار فرمایا، اور کسی طرح کی کوئی فوری کارروائی سے قبل انھیں متنبہ کرنا ضروری سمجھا، چنانچہ آپ (ﷺ) نے ان کے لوگوں سے فرمایا:

''اے یہودیو! ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بھی وہی معاملہ کرے جو قریش کے ساتھ ہوا ہے، تم اسلام قبول کرلو، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اللہ کا فرستادہ ہوں، اور تمہاری کتابوں سے بھی تمھیں اس کا علم ہے۔''(۱)

یہودیوں کے لیے اس کا جواب خود آپ (ﷺ) کے لیے ایک چیلنج تھا، انھوں نے بڑی دریدہ ذہنی سے کہا:

''اے محمد (ﷺ)! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمیں بھی اپنی قوم کی طرح سمجھتے ہو، اس دھوکہ میں نہ رہنا، تمہارا مقابلہ ایسے لوگوں سے پڑا تھا جو جنگی معاملات میں ناتجربہ کار تھے، اس لیے تم ان پر قابو پاگئے، خدا کی قسم اگر کبھی ہم سے جنگ ہوئی تو تمھیں معلوم ہوجائے گا کہ مردمیداں کسے کہتے ہیں۔''(۲)

اس جواب کے بعد کسی بھی قسم کی پرامن مصالحت ممکن نہ تھی، چنانچہ رسول اللہ (ﷺ) نے ان کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا، اور پندرہ راتیں اسی حال میں گذر گئیں، مسلمانوں کی ثابت قدمی دیکھ کر ان کے قدم اکھڑ گئے اور ان کے دعووں کی ہوا نکل گئی، اس موقع پر نہ یہود کے دوسرے قبائل ان کی مدد کو آئے اور نہ منافقین نے ان کا ساتھ دیا البتہ ہتھیار ڈالنے کے بعد منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی نے آکر سفارش کی جس پر اللہ کے رسول (ﷺ) نے اس کا لحاظ کر کے نرمی کا معاملہ کیا اور اس شرط کے ساتھ عفو وکرم کا حکم دیا کہ بنوقینقاع مدینہ کو خالی کردیں، یہودیوں کو اپنی بغاوت کی پاداش میں سزائے موت کا گمان تھا لیکن نبی رحمت کے اس فیصلے پر وہ سلامتی کے

(۱) سیرت ابن ہشام: ۵۴۵ (۲) أبو داؤد، باب کیف کان اجلاء الیهود من المدینة

ساتھ اپنی منقولہ جائداد لے کر مختلف علاقوں کو منتقل ہو گئے۔

بنونضیر کی کارستانیاں

بنونضیر اور دوسرے یہودی قبائل اگرچہ بنوقینقاع کی مدد کے لیے نہیں نکلے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ خاموش بیٹھے رہے، کعب بن اشرف جو یہودیوں کا سردار اور مشہور شاعر تھا، وہ بدر کے مقتولین کی تعزیت کے لیے مکہ گیا، قریش کی شکست پر مرثیے لکھے، اور انتقام کے شعلوں کو خوب ہوا دی، ابوسفیان کو حرم میں لے گیا، حرم کا پردہ تھام کر عہد کیا کہ بدر کا انتقام لے کر رہیں گے اور محمد (ﷺ) کو کسی بھی طرح زندہ نہیں چھوڑیں گے، پھر مدینہ آ کر کھلم کھلا حضور (ﷺ) کی شان میں گستاخیاں شروع کر دی، اسلام اور پیغمبر اسلام کی ہجو کرنے لگا، آخر کار بعض حضرات انصار نے حکمت کے ساتھ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔(۱)

بدر کی شکست نے مشرکین مکہ کو بوکھلا دیا تھا، وہ کسی بھی صورت میں محمد (ﷺ) کی شکست چاہتے تھے، انھوں نے منافقین سے بھی سانٹھ گانٹھ کی تھی لیکن مدینہ کی اکثریت اور خاص کر نو جوانوں کے اسلام قبول کر لینے کے بعد یہ کسی بھی صورت ممکن نہ ہوسکا، اب صرف مدینہ کے یہود ہی تھے جو ان کی آرزو پوری کر سکتے تھے، چنانچہ انھوں بنونضیر کو یہ دھمکی آمیز خط لکھا:

> ”انکم أهل الحلقة والحصون وانكم لتقاتلن صاحبنا أولنفعلن كذا وكذا ولا يحول بينناوبين خدم نسائكم شئى هى الخلائل۔“ (۲)

> (تم لوگ قلعوں اور اسلحوں کے مالک ہو، اگر تم نے ہمارے حریف کو چھوڑ دیا تو ہم تمھیں نہیں چھوڑیں گے، اور تمہارے ساتھ ایسا اور ایسا کریں گے، اور کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جو ہمارے اور تمہاری عورتوں کی

---

(۱) زادالمعاد: ۳۴۸/۲ (۲) سنن أبی داؤد، باب فی خبر بنی النضیر

پازیب کے درمیان بھی حائل ہوسکے، یعنی ہم انھیں بے آبرو کردیں گے)

اس پیغام کے ملنے کے بعد غیرت کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس توہین آمیز اور دھمکی بھرے خط کے جواب میں وہ قریش کے مخالف ہوجاتے اور نبی کریم (ﷺ) کا ساتھ دیتے جو ہر موقع پر ان کے ساتھ رواداری کا معاملہ فرمارہے تھے، لیکن ان کے بغض وعناد نے انھیں بے غیرت اور بے حس کردیا تھا، اس پیغام کے ملتے ہی بنونضیر نے عہد شکنی اور نبی کریم (ﷺ) کو فریب دینے کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ انھوں نے قریش کے ساتھ ساز باز شروع کردی، ان کو آنحضرت (ﷺ) کے خلاف جنگ پر آمادہ کرلیا اور مدینہ کے پوشیدہ راز ان کو بتانے لگے۔(۱)

ایک مرتبہ نبی کریم (ﷺ) ایک مقتول کی دیت کے سلسلہ میں پہلی مرتبہ چند صحابہ کے ساتھ بنونضیر کی بستی میں گئے، بنونضیر نے انتظار کرنے کو کہا، آپ (ﷺ) ایک دیوار کے سایہ میں بیٹھ گئے، اسی دوران یہودیوں نے حضور (ﷺ) کے قتل کی سازش رچ ڈالی، اور ایک ملعون یہودی ابن جحاش کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ دیوار کے اوپر جاکر ایک بھاری پتھر نبی کے اوپر گرادے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو ان کے ناپاک ارادہ سے مطلع فرمادیا، آپ (ﷺ) اسی وقت وہاں سے اٹھے اور مدینہ روانہ ہوگئے۔

بنونضیر کا انجام

بنونضیر کی مسلسل شرارتوں کے باوجود نبی کریم (ﷺ) انھیں ڈھیل دیتے رہے، اس وقت مسلمانوں کے حالات بہت مضبوط نہ تھے، غزوہ احد اور اس کے بعد بئر معونہ کا واقعہ پیش آچکا تھا جس میں مسلمانوں کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا تھا، ایسے حالات میں مسلمانوں کو پرامن فضا اور اپنے مدنی پڑوسیوں سے اطمینان کی ضرورت تھی، اس لیے نبی کریم (ﷺ) نے بنوقریظہ اور بنونضیر کو تجدید معاہدہ کی دعوت دی، بنوقریظہ نے تجدید معاہدہ پر دستخط کردیے لیکن بنونضیر نے صاف انکار کردیا، اس پر آنحضرت (ﷺ) نے

---

(۱)فتح الباری:۲۶۵/۷

انھیں یہ الٹی میٹم دیا کہ یا تو معاہدہ کرلیں یا دس دن کے اندر مدینہ کو خالی کردیں۔(۱)

ابتداء میں بنونضیر اس الٹی میٹم کو تسلیم کرنے پر راضی ہو گئے لیکن منافقین نے انھیں مقابلہ پر آمادہ کرلیا اور یہ یقین بھی دلایا کہ ان کی مدد کے لیے وہ بنوقریظہ اور بنوغطفان کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں گے، پشت پناہی کے اس وعدے پر بنونضیر اور بھی اکڑ گئے، اوران کے سردار حي ابن اخطب نے کہلا بھیجا کہ ''ہم اپنا علاقہ خالی نہیں کریں گے، تمھیں جو جی میں آئے کرلو''(۲) اور پھر مسلمانوں کے خلاف جنگی مورچہ سنبھال کر اپنے مضبوط قلعوں میں محصور ہو گئے۔

مسلمانوں نے بنونضیر کے قلعوں کا محاصرہ کرلیا، سامان رسد کو روک دیا، مسلمانوں کا جوش اور ان کی ثابت قدمی دیکھ کر بنونضیر پر ایک رعب و ہیبت طاری ہوگئی، وہ اپنے پشت پناہوں کا انتظار کرتے رہے لیکن ان کی مدد کو نہ منافقین آئے اور نہ یہود و عرب کے دوسرے قبائل نے ان کا ساتھ دیا، پندرہ دن کے مسلسل محاصرہ نے ان کی ہمتوں کو پست کردیا، بالآخر انھوں نے ہتھیار ڈالدیے، اور آنحضور (ﷺ) سے یہ درخواست کی کہ ہمیں یہاں سے جانے دیا جائے، رسول رحمت (ﷺ) نے انھیں عام معافی دیدی، اور ہتھیاروں کے سوا سارے ساز و سامان کو لے جانے کی عمومی اجازت بھی دے دی۔

بنونضیر نے تقریباً چھ سو اونٹوں پر گھر کا سارا سامان لادا، اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو مسمار کیا، چوکھٹ اور دروازے تک اکھاڑ لیے، ان کی عورتوں نے بہترین لباس زیب تن کیے، سر سے پیر تک زیورات کو اوڑھ لیا، اور پھر بنونضیر کا یہ شکست خوردہ قبیلہ اپنے علاقہ سے گاتے بجاتے اس دھوم دھام سے شہر بدر ہوا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ کچھ یہودی شام کے علاقوں میں بس گئے اور کچھ خیبر میں اور کچھ جا کر بنو قریظہ کے ساتھ آباد ہوئے۔

---

(۱) ابن سعد: ۲/ ۵۷ (۲) أیضاً: ۳/ ۴۱

بنوقریظہ کی بغاوت

بنوقریظہ مدینہ سے باہر کے علاقہ میں آباد تھے، ان کے مضبوط قلعے تھے، چاروں طرف نہایت زرخیز زمینیں تھیں، کھیتوں اور باغوں پر انہی کا قبضہ تھا، کہانت، فال گری اور کچھ مذہبی تعلیم کی بنیاد پر دوسرے یہودی قبیلوں پر انھیں پیشوائی حاصل تھی، انھوں نے بنونضیر کے یہودیوں کو اپنے یہاں پناہ دی۔

بنونضیر نے بنوقریظہ کے یہاں پہنچ کر مسلمانوں کے خلاف ایک بہت بڑے معرکہ کی سازش رچنی شروع کی، یہ ان کی اب تک کی سب سے خطرناک اور تیر بہدف سازش تھی اور اس کی کامیابی کا انھیں پوری طرح یقین تھا، ان کے سرداروں میں سے سلام بن الحقیق، حيي بن اخطب، کنانہ بن الربیع وغیرہ مکہ معظّمہ گئے، قریش سے مل کر کہا کہ اگر تم ہمارا ساتھ دو تو اسلام کو جڑ سے مٹایا جاسکتا ہے، قریش تو ہمیشہ سے اس کے لیے تیار تھے، وہ نہ صرف تیار ہوئے بلکہ اپنے حلیف بنوسالم کو بھی تیار کرلیا پھر یہ یہودی وفد قبیلہ بنوغطفان کے پاس گیا اور انھیں یہ لالچ دی کہ اگر تم ہمارا ساتھ دوگے تو ہم زندگی بھر خیبر کی پیداوار کا نصف حصہ تمھیں دیتے رہیں گے، اس پر وہ راضی ہوگئے، نیز بنوغطفان نے بنواسد کو بھی اپنے ساتھ ملالیا، بنوسعد کا قبیلہ پہلے سے ہی یہودیوں کا حامی تھا، غرض عرب کے سارے بڑے قبائل کو یہودیوں نے راضی کرلیا اور ایک لشکر جرار تیار کیا جس کی تعداد دس ہزار (۱۰۰۰۰) سے بھی زائد تھی۔ اور پھر اس لشکر نے مدینہ منورہ کا محاصرہ کرلیا جو کہ تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا۔

جغرافیائی لحاظ سے مدینہ منورہ کے مشرق ومغرب میں حرے(۱) تھے جہاں سے فوج کا آنا ناممکن تھا، جنوب میں گھنے باغات تھے، شمال میں احد پہاڑ تھا جس کا ایک گوشہ خالی ہے، وہیں سے دشمن حملہ کرسکتے تھے، مسلمانوں کی عسکری طاقت اتنی مضبوط نہ تھی کہ کھلے میدان میں نکل کر اس عظیم لشکر کا مقابلہ کرتے، چنانچہ حضرت

---

(۱) حرے

سلمان فارسیؓ کے مشورہ سے اس کھلی ہوئی سمت میں ایک عظیم خندق کھودنے کا فیصلہ کیا گیا، اللہ کے رسول (ﷺ) کے ساتھ تقریباً تین ہزار صحابہ نے مل کر پانچ ہزار ہاتھ لمبی خندق کھودی جس کی گہرائی سات سے دس ہاتھ تک اور گہرائی بالعموم نو ہاتھ سے کچھ اوپر تک تھی۔

یہ حالات مسلمانوں پر بہت ہی سخت تھے، شدید سردی کے دن تھے، غذا کی بھی قلت تھی، مجاہدین کو اتنی غذا ملتی جس سے جسم وروح کا رشتہ قائم رہے، اور کبھی تو وہ بھی نصیب نہ ہوتا، بھوک کی شدت سے پیٹ بالکل چپک جاتے تھے جس سے کام میں دشواری ہوتی تھی، اس دشواری کو دور کرنے کے لیے وہ اپنے پیٹ پر پتھر باند لیتے تھے، ایک دن ابوطلحہؓ نے رسول اللہ (ﷺ) سے بھوک کی شکایت کی اور اپنا پیٹ کھول کر دکھایا جس پر ایک پتھر بندھا ہوا تھا، یہ دیکھ کر نبی کریم (ﷺ) نے اپنے شکم مبارک سے کپڑا اہٹایا تو اس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

یہود اور عرب قبائل اس زور وشور سے حملہ آور ہوئے کہ مدینہ کی زمین ہل گئی، خندق کے پاس انھوں نے پڑاؤ ڈالا، تیروں سے حملے شروع کیے، گھوڑسوار خندق کے قریب تک آگئے، ایک طرف خندق کی چوڑائی کم تھی، مشرکین کا ایک دستہ اس راستہ سے مدینہ کی زمین تک پہنچ گیا، لیکن مسلمانوں نے ثابت قدمی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔

مسلم فوج میں ایک تعداد ان منافقین کی بھی تھی جو یہودیوں کے تیار کردہ تھے، در پردہ مسلمانوں کا خاتمہ چاہتے تھے، موسم کی سختی، رسد کی قلت، راتوں کی بے خوابی، بیشمار فوجوں کا ہجوم دیکھ کر ان کے پاؤں اکھڑ گئے، انھوں نے آ کر حضور (ﷺ) سے جنگ سے معافی مانگنی شروع کی کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں، ہمارا وہاں رہنا زیادہ ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر موجود ہے:

﴿يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَاراً﴾

(الاحزاب:۱۳) (وہ کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں، جبکہ وہ

کھلے نہیں ہیں بلکہ وہ تو فرار چاہتے ہیں)

مسلمانوں کے لیے یہ حالات بہت ہی نازک تھے، معاملہ ان کے وجود و بقا کا تھا، غزوۂ بدر کے بعد یہ دوسری سنگین صورتحال تھی جس میں مسلمانوں کی شکست کا لازمی نتیجہ اسلام کی بیخ کنی تھی، دس ہزار کے عظیم الشان لشکر کے سامنے مسلمانوں کی تین ہزار کی جماعت بظاہر بہت زیادہ دیر تک نہیں ٹک سکتی تھی، اس نازک صورت حال میں مسلمانوں کو بنوقریظہ سے کچھ امیدیں تھیں، ان سے معاہدہ تھا کہ ایسی جنگی صورت میں وہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔

بنوقریظہ کے یہودی پہلے تو کچھ پس وپیش میں تھے، لیکن بنونضیر کے سردار حی بن اخطب نے انھیں سمجھایا کہ ایسا موقع دوبارہ نہیں ملے گا، یہودیوں اور مشرکین کی بھاری بھرکم تعداد اور ان کا جوش جولاں دیکھ کر بنوقریظہ کی آنکھوں میں بھی سور کا بال آ گیا، اور انھوں نے معاہدہ کو توڑ دیا، اور مشرکین کی فوج میں اضافہ کر دیا، حالات کی تحقیق کے لیے جب سعد بن عبادہؓ اور سعد بن معاذؓ ان کے پاس گئے تو انھوں نے صاف لفظوں میں جواب دیا: ''نہ ہم محمد (ﷺ) کو جانتے ہیں اور نہ کسی طرح کے معاہدہ کو جانتے ہیں۔''(۱)

بنوقریظہ کی آبادی مدینہ سے ملی ہوئی تھی، جس کا فائدہ اٹھا کر انھوں نے اندورن مدینہ امن وامان میں خلل ڈالنا شروع کیا، مسلمان عورتیں اور بچے جس قلعہ میں تھے وہ قلعہ بنوقریظہ کی آبادی سے متصل تھا، موقع غنیمت سمجھ کر انھوں نے قلعہ پر حملہ کر دیا، ایک یہودی قلعہ کے پھاٹک تک پہنچ گیا، لیکن آنحضرت (ﷺ) کی پھوپھی حضرت صفیہؓ نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس کا سر قلعہ کے باہر پھینک دیا جس سے یہودیوں میں ہیبت بیٹھ گئی اور پھر قلعہ کے قریب بھی نہ آئے۔

مشرکین نے تقریباً ایک ماہ تک مدینہ منورہ کا محاصرہ کیا، مسلمانوں کو فاقوں کی

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۲/۲۲۴

نوبت آگئی، لیکن خندق حائل ہونے کی وجہ سے باقاعدہ جنگ کی نوبت نہیں آسکی، محاصرہ جس قدر طویل ہوتا جاتا تھا محاصرہ کرنے والے بھی ہمت ہارتے جاتے تھے، دس ہزار کی فوج کو رسد پہنچانا آسان کام نہ تھا، نصرت غیبی ہوئی، سخت سردی کے موسم میں طوفانی ہوائیں چلنے لگیں، خیموں کی طنابیں اکھڑ اکھڑ جاتیں، کھانے کی دیگیں چولھے پر الٹ الٹ جاتیں، ایسے حالات میں فوجی ہمت ہار بیٹھے، ان میں پھوٹ بھی پڑ گئی، بالآخر ان سب قبیلوں نے اپنی اپنی راہ لی، بنو قریظہ اپنے قلعوں میں بند ہو گئے، اور یہ واقعہ تاریخ میں ''غزوہ خندق'' یا ''جنگ احزاب'' کے نام سے محفوظ ہو گیا۔

بنو قریظہ کا انجام

جنگ احزاب کے بعد مسلمانوں نے بنو قریظہ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا، جس کا سلسلہ پچیس شب و روز تک جاری رہا، اس طویل محاصرہ سے یہودیوں کے دلوں میں رعب پیدا ہو گیا اور انھوں نے ہتھیار ڈال کر خود سپردگی کر دی۔ پھر رسول اللہ (ﷺ) کے حکم سے حضرت سعد بن معاذؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے مردوں کو قتل کر دیا جائے، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیا جائے اور ان کا مال تقسیم کر لیا جائے۔ یہ فیصلہ بنی اسرائیل کی شریعت کے جنگی قوانین کے بھی مطابق تھا۔

احزاب کی یہ جنگ مسلمانوں کے وجود و بقا کی جنگ تھی، اگر نصرت غیبی نہ ہوتی تو اس جنگ کا منطقی انجام مسلمانوں کا صفحۂ ہستی سے صفایا تھا، اس میں سب سے اہم کردار بنو قریظہ کا تھا، پہلے انھوں نے مسلمانوں کے باغی بنو نضیر کے سرداروں کو پناہ دی، جہاں رہ کر انھوں نے یہ خطرناک سازش رچی، اور پھر عین جنگ کے وقت نہ صرف مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا بلکہ اپنی فوج لے کر مسلمانوں سے جنگ پر آمادہ ہو گئے، اس پر مستزاد مسلمانوں کی عورتوں اور بچوں کو بھی نشانہ بنایا جو کہ جنگی اصول کے بھی خلاف تھا، چنانچہ بنو قریظہ ایک عبرت ناک سزا کے حقدار تھے۔

خیبر کے یہود

خیبر کا علاقہ مدینہ منورہ سے تقریباً ستر میل کی مسافت پر واقع تھا، یہاں کی زمین بڑی زرخیز تھی، کھجوروں اور دوسرے میوہ جات کے بکثرت باغات تھے، یہ ملک عرب میں یہود کا جنگی ٹھکانہ اور جزیرۃ العرب میں ان کا آخری اور مضبوط قلعہ تھا، مدینہ منورہ سے جب بنوقینقاع اور بنونضیر کو جلاوطن کیا گیا تو ان کی ایک تعداد نے خیبر میں ہی پناہ لی تھی، یہ یہودی مسلمانوں کے خلاف برابر ریشہ دوانیوں میں مصروف اور انتقام کے جذبہ سے ہمیشہ لبریز رہتے۔

۶ھ کو مسلمانوں نے اہل مکہ کے ساتھ مقام حدیبیہ میں ان کی شرطوں کے مطابق صلح کی تھی، اس صلح کا ظاہری پہلو مشرکین کی طاقت اور مسلمانوں کی کمزوری کو ظاہر کر رہا تھا، اور اسی کمزوری کو دیکھتے ہوئے یہودیوں نے مسلمانوں سے جنگ کی تیاری شروع کردی۔ خیبر کے قریب ہی میں عرب کا ممتاز جنگجو قبیلہ بنوغطفان بھی آباد تھا، یہودیوں نے بنوغطفان کو مختلف لالچ دیے اور اپنی دولت کے ذریعہ دوسرے قبیلوں کو بھی اپنے ساتھ ملالیا۔

رسول اللہ (ﷺ) کو جب اس فتنہ انگیزی کی خبر ہوئی تو پہلے آپ نے انھیں سمجھانے اور معاہدۂ امن پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، اور یہودیوں کے نام ایک خط لکھا جس میں آپ (ﷺ) نے توریت کے حوالہ سے اپنی نبوت کا اقرار کرنے اور اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی، لیکن یہودیوں نے اس خط کا کوئی مثبت جواب نہ دیا اور اپنی جنگی تیاریوں میں مشغول رہے۔ آخر کار مجبور ہو کر آپ (ﷺ) نے بھی جنگ کی تیاری کی اور اپنے چودہ سو جانثاروں کے ساتھ مقام رجیع پر پڑاؤ ڈالا، یہ علاقہ بنوغطفان اور خیبر کے درمیان واقع ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنوغطفان نے یہودیوں کی مدد کی ہمت نہ کی، رات بھر آپ (ﷺ) نے توقف کیا پھر صبح سویرے ان پر حملہ کردیا، ایک ایک کر کے ان کے قلعوں کو فتح کرنا شروع کردیا، جس میں کئی کئی دن محاصرے بھی ہوتے اور مقابلے

بھی ہوتے، جس میں ان کے کئی نامور شہسوار مارے گئے، اس صورت حال سے عاجز آ کر یہودیوں نے صلح کی پیش کش کردی جسے نبی کریم (ﷺ) نے قبول کرلیا، اور یہ معاہدہ طے پایا کہ اب خیبر کی زمین مسلمانوں کی ہے، مسلمان جب تک چاہیں گے وہاں یہود کو آباد رہنے دیں گے اور جب چاہیں گے جلاوطن کردیں گے، اس وقت تک خیبر کی ساری پیداوار، غلہ اور پھلوں کا نصف مسلمانوں کو ملتا رہے گا۔(۱)

ایک مجرمانہ سازش

خیبر کے یہودیوں کے ساتھ رسول اللہ (ﷺ) نے نہایت نرمی کا معاملہ کیا، نہ انھیں موت کی سزا دی، نہ انھیں جلاوطن کیا، بلکہ ان کی زمینیں بھی ان کے ہی قبضہ میں رہنے دیں، اس احسان کا بدلہ تو یہ تھا کہ عناد وسرکشی کے بجائے وہ سب آپ (ﷺ) کی نبوت کا اقرار کرتے اور اسلام میں داخل ہوجاتے لیکن احسان شناسی کے بجائے انھوں نے آپ (ﷺ) کے قتل کی سازش رچی۔

یہودی سردار سلام بن مشکم کی بیوی نے آپ (ﷺ) کی دعوت کا انتظام کیا، آپ سے دریافت کیا کہ گوشت میں کون سا حصہ آپ کو مرغوب ہے؟ پھر پورے کھانے میں اور خاص کر آپ (ﷺ) کے مرغوب حصہ میں تیز قسم کا زہر ملا دیا، لیکن خدا کا فیصلہ کہ لقمہ کھاتے ہی آپ (ﷺ) کو اس کا علم ہوگیا، اس کے بعد اس عورت کو آپ کے پاس حاضر کیا گیا، اس نے اپنے جرم کا اعتراف کیا، چونکہ اس کھانے سے ایک صحابی حضرت بشر بن البراءؓ شہید ہوگئے تھے، اس لیے بطور قصاص اس عورت کو موت کی سزا دی گئی۔

رسول اللہ (ﷺ) کو جو زہر دیا گیا تھا وہ اتنا سخت تھا کہ آپ (ﷺ) اپنے مرض وفات میں فرمایا کرتے تھے:

”عائشہؓ میں نے خیبر میں کھانا کھایا تھا اس کا اثر برابر محسوس کرتا رہا، اس زہر کے اثر سے میں اپنی رگ کٹتی ہوئی محسوس کرتا ہوں۔“ (۲)

---

(۱) بخاری: ۲۳۳۸ (۲) بخاری: ۴۴۲۸

نوٹ

مسلمان حدیبیہ کے موقع پر مشرکین مکہ سے صلح کر چکے تھے، اور خیبر میں یہودیوں کی سیاسی قوت کو چور چور کرنے کے بعد انھیں تبلیغ دین واشاعت اسلام کے لیے ایک پرسکون ماحول نصیب ہوا، اور اسلامی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا، بت پرستی کا خاتمہ ہوا، اور مدینہ کے چھوٹے سے قصبہ میں جو اسلامی ریاست قائم ہوئی تھی اس کی سرحدیں عرب سے نکل کر فلسطین اور عراق کے جنوبی حصوں تک پہنچ گئیں، اور جب نور نبوت غروب ہوا تو اسلام کے قلمرو کی حدیں تیس لاکھ مربع کلو میٹر سے تجاوز کر چکی تھیں، اور اسلام کے جاں نثاروں کی تعداد پانچ لاکھ سے بھی آگے نکل چکی تھی۔

جزیرۃ العرب سے یہودیوں کی جلاوطنی

ایک طویل عرصہ تک یہود کی ستم کاری، عہد شکنی اور تیشہ زنی سے اسلام کا سینہ چھلنی ہوتا رہا، اللہ کے رسول (ﷺ) پوری مدنی زندگی میں یہودیوں کی جفاکاری کا شکار رہے، مشرکین مکہ کی کھلی عدوات سے آپ (ﷺ) کو وہ دکھ نہ پہنچا جو یہودیوں کی آئے دن کی چالبازیوں، سازشوں، اور افواہوں سے پہنچا، ان کی مسلسل دسیسہ کاری ومکاری سے آپ (ﷺ) کو ذہنی کوفت اور قلبی صدمہ پہنچتا، خیبر کی فتح کے ساتھ ہی یہودیوں کی سیاسی قوت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

انبیاء کو قتل کرنا اور ان کے خلاف سازشیں رچنا یہودیوں کی سرشت میں داخل تھا، خود اپنے انبیاء کو اپنے ہاتھوں سے قتل کردیا کرتے تھے، اور بڑے فخر کے ساتھ کہا کرتے تھے: ﴿إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ﴾ (ہم نے قتل کیا ہے اللہ کے رسول مریم کے بیٹے عیسیٰ مسیح کو)۔

محمد مصطفیٰ (ﷺ) کے آخری نبی اور رسول برحق ہونے میں انھیں کوئی شبہ نہ تھا لیکن محض اس حسد میں کہ یہ آخری نبی ان کے خاندان میں مبعوث کیوں نہ ہوا، انھوں

نے آپ (ﷺ) کی نبوت کا انکار کردیا اور ہر محاذ پر شکست کھانے کے باوجود ان کی ہٹ دھرمی میں کوئی فرق نہ آیا، ان کے مرد قتل کیے گئے، عورتیں اور بچے غلام بنا لیے گئے، ان کی جائدادوں پر قبضہ کرلیا گیا، اور انھیں ان کے علاقوں سے باہر بھی کردیا گیا لیکن پھر بھی انھوں نے آپ (ﷺ) کو نبی تسلیم کرنا گوارہ نہ کیا۔

جو قوم اتنی ہٹ دھرم، اڑیل، اور اپنے مقصد کے حصول میں کسی بھی حد تک جا سکتی ہو اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلینا اور اسے آزاد چھوڑ دینا کسی بھی طرح کی عقل مندی نہ تھی، چنانچہ خیبر کی فتح کے وقت آپ (ﷺ) نے انھیں ملک بدر کرنے کا فیصلہ فرمایا تھا، لیکن انھوں نے یہ درخواست کی کہ انھیں خیبر کی زمین پر کام کرنے کے لیے ہی رہنے دیا جائے، چونکہ اس وقت مسلمان کاشتکاری کے ان طریقوں سے واقف بھی نہ تھے اس لیے آپ (ﷺ) نے ان یہودیوں کی یہ درخواست قبول کرلی، لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگادی کہ جب تک آپ (ﷺ) کی مرضی ہوگی انھیں خیبر میں رہنے کی اجازت ہوگی، اور جب آپ (ﷺ) کا حکم ہوگا انھیں خیبر خالی کردینا ہوگا۔(۱)

رسول مقبول (ﷺ) نے اپنی وفات سے قبل فرمایا تھا: ''میں یہودیوں اور عیسائیوں کو جزیرۃ العرب سے باہر کردوں گا'' (۲) اس کی ایک بنیادی وجہ تو یہ تھی کہ تین بڑے قبیلوں اور خیبر کے علاوہ یہود جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں میں بھی آباد تھے، اور آئے دن اپنی کارستانیوں سے مسلمانوں میں انتشار پیدا کرتے تھے، اس کے علاوہ نبی کریم (ﷺ) نے خیبر کے یہودیوں سے کہا تھا کہ جب تک آپ (ﷺ) کی مرضی ہوگی وہ خیبر میں آباد رہیں گے، اب اگر آپ (ﷺ) نے انھیں باہر نکالنے کا حکم نہ دیا ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ بعد میں صحابہ کرام خود سے اس کی ہمت نہ کر پاتے کہ معاہدہ خود آنحضرت (ﷺ) نے کیا تھا۔ چنانچہ خلیفہ راشد حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں رسول اللہ (ﷺ) کے اس منشاء کو پورا فرمایا۔(۳)

---

(۱) سیرت ابن ہشام: ۱/ ۳۵۷ (۲) مسلم: ۴۵۹۴ (۳) سیرت ابن ہشام: ۱/ ۳۵۷

مجوسیت

مجوسیت یعنی وہ آتش پرستی جن کا مرکز اس وقت کی سپر پاور سلطنت فارس تھا جہاں مختلف معبودان باطل کے ساتھ شہنشاہِ ملک کو بھی خدائی درجہ حاصل تھا، اس کے علاوہ عمومی طور پر پورا ملک آگ کی پرستش کرتا تھا اور ایسا آتش کدہ بھی روشن تھا جس کی آگ صدیوں سے بجھنے نہیں دی گئی تھی، لیکن رسول عالم (ﷺ) کی پیدائش کے وقت دفعۃً وہ آگ بجھ گئی تھی اور پورے ملک میں کہرام مچ گیا تھا۔

فارس

عہد نبوی میں جو دو عالمی طاقتیں تھیں ان میں ایک رومی طاقت تھی اور دوسری فارس (ایران) کی ساسانی سلطنت، فارس زمانہ قدیم سے نہایت بلند پایہ تہذیب وتمدن، مایہ ناز معاشرت اور گراں قدر تاریخ کا مالک تھا، میلاد مسیح سے صدیوں سال پہلے جس وقت دنیا کے بیشتر ممالک عروج وترقی کے نام سے بھی نا آشنا تھے بلکہ ذلت ورسوائی کی گہرائیوں میں پڑے ہوئے تھے، اس وقت فارس کی سرزمین پر عظیم الشان حکمراں پیدا ہوتے رہے، وہاں سیاست کے اصول وقوانین موجود تھے، اس کا اپنا رسم الخط تھا، اور اس کی سرحدیں ایک طرف سندھ تک پھیلی ہوئی تھیں تو دوسری طرف عراق اور عرب کے اکثر حصے، یمن، بحرین اور عمان بھی اس کے زیر اقتدار تھے۔

فارس کی سلطنت پر صدیاں گذر چکی تھیں، اور وہ ساری خرابیاں جو امتداد سلطنت کا لازمی نتیجہ ہیں اس میں جڑ پکڑ چکی تھیں، اہل فارس نے دنیوی عیش وعشرت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا، ہر شخص دولت وسرمایہ کے حصول میں سرگرداں نظر آتا، داد عیش کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے جاتے، غرض دوسرے ممالک کی طرح فارس بھی اخلاقی پستیوں کا شکار تھا، عقل وشعور کا سارا سرمایہ اوہام پرستی اور خام خیالی کی نذر ہو چکا تھا، آتش پرستی کے علاوہ یزداں اور اہرمن نیک اور بدی کے دو خدا سمجھے جاتے تھے، اس کے

علاوہ تاجدارانِ فارس اپنے آپ کو خدائے بزرگ و برتر کا شریک و سہیم سمجھتے تھے۔

نامۂ محمدی (ﷺ) بنام کسریٰ پرویز

مؤرخین کا اتفاق ہے کہ کسریٰ پرویز (خسرو پرویز دوم) ساسانی تاریخ کا سب سے عظیم اور شان و شوکت رکھنے والا شہنشاہ تھا، اسے خدا کے برابر سمجھا جاتا تھا جس کے اعتراف میں ہر شخص کو دربار میں حاضر ہوتے وقت سجدہ کرنا پڑتا تھا، اس کے نام کے ساتھ یہ شاندار تمہید ہوتی تھی:

''خداؤں میں انسان غیر فانی، اور انسانوں میں خدائے لاثانی، اس کے نام کا بول بالا، آفتاب کے ساتھ طلوع کرنے والا، شب کی آنکھوں کا اجالا''(۱)

اللہ کے رسول (ﷺ) نے جب امراء و سلاطین کے نام خطوط لکھے اور انھیں اسلام کی دعوت دی تو ان میں ایک خط کسریٰ پرویز کے نام بھی تھا۔

آنحضرت (ﷺ) کے نامۂ مبارک کے ساتھ حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ فارس پہنچے، کسریٰ اپنے تخت سلطنت پر پوری شان و شوکت کے ساتھ متمکن تھا، نقیب کی آواز ساتھ حضرت عبداللہؓ دربار میں حاضر ہوئے، سادہ اور معمولی لباس پہنے ہوئے کسریٰ کے سامنے پہنچے، نہ سجدہ کیا اور نہ کوئی نیاز مندی ظاہر کی، اتنی بے باکی اور بے نیازی کے ساتھ اب تک کوئی کسریٰ کے دربار میں نہ آیا تھا۔ فارس کا دستور تھا کہ بادشاہوں کو جو خطوط لکھے جاتے ان میں سب سے اوپر بادشاہ کا نام ہوتا تھا، لیکن اس فرمان رسالت کی شروعات اللہ کے نام سے تھی، اس کے بعد خود آنحضرت (ﷺ) کا اسم گرامی تھا، اس کے علاوہ مکتوب نبوی کے اسلوب میں ایجاز کے ساتھ بے باکی اور صاف گوئی کے ساتھ بے نیازی تھی، نامۂ مبارک سنتے ہی کسریٰ طیش میں آگیا، مکتوب گرامی کو چاک کر ڈالا اور غضبناک لہجہ میں بولا:

(۱) ایران بعہد ساسانیان، ماخوذ از: نبی رحمت ص ۳۹۴

''میری رعایا کا ادنیٰ شخص مجھے خط لکھتا ہے اور اپنا نام میرے نام سے پہلے تحریر کرتا ہے۔''(۱)

اور پھر یمن کے حاکم باذان کو حکم دیا کہ آپ (ﷺ) کو اس کے دربار میں حاضر کیا جائے۔

حضرت عبداللہ نے دربار نبوی میں پہنچ کر بتلایا کہ کسریٰ نے مکتوب گرامی کو چاک کر ڈالا تو آپ (ﷺ) نے فرمایا:

''اللہ اس کے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کردے۔''(۲)

کسریٰ کا نمائندہ جب دربار رسالت میں پہنچا تو آپ (ﷺ) نے فرمایا:

''قضاوقدر نے تمھارے بادشاہ کی قسمت کا پانسہ پلٹ دیا ہے، اور خسرو کو خود اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کردیا ہے۔''(۳)

آنحضرت (ﷺ) کی پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی، کسریٰ کو ہلاک کرکے اس کا بیٹا شیرویہ تخت پر قابض ہوا، جو کہ چھ مہینے سے زیادہ حکومت نہ کرسکا، اور اس عظیم سلطنت کا شیرازہ منتشر ہوگیا، اس کی چولیں ہل گئیں، چار سال کے اندر یکے بعد دیگرے دس بادشاہ آئے، آخر میں یزدگرد کی تاج پوشی پر سب کا اتفاق ہوا جو ساسانی خاندان کا آخری فرمانروا تھا، اس کو اسلامی افواج کا سامنا کرنا پڑا اور پھر عہد فاروقیؓ میں سیکڑوں برس کی اس عظیم الشان سلطنت کے پرخچے اڑ گئے۔

اہل فارس کی نفسیات

اہل فارس کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت وکینہ کی پہلی چنگاری اسی دن بھڑک چکی تھی جس دن نبی کریم (ﷺ) نے کسریٰ پرویز کو خط لکھ کر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ اور پھر جب عہد فاروقیؓ میں اسلامی لشکر نے ایران

---

(۲) رحمۃ للعالمین، از: قاضی محمد سلیمان منصور پوری صفحہ: ۱۶۰ (۲) بخاری: ۴۴۲۴

(۳) تاریخ طبری: ۲/۱۳۳

پر چڑھائی کی تو اہل ایران نے اپنے گھٹنے ضرور ٹیک دیے لیکن ان کے دلوں میں اسلام کے لیے نفرت پنپتی رہی اور کسی بھی صورت وہ اسلام کو مٹانے کے لیے تیار تھے۔

سینکڑوں سال کی حکومت نے اہل فارس کو غرور میں مبتلا کر رکھا تھا، دوسروں کو وہ بہت ہی حقیر سمجھتے تھے، خاص کر عرب جو کہ صحراؤں کے رہنے والے اور تہذیب وتمدن سے نا آشنا تھے ان کی نگاہ میں جانوروں سے بھی بدتر تھے، لیکن انھوں نے نہ صرف اہل فارس کو سر جھکانے پر مجبور کیا بلکہ ان سے ان کا مذہب چھوڑ کر اسلام میں داخل ہونے کی بات بھی کہی، یہ فارس کے سبھی باشندوں کے لیے ایک رسوائی کی بات تھی، ان کی تہذیب ، ان کا مذہب، اور ان کا بادشاہ ہی سب سے اعلی تھے اور سب کے لیے ضروری تھا کہ ان کے سامنے سر جھکائے ، لیکن یہاں معاملہ بالکل الٹا تھا، اس لیے انھوں نے کھل کر مسلمانوں سے جنگ مول لی، اور اسے اپنی عزت اور سطوت کا معاملہ بنالیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح یہودیوں نے اسلام کو مٹانا ہی اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا۔

ایک معروف شیعہ مؤرخ حسین کاظم زادہ کے الفاظ ہیں:

> ’’جس دن سعد بن وقاص ؓ نے خلیفہ دوم کی جانب سے ایران کو فتح کیا ایرانی اپنے دلوں میں کینہ وانتقام کا جذبہ پالتے رہے، یہاں تک شیعہ فرقہ کی بنیاد پڑ جانے سے پورے طور پر اس کا اظہار کرنے لگے۔‘‘(۱)

مزید لکھتا ہے:

> ’’ایرانی ہرگز اس بات کو کبھی بھول نہیں سکتے تھے، نہ معاف کر سکتے تھے اور نہ قبول کر سکتے تھے کہ مٹھی بھر ننگے پھرنے والے عربوں نے جو جنگل وصحرا کے رہنے والے تھے ان کی مملکت پر تسلط کر لیا، ان کے قدیم خزانوں کو لوٹ کر غارت کر دیا، اور ہزاروں لوگوں کو قتل کر دیا۔‘‘(۲)

---

(۱) تاریخی دستاویز: ۱۵۰، از: ابوریحان ضیاء الرحمٰن فاروقی (۲) أیضاً

حضرت عمرؓ کی شہادت

عہد فاروقیؓ میں صدیوں سے قائم ایرانی حکومت تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئی، اور عالمی چودھراہٹ کا دعوی کرنے والے ایرانیوں کے سامنے صرف دو ہی راستے بچے؛ یا اسلام کو قبول کرلیں یا جزیہ دے کر زندگی گذاریں، چونکہ حضرت عمرؓ کی خلافت میں یہ عظیم انقلاب رونما ہوا تھا اور ایرانیوں کا غرور مٹی میں مل گیا تھا اس لیے ان کے دلوں میں حضرت عمرؓ سے متعلق سخت عناد اور کینہ پنپتا رہا، اور اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھے، جنگوں اور فتوحات کے اسی دور میں ایرانی سردار ہرمزان نے اسلامی فوج سے مقابلہ کیا اور شکست کھائی، وہ گرفتار ہو کر دربار فاروقی میں پہنچا جہاں اس نے بظاہر اسلام قبول کرلیا۔

مدینہ منورہ میں فیروز نامی ایک مجوسی غلام تھا جس کی کنیت ابولؤلؤ تھی، اس نے ایک دن حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ میرے آقا مغیرہ بن شعبہؓ نے مجھ پر روز کا دو درہم محصول مقرر کر رکھا ہے جو کہ بہت بھاری ہے، آپ اسے کم کرا دیجیے، حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ تم کون سا پیشہ جانتے ہو؟ اس نے کہا کہ نجاری، نقاشی اور لوہاری۔ اس پر حضر عمرؓ نے فرمایا کہ تمہارے پیشوں کو دیکھتے ہوئے تو یہ محصول زیادہ نہیں ہے۔ یہ سن کر وہ مجوسی دل میں سخت ناراض ہوا، اور کہنے لگا کہ عمر نے سب کے ساتھ انصاف کیا سوائے میرے۔

ابولؤلؤ کی اس ناراضگی کو ہرمزان نے اپنے لیے ایک قیمتی موقع سمجھا، اس نے ابولؤلؤ کو حضرت عمر کے خلاف خوب بھڑکایا، اور ان کے قتل پر آمادہ کرلیا، ہرمزان کے ساتھی جفینہ نصرانی نے بھی جلے پہ نمک کا کام کیا، چنانچہ دوسرے دن فجر کی نماز میں ابولؤلؤ نے زہر میں بجھا ہوا خنجر حضرت عمرؓ کے پیٹ میں گھونپ دیا، فرار ہونا ممکن نہ تھا اس لیے پکڑے جانے کے ڈر سے اس نے خودکشی کرلی۔ اور اس طرح حضرت عمر بن خطابؓ کی شہادت سے مجوسیت کو پہلی کامیابی ملی۔

حضرت عمرؓ کا قاتل شیعوں کا ہیرو

ایران کے شہر کاشان میں ''باغی فین'' نامی ایک علاقہ ہے، جہاں حضرت عمرؓ کے قاتل فیروز ابولؤلؤ مجوسی کی (فرضی) قبر ہے، اس پر ایک عبارت کندہ ہے جس کا مفہوم ہے ''بابا شجاع الدین کی قبر گاہ''۔ ابولؤلؤ نے حضرت عمرؓ کو شہید کیا تھا جس کے اعتراف میں شیعوں نے ابولؤلؤ کو ''بابا شجاع الدین'' کا لقب دیا ہے، یہ قبر شیعوں کی زیارت گاہ ہے، جہاں روپیوں اور پیسوں کے ڈھیر لگتے ہیں، اور نذرانے چڑھائے جاتے ہیں، کسی وقت ایران نے ایک پوسٹ کارڈ بھی جاری کیا تھا جس پر اس مزار کی تصویر تھی۔(۱)

یہودیت و مجوسیت کا گٹھ جوڑ

جس طرح یہودیوں کو عرب کی اجارہ داری کے چھن جانے کا صدمہ تھا اسی طرح مجوسیوں کو ایرانی سلطنت کے خاتمہ پر افسوس تھا، دونوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف بغض و عناد کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں، دونوں اپنے اپنے مقام پر اسلام کے خلاف محاذ قائم کر چکے تھے، مگر دونوں کے طریق کار میں تھوڑا سا فرق تھا، یہودی عربی النسل تھے اور ان کا طرز زندگی عربی تمدن کے رنگ میں ڈھلا ہوا تھا، جبکہ مجوسی اپنی بود و باش میں عربوں سے بالکل نمایاں تھے، اس لیے دونوں نے مل کر جو محاذ قائم کیا تھا اس میں ایک طرف یہودی ذہن، یہودی سازشیں، اور یہودی فتنہ انگیزیاں تھیں تو دوسری طرف مجوسی سرمایہ اور مجوسی وسائل تھے، اور پھر ان دونوں کے ملاپ سے ایک نئی طاقت ابھر کر سامنے آئی جسے تاریخ میں ''سبائیت'' کا نام دیا گیا، اور اسی سبائیت کا جدید ایڈیشن آج ''شیعیت'' کے نام سے عالم اسلام پر حاوی ہے، اور کئی سو سالوں سے امت مسلمہ میں شیعیت اور سنیت کے معرکے گرم ہیں۔

---

(۱) تحقیق و انصاف کی عدالت میں مظلوم اہل بیت کا مقدمہ: ۱۱۷ (مترجم) از سید محمد حسین موسوی نجفی

عبداللہ ابن سبا کی فتنہ سازی

عبداللہ ابن سبا یمن میں پیدا ہوا، وہ ایک کٹر یہودی تھا، اس کی ماں ایک حبشیہ تھی جس کی وجہ سے اسے ابن السوداء بھی کہا جاتا ہے، اسلامی عقائد کی دیوار میں جس شخص نے سب سے پہلے نقب لگانے کی کوشش کی وہ یہی منافق عبداللہ بن سبا تھا۔

چھوٹے سے قد کا یہ یمنی یہودی اپنی فطرت اور صلاحیت کے بل بوتے پر بڑی بڑی مجلس میں باہمی نزاع، اختلاف وانشقاق، اور عداوت وشقاوت پیدا کرنے میں بہت ہی ماہر تھا، اسلام کو بڑی بڑی جنگوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا نقصان اس ایک شخص نے پہنچایا، اس نے فریب کاری اور فتنہ سازی کے اسلحہ سے لیس ہوکر اسلام کا لبادہ اوڑھا اور خود کو مسلمان ظاہر کیا لیکن اس کا دل اسلام کے متعلق بغض وکینہ سے بھرا ہوا تھا، اس نے اہل بیت اطہار کی محبت کا دم بھرنا شروع کیا اور پھر سادہ لوح مسلمانوں کو نشانہ بنایا، اپنے کفریہ عقائد ونظریات کی ترویج واشاعت کی بھرپور کوشش کی، جس کے نتیجہ میں مسلم ممالک خاص کر روم وفارس کے وہ مسلمان جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اس کی سازش کا شکار ہوئے۔

دراصل عبداللہ ابن سبا کے ایجاد کردہ عقائد یہودیت ومجوسیت کا ایسا ملغوبہ ہے جس میں نصاریٰ اور مشرکین کی آمیزش بھی ہے، اور ان عقائد کا زیادہ تر نشانہ وہ نومسلم بنے جن کے عقائد پختہ نہ تھے، سبائی عقائد میں ان نومسلموں کے لیے کشش کا سامان موجود تھا کہ اس میں ان کے سابقہ عقائد کی بہت کچھ مماثلت تھی، چنانچہ سبائیوں نے ان نومسلموں کی ذہن سازی کی اور پھر ان کے ذریعہ پوری مملکت اسلامی میں تخریب

کاری کا ایک جال بچھا دیا۔

عبداللہ ابن سبا نے مسلمانوں میں جس شیعیت کی بنیاد رکھی وہ پورے طور پر یہودیت سے ماخوذ ہے، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے مجموع الفتاویٰ میں نقل کیا ہے:

> ''اہل علم کا بیان ہے کہ رافضیت یعنی شیعیت کی ابتداء زندیق عبداللہ ابن سبا سے ہوئی ہے، اس نے ظاہری طور پر اسلام کا اقرار واعتراف کیا مگر حقیقت میں وہ یہودیت سے وابستہ تھا، اس کی خواہش تھی کہ اسلام کو اسی طرح بگاڑ کر رکھ دے جس طرح سینٹ پال نے یہودیت پر رہتے ہوئے عیسائیت کو مسخ کر دیا۔''(۱)

شیعہ متقدمین نے ابن سبا اور شیعیت کے میدان میں اس کے کارناموں کو ہمیشہ سراہا ہے لیکن متاخرین کی ایک جماعت نے عبداللہ ابن سبا کے وجود کا ہی انکار کیا ہے، اور سید مرتضی عسکری نے ''عبداللّٰه ابن سبا و أساطير أخرىٰ'' نام سے کتاب لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عبداللہ ابن سبا محض ایک خیالی کردار اور اہل سنت کی ذہنی اپج ہے، جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ جبکہ خود شیعوں کے معتبر اور مستند مصنفین نے عبداللہ ابن سبا کے وجود کو تسلیم کیا ہے اور اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ عبداللہ ابن سبا نے ہی شیعیت کی بنیاد رکھی اور اس کو مضبوط کرنے میں اہم کردار نبھایا ہے، چنانچہ شیعوں کے بلند پایہ محققین میں سے علامہ مامقانی نے ''تنقیح المقال'' میں اور علامہ باقر مجلسی نے ''بحار الانوار'' میں ''رجال الكشی'' کے حوالہ سے ابن سبا کا تذکرہ کیا ہے۔

علامہ کشی چوتھی صدی کے اکابر شیعہ میں تھے، اور یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے شیعہ اسماء الرجال پر قلم اٹھایا، شیعوں کے نزدیک ان کی کتاب بنیادی مراجع میں شامل ہے، ان کی مشہور زمانہ کتاب ''رجال الكشی'' کا پورا نام ہے: ''معرفة الناقلين عن الأئمة

(۱) مجموع الفتاویٰ: ۲۸/۴۸۳

الصادقین"۔

یہ نامور شیعہ مؤرخ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"ذكر بعض أهل العلم أن عبد الله بن سبا كان يهوديا فأسلم و والى عليا عليه السلام، وكان يقول وهو على يهوديته فى يوشع بن نون وصى موسىٰ بالغلو، فقال فى الاسلام بعد وفاة رسول الله (ا) فى علي عليه السلام مثل ذلك، وكان أول من أشهر بالقول بفرض امامة علي وأظهر البراءة من أعدائه و كاشف مخالفيه بكفرهم۔" (۱)

(بعض اہل علم نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ ابن سبا پہلے یہودی تھا، پھر اسلام قبول کیا، اور حضرت علیؓ سے خاص تعلق کا اظہار کیا، اور اپنی یہودیت کے زمانہ میں وہ حضرت موسیٰ کے وصی یوشع بن نون کے بارے میں غلو کرتا تھا، پھر رسول اللہ (ﷺ) کی وفات کے بعد اسلام میں داخل ہوکر وہ اسی طرح کا غلو حضرت علیؓ کے بارے میں کرنے لگا، اور وہ پہلا آدمی ہے جس نے حضرت علی کی امامت کی فرضیت کا اعلان کیا، اور ان کے دشمنوں سے براءت ظاہر کی، اور کھلم کھلا ان کی مخالفت کی اور انھیں کافر قرار دیا)

اس کے علاوہ حافظ ابن حجرؒ کی "لسان الميزان" میں، حافظ شمس الدین الذہبیؒ کی "المنتهىٰ" میں اور علامہ شہرستانی کی "الملل والنحل" میں عبداللہ ابن سبا کا تفصیلی تعارف موجود ہے۔

عبداللہ ابن سبا کی محاذ آرائی

عبداللہ ابن سبا برسوں تک یہودیت میں مبالغہ آرائی اور فتنہ پروری کرتا رہا، وہ دغا

(۱) رجال الكشي ص:۱۷، ط: ممبائی

اور فریب کی شطرنج کا ماہر کھلاڑی تھا، فتنہ انگیزی کے سرد و گرم خوب چکھے ہوئے تھا، اس نے اپنے مخاطب کو الگ الگ طریقہ سے فریب دیے اور ہر ایک میں اس کی استعداد کے مطابق گمراہی کے بیج بوئے۔

ابن سبا کی اسلام مخالف سرگرمیوں اور اس کے دائرہ کار کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دین اسلام کی بیخ کنی اور مسلمانوں کے مابین انتشار کا بیج بونے کے لیے دو محاذ منتخب کیے، ایک سیاسی محاذ جس کے لیے اس نے حضرت عثمان غنیؓ کی ذات کو منتخب کیا اور دوسرا مذہبی محاذ جس کے لیے اس نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ہستی کو نشانہ بنایا، اس کے اس مشن میں یہود اور نصاریٰ نے خاص دلچسپی لی اور اسے ہر طرح کی مدد پہنچائی، ایک معاصر مصنف ڈاکٹر جمیل عبداللہ مصری لکھتے ہیں:

> ''خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں امت جس ابتلاء کا شکار ہوئی وہ فتنے اور سازشیں تھیں جن کا پلان بنانے میں یہود و نصاریٰ اور اسلامی سلطنت کے سب ہی دشمن شریک تھے۔'' (۱)

عبداللہ ابن سبا کا سیاسی محاذ

حضرت عمر فاروقؓ کے بعد خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنیؓ کا عہد خلافت وہ سنہرا دور تھا جب شمع اسلام کی ضیاء پاش کرنیں ہر چہار جانب ضوفشانی کر رہی تھیں، اور اسلامی ریاست کی سرحدیں تیزی سے ہر طرف پھیل رہی تھیں، دبدبۂ اسلام اور اسلامی ریاست کی وسعت اور اس کا فروغ تمام اسلام دشمن عناصر بالخصوص یہودیوں اور مجوسیوں کے لیے ناقابل برداشت تھا، چنانچہ یہودی دماغ اور مجوسی وسائل نے مل کر خلافت راشدہ کے خلاف ایک خطرناک سازش کی داغ بیل ڈالی، اور اس کی زمام قیادت عبداللہ بن سبا یہودی کے سپرد کی۔

---

(۱) اثر اہل الکتاب ص: ۲۴۷، بحوالہ المرتضیٰ

خلافت عثمانیؓ میں شورشیں

حضرت عثمان کا دور خلافت فتوحات کا دور تھا، اس کے ساتھ ہی فکر و معاشرت کے قدیم سانچوں کے ٹوٹنے اور تمدن کے نئے سانچوں کے ڈھلنے کا زمانہ بھی تھا، فتوحات کی کثرت اور نئے نئے ملکوں کی خود سپردگی کے ساتھ دولت سمٹ سمٹ کر مسلمانوں کے یہاں پہنچنے لگی، جس سے معاشرہ کی ہوا کا رخ تبدیل ہونے لگا، اور شورشوں کے بادل منڈلانے لگے، لیکن حضرت عثمانؓ کے عزم وحزم میں نہ کوئی کمی آئی، نہ وہ جادۂ حق سے سرمو منحرف ہوئے، اپنے طرز حکومت میں عدل وانصاف کے ضوابط اور تقاضوں کو پورا کرتے رہے، لیکن اب جن لوگوں سے سابقہ تھا وہ پہلے جیسے جفاکش، سادہ مزاج صحرا نشیں عرب نہیں تھے بلکہ وہ عجمی تھے جو جہاں دیدہ بھی تھے، متاع دنیا سے لطف اندوز ہونے والی اقوام کی عیش کوشیوں سے واقف بھی تھے، اور دیہاتوں کے اجڑ، ناشائستہ اور اڑیل قسم کے لوگ بھی تھے، اور ایک بڑی تعداد ان کی بھی تھی جنھوں نے ظاہری طور پر اسلام تو قبول کر لیا تھا لیکن اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ان کے دل کبھی صاف نہیں تھے، چنانچہ وہ ہمیشہ خلافت اسلامی کے خلاف اپنی بھڑاس نکالنے کی فکر میں لگے رہتے۔

حضرت عثمان غنیؓ نے نظام مملکت کو مضبوط کرنے کے لیے جن حکام و گورنر کا انتخاب کیا وہ اگرچہ آپ کے معتمد علیہ تھے، لیکن ماضی میں ان کے نہ شاندار کارنامے تھے، نہ معاشرہ میں کوئی بڑی دینی وجاہت تھی، اور پھر ان کی طرف سے بعض ایسی کارروائیاں بھی ظہور میں آئیں جو تنقید و ناراضگی کا سبب ثابت ہوئیں، اور خاص کر جن لوگوں نے عہد رسالت کے کارندوں کا مشاہدہ کیا تھا یا جن کی نگاہوں میں عہد صدیقی اور عہد فاروقی کے کارندوں کی مثالیں تھیں انھیں ناگواری کا احساس ہوا، نتیجہ یہ ہوا کہ آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، اور ان کے خلاف جابجا چرچے ہونے لگے، حالانکہ اتنی بڑی مملکت میں ہر ایک کو خوش رکھنا خلیفہ کے لیے ممکن نہ تھا، اور جن حکام پر لوگوں نے اعتراضات کیے تھے ان کی خامیاں اتنی سنگین نہ تھیں کہ مملکت کے

حق میں ان کی خوبیوں سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

حضرت عثمانؓ اپنے حکام و امراء کی جانب سے بالکل غافل نہیں تھے، لیکن اتفاق یہ تھا کہ آپ تک باتیں دیر میں پہنچتیں اور شکایتوں کا طومار پہلے کھڑا کر کے خود سے فیصلے کر لیے جاتے اور جب تحقیقات ہوتیں تو اکثر شکایتیں بے بنیاد ثابت ہوتیں۔

اسلامی مملکت میں غیر مخلصین اور معاندین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، اس طرح کے موقعوں کو وہ ہمیشہ غنیمت سمجھتے، چنانچہ کچھ سر پھرے لوگ حضرت عثمان غنیؓ کے محاسبہ کے لیے سامنے آئے، ان میں ایسے بھی تھے جن کے اپنے ذاتی اغراض تھے، وہ بھی تھے جن پر حد قائم کی جا چکی تھی، ایسے بھی تھے جن کے باپ یا رشتہ دار کسی جرم میں قید کر دیے گئے تھے، وہ بھی تھے جن کو ان کی بیویوں سے غیر شرعی شادی کی بنیاد پر الگ کر دیا گیا تھا، اور ایسے افراد بھی تھے جن کا مقصد صرف فتنہ پھیلانا اور تماشہ دیکھنا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرہ کے قلعہ میں ایسا جھروکہ بن گیا جس سے مسموم ہوائیں آندھیاں بن کر اندر آنے لگیں۔(۱)

نوٹ

امیر المؤمنین حضرت عثمان غنیؓ نے امراء اور حکام کے انتخاب میں اپنے طور پر پوری دیانت داری اور سوجھ بوجھ سے کام لیا، اور ایسے افراد کا انتخاب کیا جن کا ظاہر صاف ستھرا تھا اور سب سے بڑھ کر رعیت کے حق میں ان کی صلاحتیں نہایت سودمند تھیں، تاہم اس بات کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ان امراء وحکام میں مراون بن الحکم، ولید بن عقبہ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح بھی تھے جنھوں نے حضرت عثمانؓ کی شرافت نفسی، ان کی نرم مزاجی اور ان کی احسان مندی کا غلط فائدہ اٹھایا اور ان کو بے خبر رکھ کر ایسے کام کیے جس سے خلافت عثمانی کی شبیہ خراب ہوئی اور حضرت عثمانؓ کے سلسلہ میں بدگمانیاں عام ہوئیں۔

---

(۱) مزید وضاحت کے لیے دیکھئے: العبقریات الاسلامیۃ، از: استاذ محمد محمود العقاد

ابن سبا کا کردار

امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفانؓ کے خلاف سازشوں اور شورشوں کو ان کی شہادت تک پہنچانے میں سب سے بڑا کردار عبداللہ بن سبا کا تھا، حالات کا جائزہ لینے اور مسلم معاشرہ کی کمزوریوں سے آگاہی کے بعد اس نے حضرت عثمان غنیؓ اور ان کے وزراء و گورنر کو نشانہ بنایا، ان کے خلاف جھوٹی اور بے بنیاد افواہیں پھیلائیں، جعلی خطوط لکھے، ان کا پروپیگنڈہ کیا اور عوام کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت وعداوت کے جذبات اس حد تک مشتعل کر دیے کہ لوگوں میں بغاوت کا مزاج پیدا ہو گیا، نظام مملکت کمزور پڑ گیا، اور مسلمانوں میں باہمی انتشار و تفرقہ پیدا ہونے لگا۔

ابن سبا کے سیاسی دورے

عہد عثمانی میں اسلامی حکومت کے پانچ بڑے مراکز تھے، مدینہ تو دار الخلافہ تھا اور شروع ہی سے وہ اسلامی طاقت وشوکت کا منبع تھا، کوفہ، بصرہ اور مصر فوجی چھاؤنیاں اور لشکری قبائل کی بستیاں تھیں، اور ان جگہوں پر بڑی تعداد میں اسلامی افواج موجود تھیں، اس کے علاوہ دمشق تمام ملک کا دار الصدر تھا۔

عبداللہ بن سبا نے شروع میں ہی ان پانچوں مراکز کی اہمیت کا اندازہ کیا، وہاں کے حالات کا اور مسلمانوں کی عام کمزوریوں کا جائزہ لیا، اور پھر سب سے پہلے مدینہ منورہ پہنچا، مدینہ منورہ سے بصرہ، بصرہ سے کوفہ، کوفہ سے دمشق اور پھر دمشق سے مصر پہنچا، دمشق میں امیر معاویہ کی وجہ سے اسے کچھ خاص کامیابی نہ مل سکی البتہ باقی ہر جگہ وہ کامیابی کے ساتھ لوگوں کے خیالات اور اعتقادات میں شبہات پیدا کرتا، چھوٹی چھوٹی جماعت تیار کرتا، اور ہر مقام پر اپنے راز دار و شریک کار ایجنٹ چھوڑتا گیا۔ اس کے علاوہ اس نے ایسے ہمنوا بھی تیار کر لیے جو اس کے رنگ میں رنگے ہوئے اور اسی کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے تھے، ان میں چند مشہور کارندوں کے نام یہ تھے: مالک بن

اشتر نخعی، علقمہ بن قیس، جنب بن زہیر غامدی، ثابت بن قیس، جندب بن کعب ازدی، عروہ بن جعد، زیاد بن النضر، عبداللہ بن الاصم، حکیم بن جبلہ عبدی، حرقوس بن زہیر سعدی وغیرہ۔

ابن سبا نے اپنی تحریک کی کامیابی کے لیے درج ذیل لائحۂ عمل طے کیا جس پر اس کے نمائندے سختی سے عمل پیرا رہے:

۱۔ مکمل پرہیز گاری اختیار کی جائے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ لوگوں کو اپنا معتقد اور گرویدہ بنایا جائے۔

۲۔ خلیفہ اور ان کے گورنرز پر الزمات لگائے جائیں اور ان کا خوب پروپیگنڈہ کیا جائے۔ جس کے لیے فرضی خطوط کا بھی سہارا لیا جائے۔

۳۔ خلیفۃ المسلمین کو اقرباء پروری کے حوالہ سے بدنام کیا جائے۔(۱)

کوئی تحریک گرچہ کتنے ہی منفی نظریات اور مذموم مقاصد پر مبنی ہو، اگر اسے ظاہری طور پر پُرکشش بنا دیا جائے، ایسے عنوانات سے گھیر دیا جائے جس میں عوام کی بھی دلچسپی ہو اور پھر اس کے نمائندے مسلسل پوری قوت سے اس تحریک کے لیے سرگرم ہوں تو اس تحریک کے دو نتیجے سامنے آتے ہیں، ایک تو یہ کہ اس تحریک میں ایسے لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جن کے ذاتی رجحانات وعواطف اس تحریک کے مقاصد کے خلاف ہوتے ہیں لیکن تحریک کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر اس کے ہمنوا بن جاتے ہیں، جیسے سبائی تحریک کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر مدینہ منورہ کے بعض افراد ابن سبا کے حامی ہو گئے۔ اور دوسرے یہ کہ جن حضرات کو تحریک کے مقاصد سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی یا جو تحریک کے سخت مخالف ہوتے ہیں وہ حالات کو ناسازگار پا کر گوشہ گیر ہو جاتے ہیں، جس کے نتیجہ میں تحریک کے لیے راستہ بالکل صاف ہو جاتا ہے اور وہ اپنے مقاصد سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔

---

(۱) الکامل لابن الأثیر: ۳/۱۵۴

جعلی خطوط

مصر پہنچنے کے بعد عبداللہ ابن سبا کے مجوزہ دستور العمل کے مطابق کوفہ اور بصرہ کے سبائیوں نے اپنے اپنے گورنر کے خلاف شکایتیں لکھ کر بھیجنا شروع کر دیں، پھر مصر سے بھی یہ سلسلہ شروع ہو گیا، اسی طرح حضرت عثمانؓ کی جانب سے بھی جعلی خطوط لکھے گئے جن میں مختلف حاکموں کو بعض خاص لوگوں کے خلاف کارروائی کی ہدایات دی گئیں۔

مدینہ منورہ میں بھی ابن سبا کے حامی موجود تھے، انھوں نے حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ جیسے جلیل القدر صحابہ کی جعلی مہریں بنائیں، ان کے دستخط کیے، اور جعلی خطوط صوبوں کو روانہ کیے، ان خطوط میں حضرت عثمان پر سخت تنقید، ان کی خلافت سے بیزاری، اور نظام حکومت کی تبدیلی کا اظہار ہوتا۔ عام طور پر یہ خطوط دیہاتوں میں آباد مسلمانوں کو سنائے جاتے جسے وہ من وعن قبول کر لیتے۔ اس طرح عام مسلمانوں میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ حضرت عثمان غنیؓ خلافت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے سے قاصر ہیں، انھیں خلافت سے ہٹا کر کسی دوسرے کو خلیفہ بنایا جائے، اور پھر بصرہ کے لوگ حضرت طلحہؓ کے حامی ہو گئے، کوفہ کے لوگ حضرت زبیر بن العوامؓ کے طرفدار ہو گئے اور مصر کے لوگ حضرت علیؓ کے حق میں آ گئے۔ ایسے موقعہ پر ابن سبا نے کسی کا نام پیش کرنے کے بجائے انھیں ان کے اختلافات میں چھوڑ دیا۔

"حضرت مسروق فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ نے مجھ سے کہا:

تم نے عثمان کو میل کچیل سے صاف کیے ہوئے کپڑے کی طرح شفاف چھوڑا پھر اپنے قریب کیا اور پھر مینڈھے کی طرح ذبح کر دیا۔

حضرت مسروق نے جواب دیا: یہ سب آپ ہی کا تو کیا ہوا ہے، آپ ہی نے لوگوں کو خطوط لکھے اور انھیں بغاوت پر آمادہ کیا۔

یہ سن کر حضرت عائشہؓ حیران ہو گئیں اور فرمایا: اس ذات کی قسم جس پر

مومنین ایمان لائے اور کافروں نے کفر کیا، میں نے ان کی طرف سے
کبھی کوئی تحریر لکھی ہی نہیں، آج کی اس مجلس تک میں نے کبھی ان کی
جانب سے کسی سفید (کاغذ) پر کوئی سیاہ (حرف) نہیں رکھا۔"(۱)

سبائی فتنہ کا عروج

خلافت عثانی کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ، خفیہ مراسلت، اور بے جا الزامات کی نشرواشاعت کے باعث شورش کی بارودی سرنگ اہم اہم شہروں میں بچھ چکی تھی، بس ضرورت صرف صحیح وقت پر دیا سلائی دکھانے کی تھی، جس کے لیے ایام حج سے بہتر کوئی اور وقت نہیں تھا، چنانچہ ایک خفیہ قرارداد کے مطابق حج کے عنوان سے بصرہ، کوفہ اور مصر سے الگ الگ قافلے روانہ ہوئے اور کچھ راستہ طے کرنے کے بعد تینوں قافلے ایک ہوگئے، باغیوں کی اس جماعت کی تعداد تین ہزار سے بھی زائد تھی، راستہ میں جو ہمنوا ملے وہ بھی شریک ہوتے گئے، ان کا ظاہری مقصد حضرت عثمانؓ کو خلافت سے دستبردار کرنا اور اپنے پسندیدہ شخص کو خلیفہ بنانا تھا، جبکہ حقیقت میں حضرت عثمان کی شہادت کی پلاننگ تھی جس سے ابن سبا کے خاص الخاص راز دار ہی واقف تھے، مدینہ منورہ سے تین منزل کے فاصلہ پر الگ الگ مقام پر ان بلوائیوں نے پڑاوڈالا۔

مدینہ منورہ پہنچ کر یہ رائے ہوئی کہ آگے بڑھنے سے پہلے اہل مدینہ کے خیالات واحساسات کو بھی جان لینا ضروری ہے، بلوائیوں کو یقین تھا کہ اہل مدینہ بھی ان کے ساتھ ہیں، چنانچہ زیاد بن النضر اور عبداللہ بن الاصم مدینہ منورہ پہنچے اور حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ سے ملاقاتیں کیں اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا، اس پر ان حضرات نے ان کی ملامت کی اور واپس کردیا، انھوں نے جاکر سبھی بلوائیوں کو صورتحال سے آگاہ کیا، اس کے بعد بصرہ، کوفہ اور مصر کے نمائندوں نے حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت علیؓ سے الگ الگ ملاقات کی، اور یہ وضاحت بھی کردی کہ ہم آپ کو اگلا

(۱) البدایہ والنہایہ: ۷/۲۰۴

خلیفہ بنانا چاہتے ہیں آپ ہم سے بیعت لے لیں، یہ سن کر ان اکابر نے انھیں جھڑک دیا، انھیں سخت سست کہا، ان کی زجر و توبیخ کی اور سب کو واپس جانے کا حکم دیا۔

یہاں یہ بات بھی قابل تذکرہ ہے کہ مدینہ منورہ میں موجود سبائیوں نے ان اکابر صحابہ کی جانب سے متعدد خطوط لکھے تھے جن میں اس بات کی وضاحت تھی کہ حضرت عثمان اب خلافت کے اہل نہیں رہے، انھیں مسند خلافت سے ہٹانے میں ہی امت کا فائدہ ہے، اسی لیے ان بلوائیوں نے آکر ان سے ملاقات کی اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا، لیکن منفی جواب سن کر انھیں سخت حیرانی ہوئی، اور مصلحت اسی میں نظر آئی کہ اپنے اپنے علاقوں کو واپس لوٹ جائیں۔

حضرت عثمانؓ کا محاصرہ

اکابر صحابہ کے سمجھانے بجھانے پر بلوائی واپس چلے گئے، اور بظاہر شورش کے بادل چھٹنے لگے تھے، لیکن سبائیوں کا مقصد افہام و تفہیم نہ تھا، یہاں سے واپس جانے کا مطلب سبائیت کا اپنے مقاصد سے پہلو تہی کرنا تھا، چنانچہ کچھ دور واپس لوٹنے کے بعد یہ بلوائی پھر پلٹے اور ان کے پرشور نعروں سے مدینہ منورہ کی فضا گونج اٹھی، انھوں نے پہنچتے ہی امیر المؤمنین حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کرلیا۔

حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو اطلاع ہوئی تو ان تینوں حضرات نے مدینہ کے اور لوگوں کے ساتھ بصرہ، کوفہ اور مصر کے نمائندوں سے الگ الگ ملاقاتیں کیں، اور واپس آنے کی وجہ دریافت کی، ہر ایک وفد نے یہی جواب دیا کہ ہم ابھی کچھ دور ہی گئے تھے کہ ہمیں خلیفۃ المسلمین کا ایک قاصد نظر آیا، ہم نے اس کو پکڑ کر تحقیقات کیں تو پتہ چلا کہ خلیفہ نے مصر کے گورنر کے نام پیغام بھیجا ہے کہ مصری وفد کے جو سرغنہ ہیں انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ دوسرے شہروں کے باشندوں نے کہا کہ ہم اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے آئے ہیں۔

’’مصریوں نے حضرت علی سے کہا کہ دیکھیے دشمن خدا (خلیفہ) نے ہمارے

متعلق کیا کچھ لکھا ہے، اب ہمارے لیے اس کا خون حلال ہے، آپ کھڑے ہو جائے اور ہمارا ساتھ دیجیے۔ حضرت علی نے کہا: خدا کی قسم میں تمہارا ساتھ ہرگز نہ دوں گا۔ وہ بولے: پھر آپ نے ہمیں خط کیوں لکھا تھا؟ حضرت علی نے جواب دیا: خدا کی قسم میں نے ہرگز تم لوگوں کو کوئی خط نہیں لکھا۔ اس پر وہ لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ کیا یہی ہیں وہ جن کے لیے تم لڑنے بھڑنے کو تیار ہو۔"(۱)

حضرت علی نے بصرہ کے نمائندوں سے کہا:

"اے بصرہ والو! تمہیں کیسے پتہ چلا کہ مصریوں کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے؟ تم سفر کی کئی منزلیں طے کر چکے تھے، پھر ہماری جانب آ گئے، واللہ یہ تو ایسا منصوبہ ہے جو مدینہ میں ہی بنالیا گیا تھا۔" یہ سن کر بلوائیوں سے کوئی جواب نہ بن سکا اور کھسیانے ہو کر کہا "ٹھیک ہے پھر جیسا آپ سمجھیں"(۲)

محاصرہ کرنے کے بعد بلوائی سردار عبدالرحمٰن بن عدیس نے حضرت عثمان کے سامنے ان کا خط پیش کیا جس پر ان کی مہر بھی لگی ہوئی تھی، حضرت عثمان نے کہا:

"یہ ہمارے خلاف ایک ثبوت ہے، مگر بخدا نہ میں نے یہ لکھا ہے نہ لکھایا ہے، اور نہ مجھے اس سلسلہ میں کچھ معلوم ہے، اور مہر بھی کبھی جعلی بنا لی جاتی ہے۔

بلوائی نے کہا: آپ کا خلیفہ رہنا جائز ہی نہیں کیونکہ اگر آپ جھوٹے ہیں تو جائز ہی نہیں کہ کوئی جھوٹا شخص خلیفہ بنے، اور اگر آپ سچے ہیں تو اتنے کمزور شخص کا خلیفہ بننا جائز نہیں جس کی اطلاع و مرضی کے بغیر کوئی بھی جو جی چاہے حکم نافذ کردے۔

---

(۱) موارد الظمآن صفحہ ۵۳۲، تاریخ طبری میں بھی تفصیل موجود ہے (۲) تاریخ طبری ۵/۱۰۵

حضرت عثمان نے کہا: میں خلافت کی قمیض ہرگز نہیں اتاروں گا جس کو اللہ نے مجھے پہنایا ہے۔ بلوائی نے کہا: ہم اس وقت تک مدینہ سے نہیں جائیں گے جب تک آپ کو خلافت سے برطرف کریں یا آپ کو قتل کردیں، اور اگر آپ کے ساتھیوں نے مزاحمت کی تو ہم ان سے بھی جنگ کریں گے، یہاں تک کہ ہم آپ تک پہنچ جائیں۔

حضرت عثمان نے جواب دیا: مجھے قتل ہوجانا منظور ہے لیکن خلافت سے دستبردار ہونا منظور نہیں، رہا تمہارا یہ کہنا کہ تم میرے ساتھیوں سے جنگ کروگے تو میں کسی بھی شخص کو جنگ کرنے کی اجازت نہیں دونگا۔''(۱)

خط کس نے لکھا تھا؟

بعض مؤرخین کی رائے ہے کہ یہ خط مروان ابن الحکم نے حضرت عثمان کی طرف سے لکھا تھا، چونکہ مروان پر بہت طرح کے اعتراضات تھے، اور خلافت کے امور میں من مانی کے الزامات بھی تھے اسی لیے اس کی نسبت سے اس بات کو آسانی سے قبول کرلیا گیا، جبکہ بعض محققین کی رائے ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عثمان کی طرف سے یہ خط خود عبداللہ بن سبا نے یا اس کے کسی ساتھی نے لکھا تھا، یہ بات اس لیے بھی قرین قیاس ہے کہ خلیفہ کی مہر کا استعمال کرنا اور ان کی جعلی دستخط کرنا نہ صرف سنگین جرم تھا بلکہ ایک غداری تھی، اور مروان جیسے دور اندیش سیاست داں سے ایسی حماقت کی امید نہیں کی جاسکتی، اور جبکہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ مصر کا وفد ابھی واپس ہوا ہے اور راستہ میں ہی ہوگا۔

یہاں اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ سبائیوں نے فتنہ سازی کے لیے جعلی خطوط کو ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تھا، اور حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کی جانب سے متعدد خطوط لکھے تھے، اور انھیں خطوط کی بنیاد

(۱) الکامل لابن الأثیر: ۳/۱۶۹-۱۷۰

پر بلوائی مدینہ میں یکجا ہوئے تھے۔اوراہل مصر نے حضرت علی سے ان کے خط کا حوالہ بھی دیا تھا۔

اس کے علاوہ یہ خط مصری گورنر کے نام تھا جسے مصری قافلہ نے مصر کے راستہ میں برآمد کیا تھا، اورکوفہ وبصرہ والے اپنے اپنے راستہ پر جا چکے تھے، انھیں کیسے علم ہوا کہ مصری گورنر کے نام کسی خط کا انکشاف ہوا ہے، اور پھر سب نے مل کر مدینہ منورہ میں ایک ساتھ ہنگامہ کیا، یہی اعتراض دیگر صحابہ اور خود حضرت علی کرم اللہ وجہ نے بھی کیا تھا جس کا جواب اہل بصرہ نہیں دے سکے تھے۔جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ سبائی سازش کا شاخسانہ تھا۔

مظلومانہ شہادت

باغیوں نے حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کرلیا جو کہ ابتداء میں تھوڑا نرم تھا، اس دوران حضرت عثمان مسجد میں آتے جاتے اور نماز بھی پڑھاتے تھے، لیکن کچھ وقفہ بعد اس میں سختی آنے لگی، اور باغیوں نے آپ کو مسجد میں آنے جانے سے بھی روک دیا اور باغیوں کا سرغنہ غافقی امامت کرنے لگا۔(۱)

حضرت عثمان کسی بھی صورت خلافت سے دست بردار ہونے کو راضی نہ تھے، کیونکہ خلافت کوئی دنیوی عہدہ ومنصب نہ تھا بلکہ ایک دینی ذمہ داری تھی، اور انھیں معزول کرنے والوں کو شرعی حق حاصل نہ تھا، اور اگر حضرت عثمان اس وقت دست بردار ہوجاتے تو آگے چل کر فسادیوں اور بلوائیوں کے لیے یہی نظیر بن جاتی، یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمان نے باغیوں سے کہا تھا کہ یہ تم لوگوں کا اپنا معاملہ ہے، تم لوگ جسے چاہو اپنا خلیفہ بنالو، رہا میرا معاملہ تو خلافت کی یہ خلعت مجھے اللہ تعالیٰ نے پہنائی ہے اور میں اسے اتارنے کو تیار نہیں۔(۲)

تقریبا ایک مہینہ کا عرصہ گزر گیا، حج کے ایام بھی ختم ہونے کے قریب آرہے

---

(۱) طبری ج۴ص۳۵۴ (۲) البدایہ والنہایہ ج۷ص۱۸۴

تھے، اسی اثناء میں خبر پہنچی کہ عراق اور شام سے فوجیں مدینہ کے لیے نکل چکی ہیں، یہ سنتے ہی باغیوں کے ہوش اڑ گئے، سبائیوں کو یقین ہو چلا کہ فوج کے آنے کے بعد ان کا برا حشر ہونے والا ہے اور جس مقصد کے تحت وہ مدینہ آئے ہیں وہ پھر کبھی پورا نہ ہو سکے گا، چنانچہ انھوں نے محاصرہ میں شدت اختیار کر لی، ہر طرف سے ناکہ بندی کر دی گئی، پانی بند کر دیا گیا، کھانے پینے کی ضرورتوں پر روک لگا دی گئی، حتی کہ یہ سخت محاصرہ تقریباً چالیس دن تک قائم رہا، بالآخر ۱۸/ ذی الحجہ ۳۵ھ بروز جمعہ بلوائی دیوار پھاند کر گھر کے اندر گھس گئے، حضرت عثمان روزہ سے تھے اور اس وقت قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول تھے، کنانہ بن بشر سبائی نے گھستے ہی حضرت عثمان پر تلوار سے وار کیا، آپؓ کی بیوی حضرت نائلہؓ نے اس وار کو روکنے کی کوشش کی جس سے ان کی انگلیاں کٹ کر الگ جا پڑیں، دوسرا وار سودان بن حمران سبائی نے کیا، حضرت عثمان پہلو کے بل گر پڑے، پھر عمرو بن الحمق سبائی نے سینہ پر چڑھ کر نیزہ سے کئی وار کیے، خلیفۃ المسلمین کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور چمنستان صدق وحیا میں خاک اڑنے لگی۔ اس کے بعد باغیوں نے گھر میں لوٹ مار شروع کر دی، جس کے ہاتھ جو چیز آئی اسے لے کر وہ چل دیا۔(۱)

شہادت کے وقت آپؓ قران کریم کی تلاوت فرما رہے تھے، آپ کے خون کے قطرات قرآن مجید کی اس آیت کریمہ پر گرے: فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ (پس عنقریب اللہ تمہاری طرف سے ان کے لیے کافی ہوگا، اور وہ بہت ہی سننے والا جاننے والا ہے) رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

شہادت عثمانؓ اور صحابہ کرام کا عمل

امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے پورے پس منظر میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کبار صحابہ نے ان کا دفاع کیوں نہ کیا؟ بلوائیوں کی اتنی جرأت کیسے

(۱) طبری ج۴ص ۳۹۱، وابن سعد ج۳ص ۵۲

ہوئی کہ اس جلیل القدر خلیفہ کو اتنی مظلومانہ طور پر شہید کر دیا......؟؟

اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ امیر المؤمنین حضرت عثمان غنیؓ کو کسی بھی صورت یہ گوارہ نہ تھا کہ ان کی خاطر مسلمانوں کا خون بہے، انھوں نے اپنے آپ کو فیصلۂ خداوندی کے سپرد کر دیا تھا، یہ ان کی امت محمدیہ (ﷺ) پر غایت درجہ کی شفقت ومحبت کی علامت ہے اور ان کی شرافت نفسی کی روشن دلیل ہے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حکم دیا تھا کہ کوئی بھی ان کی خاطر اپنی تلوار خون آلود نہ کرے۔ ورنہ ان کے ایک اشارہ پر سبھی باغیوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا تھا۔

شیر خدا حضرت علیؓ نے خلیفۃ المسلمین کی طرف سے مدافعت اور باغیوں سے مقابلہ کی اجازت طلب کی تو خلیفۃ المسلمین حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

میں خدا کا واسطہ ہر اس شخص کو دیتا ہوں جو اللہ کو مانتا اور اس کو حق سمجھتا ہے اور اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اس پر میرا حق ہے، ایک پچھنے کے لگانے کے برابر بھی میری خاطر خون نہ بہائے، حضرت علی نے دوبارہ اجازت طلب کی اور انھوں نے دوبارہ یہی جواب دیا۔'' (۱)

''محاصرہ کے وقت حضرت عثمانؓ کے گھر پر جو انصار ومہاجرین موجود تھے ان کی تعداد سات سو (۷۰۰) کے قریب تھی، ان میں حضرات عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، حسنؓ، حسینؓ، ابو ہریرہؓ جیسے جلیل القدر صحابہ اور ان کے غلام بھی موجود تھے، اور یہ تعداد باغیوں کو روکنے کے لیے کافی تھی، حضرت عثمانؓ نے کہا کہ جس پر بھی میرا کوئی حق ہے اس کو قسم دیتا ہوں کہ وہ اپنا ہاتھ روک لے اور اپنے گھر چلا جائے، اپنے غلاموں سے کہا کہ جو تلوار میان میں کر لے وہ آزاد ہے، اور روایت ہے کہ آخری شخص جو حضرت عثمان کے پاس سے نکلا وہ حضرت حسن بن علیؓ تھے۔'' (۲)

---

(۱) عثمان بن عفان ذی النورین ص ۲۱۸ از استاذ صادق عرجون بحوالہ المرتضی

(۲) ابن کثیر ج ۷ ص ۱۸۱، ۱۸۲ بحوالہ المرتضی

محاصرہ کے دوران حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے آپؓ سے عرض کیا تھا:

''اے امیر المؤمنین! تین مشوروں میں سے ایک قبول کر لیجیے؛ ایک یہ کہ آپ کے جاں نثاروں کی اتنی بڑی تعداد موجود ہے، آپ ان کے ساتھ باہر نکلئے اور ان بلوائیوں کا مقابلہ کیجئے، اہل مدینہ بھی آپ ہی کا ساتھ دیں گے۔ دوسری یہ کہ گھر کے پچھلے حصہ میں ہم ایک دروازہ بنا دیتے ہیں آپ اس کے راستہ مکہ مکرمہ چلے جائیے، حرم مکہ میں کوئی بھی دست درازی نہ کر سکے گا، اور تیسرے یہ کہ آپ یہاں سے ملک شام کو چلے جائیے، وہاں معاویہ اور آپ کے دوسرے حامی موجود ہیں۔

حضرت عثمانؓ ان تینوں صورتوں میں سے کسی پر بھی راضی نہ ہوئے اور فرمایا: میں ان باغیوں کا مقابلہ نہیں کروں گا، کیونکہ میں ایسا خلیفہ نہیں بننا چاہتا جس کی تلوار مسلمانوں کے خون سے رنگین ہو۔ میں مکہ مکرمہ بھی نہیں جاؤں گا کیونکہ یہ فتنہ پرور وہاں بھی خوں ریزی سے باز نہیں آئیں گے، اور تیسری تجویز اس لیے نامنظور ہے کہ جوار رسول اور دار الہجرہ سے جدائی مجھے منظور نہیں۔''(۱)

سبائیت کی کامیابی

امیر المؤمنین حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت سے قیامت تک کے لیے اسلامی وحدت اور مسلم یکجہتی کی دیوار میں رخنہ پیدا ہوا، فرقہ بندی، طبقاتی عصبیت اور خانہ جنگی کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا، نئے نئے فتنے سر اٹھانے لگے، اور حضرت علیؓ کو ایسا دور ملا جس میں ان کی ساری خداداد صلاحتیں ان فتنوں کی سرکوبی اور طبقاتی خلیج کو ختم کرنے کی نذر ہو گئیں، مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی اتنی جانیں تلف ہوئیں جتنی اس وقت کفار و مشرکین سے معرکوں میں بھی نہ کام آئی ہوں گی۔

---

(۱) طبقات ابن سعد ج ۳ صفحہ ۴۸، ۴۹

سبائیوں کا بنیادی مقصد امت مسلمہ کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا، اس کی بڑھتی ہوئی طاقت وشوکت کو روکنا اور فتنہ وفساد کا ایسا سلسلہ شروع کرنا تھا جس سے مسلمان خانہ جنگیوں کی بھینٹ چڑھ جائیں اور اسلام قصۂ پارینہ بن جائے، اس مقصد کے لیے انھوں نے امیر المؤمنین حضرت عثمان غنیؓ کا انتخاب کیا تھا، اس ناحیہ سے وہ کامیاب ہوئے کہ مسلمان خانوں میں تقسیم ہوگئے، اوران کا شیرازہ بکھر گیا۔

عبداللہ ابن سبا کا مذہبی محاذ

سب سے پہلے ابن سبا نے خاندان نبوت (ﷺ) سے عقیدت اوراس سے کمال محبت واخلاص کا اظہار کیا، اور لوگوں کو اس معاملہ میں پختگی اختیار کرنے کی دعوت شروع کی، اوراس بات پر زور دیا کہ خلیفہ برحق کو لازم پکڑو، اس پر کسی کو ترجیح نہ دو اور مخالفین کی طرف کسی بھی طرح کا جھکاؤ نہ ہو۔اس کی یہ باتیں ہر عام وخاص میں مقبول اور تمام اہل اسلام کے لیے مرغوب ہوئیں، اور عام مسلمانوں نے اس کو ایک سچا پکا مسلمان اور غایت درجہ کا مخلص سمجھا، اور ایک تعداد اس کی ہم نوا ہوگئی۔

عام مسلمانوں میں کچھ مقبولیت حاصل کرنے کے بعد ابن سبا نے سب سے پہلے یہ شوشہ چھوڑا کہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ مسلمان یہ عقیدہ تو رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اس دنیا میں دوبارہ آئیں گے لیکن اس بات کو نہیں مانتے کہ محمد رسول اللہ (ﷺ) بھی دوبارہ ضرور تشریف لائیں گے، جبکہ دین محمدی کا عالمی نفاذ بھی باقی ہے، لیکن ابن سبا کے اس نظریہ کو عام طور پر رد کردیا گیا۔اس کے بعد اس نے حب علیؓ اور حب اہل بیت کو اپنا موضوع بنایا جس میں اسے خاطر خواہ کامیابی ملی۔

حضرت علیؓ کی شان میں غلو

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی مظلوم شخصیت سب سے زیادہ عبداللہ ابن سبا کی سازش اوراس کی مخفی سرگرمیوں کا نشانہ بنی، نبی کریم (ﷺ) سے آپؓ کے خونی رشتہ،

قریبی تعلق اور عظمت وعبقریت کو ابن سبا نے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا، اور پھر ایک ایسے فرقہ کی بنیاد ڈالنے میں وہ کامیاب ہوا جو آگے چل کر اسلام اور اہل اسلام کے لیے ایک ناسور بن گیا، اس فرقہ نے اسلام کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور مسلمانوں کے اسلاف کے خلاف انتقامی رویہ اختیار کیا۔

ابن سبا نے سب سے پہلے حضرات شیخین پر حضرت علی مرتضیٰ کی افضلیت کا ذکر کیا، اور آپؓ کے متعلق مختلف قسم کے جھوٹ باندھے، چنانچہ حضرت جعفر صادقؒ فرماتے ہیں:

> ''امیر المؤمنین رسول اللہ (ﷺ) کے بعد سب سے سچے تھے، اور جو شخص آپؓ پر جھوٹ باندھتا تھا اور جھوٹ باندھ باندھ کر آپ کے سچ کو جھوٹ ثابت کرتا تھا وہ عبداللہ ابن سبا تھا، اللہ تعالیٰ کی اس پر لعنت و پھٹکار ہو۔''(۱)

حضرت علیؓ کی امامت کا عقیدہ

ایک جماعت کو اپنے دام فریب میں گرفتار کرنے کے بعد اس نے حضرت علیؓ کی ذات گرامی کو نشانہ بنایا، اور اس نظریہ کی تبلیغ کی کہ حضرت علی مرتضیٰؓ کو آنحضرت (ﷺ) کا سب سے زیادہ قرب حاصل تھا، وہ آپ (ﷺ) کے برادر اور داماد بھی ہیں، اس لیے آپ (ﷺ) کے بعد حضرت علی تمام انسانوں میں افضل ہیں، اور جس طرح ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے جیسے حضرت موسیٰ کے وصی حضرت ہارون تھے اسی طرح آنحضرت (ﷺ) کے وصی حضرت علی مرتضیٰؓ ہیں، اور جس طرح آنحضرت (ﷺ) خاتم الانبیاء ہیں اسی طرح حضرت علی خاتم الاوصیاء ہیں۔ اور وصی کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے شخص کا مسند خلافت پر بیٹھنا ظلم ہے۔ اس لیے نہ صرف حضرت عثمان بلکہ ان سے پیشتر حضرت ابوبکر وحضرت عمر بھی (نعوذ باللہ) غاصب ہیں، اور

(۱) بحار الأنوار: ۲/۲۱۷

اب یہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ غاصب کو معزول کر کے نبی کے وصی کو اس کا حق دلائے۔اس کے نتیجہ میں حضرت علی کی شان میں غلو اور حضرات شیخین میں گستاخی کا سلسلہ شروع ہوا۔

”وكان أول من أشهر بالقول بفرض امامة علىؓ وأظهر البراء ة من أعدائه وكاشف مخالفيه وأكفرهم۔“ (١)

(یہ سب سے پہلا شخص ہے جس نے یہ مشہور کیا کہ حضرت علیؓ کی امامت کا قائل ہونا فرض ہے، اس نے حضرت علیؓ کے دشمنوں (یعنی خلفائے ثلاثہ) پر اعلانیہ تبرا کیا، اور حضرت علیؓ کے مخالفین کو واشگاف کیا اور ان کو کافر کہا)

ابن سبا کے اس وسوسہ سے عام مسلمانوں میں حضرات شیخین اور حضرت علیؓ کے مابین افضلیت وغیر افضلیت اور حق خلافت کا موضوع گرم ہو گیا، باہمی مناظروں اور مجادلوں تک کی نوبت آنے لگی۔

حضرت علیؓ کی الوہیت کا عقیدہ

ابن سبا نے جب دیکھا کہ اس کا یہ تیر نشانہ پر بیٹھا اور مسلمانوں کے عقیدہ میں فتنہ وفساد نے راہ پالی ہے تو اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپنے خاص الخاص شاگردوں میں یہ بھید بھی کھولا کہ حضرت علیؓ سے بہت سی ایسی چیزیں صادر ہوتی ہیں جو بشری قدرت سے باہر کی ہیں، اور وہ ایسے کارنامے انجام دیتے ہیں جو الوہیت کے خواص میں سے ہیں، اس لیے خوب سمجھ لو کہ حضرت علی خود خدا ہیں، یعنی ناسوت کے لباس میں لاہوت جلوہ فرما ہے۔

حضرت علیؓ کی خدائی کے ساتھ اس نے خود کی نبوت کا بھی اظہار کیا۔

حضرت جعفر صادقؒ کا قول ہے:

---

(١) بحار الأنوار:٢٨٧/٢٥

”لعن الله ابن سبا انه ادّعى الربوبية فى أمير المؤمنين، و كان والله أميرالمؤمنين عبدا طائعا، الويل لمن كذب علينا، وان قوماً يقولون فينا مالا نقوله فى أنفسنا،نبرأ الى الله منهم، نبرأ الى الله منهم۔“ (۱)

(اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو ابن سبا پر کہ اس نے امیر المؤمنین کے بارے میں ربوبیت کا دعویٰ کیا، خدا کی قسم! امیر المؤمنین خدا کے فرمانبردار بندہ تھے، ہلاکت ہو اس کی جو ہم پر جھوٹ باندھے، کچھ لوگ ہمارے بارے میں ایسی ایسی باتیں کہتے ہیں جو ہم اپنے بارے میں نہیں کہتے، ہم اللہ کے سامنے ان سے براءت کا اظہار کرتے ہیں، ہم اللہ کے سامنے ان سے براءت کا اظہار کرتے ہیں۔)

”ان عبدالله بن سبا كان يدعى النبوة ويزعم أن أميرالمؤمنين هو الله– تعالىٰ عن ذلك– فبلغ ذلك أمير المؤمنين فدعاه وسأله، فأقر ذلك،وقال نعم أنت هو، وقد كان ألقى فى روعى انك أنت الله وانى نبي۔(۲)

(عبداللہ ابن سبا نبوت کا دعویٰ رکھتا تھا، اور کہتا تھا کہ امیر المؤمنین ہی خدا ہیں- اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بالاتر ہے- امیر المؤمنین کو معلوم ہوا تو اس کو بلوایا اور اس سے پوچھا تو اس نے اس کا اقرار کیا، اور کہا کہ ہاں آپ وہی ہیں، میرے دل میں یہ بات القا کی گئی ہے کہ آپ اللہ ہیں اور میں نبی ہوں)

حضرت علیؓ کی رجعت کا عقیدہ

”جب حضرت علیؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تو ابن سبا نے کہا کہ حضرت

(۱)بحار الأنوار:۲۵/۲۸۶ (۲)بحار الأنوار:۲۵/۲۸۶

علی کا انتقال تو ہو ہی نہیں سکتا، وہ حضرت عیسیٰؑ کی طرح آسمان پر چلے گئے ہیں۔ جب اس سے کہا جاتا کہ حضرت علیؓ کو شہید کر دیا گیا ہے تو وہ کہتا کہ اگر کسی تھیلے میں تم ان کا دماغ بھی لا کر دکھاؤ تب بھی میں یقین نہیں کروں گا، وہ جب تک آسمان سے نزول نہ کریں وہ مر ہی نہیں سکتے، اور مرنے سے پہلے سارے عالم پر انہی کی حکومت ہوگی۔

بعض سبائی یہ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ حضرت علیؓ بادلوں میں روپوش ہیں، اور جو بجلی کڑکتی ہے وہ انہیں کی آواز ہے، چنانچہ جب بھی بجلی کڑکتی تو وہ کہتے: "السلام عليك يا امير المؤمنين!" (۱)

حضرت علیؓ کا ردعمل

حضرت علیؓ کو جب ابن سبا کی حرکتوں کی خبر ہوئی تو آپ نے اسے بلوایا اور اس سلسلہ میں اس سے پوچھ تاچھ کی تو اس نے اقرار کیا اور کہا کہ بے شک آپ ہی خدا ہیں، اور میرے دل میں یہ بات من جانب اللہ ڈالی گئی ہے، اس پر حضرت علیؓ نے اسے بہت ہی سخت سست کہا، اور کہا کہ تجھ پر شیطان کا جادو چل گیا ہے، تو اپنی بات سے رجوع کر اور توبہ کر، اس نے انکار کر دیا، تو آپؓ نے اسے قید کرنے کا حکم دیا، اور تین دن کی مہلت دی، لیکن پھر بھی اس نے رجوع نہیں کیا اور اپنی بات پر ڈٹا رہا، آخر کار حضرت علیؓ نے حکم دیا کہ اسے زندہ جلا دیا جائے، اس حکم پر بعض لوگوں نے کہا کہ اگر آپ ایسا کریں گے تو لوگ طرح طرح کی باتیں کریں گے، اور بے جا اعتراضات اور تنقیدیں ہوں گی، چنانچہ حضرت علی نے اسے جلاوطن کر کے ساباط المدائن بھیج دیا۔

شیعان علیؓ

عبداللہ بن سبا نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات سے متعلق جن نظریات کا

(۱) دائرۃ معارف القرن العشرین، از: محمد فرید وجدی بحوالہ المرتضی صفحہ نمبر ۲۶۳

پروپیگنڈہ کیا اس سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد متأثر ہوئی، خاص کر وہ مسلمان جو مختلف علاقوں کے فتح ہونے کے نتیجہ میں اسلام میں داخل ہوئے تھے اوراپنی عجمی تہذیب وثقافت سے جڑے تھے، چنانچہ حضرت علیؓ سے متعلق تین طرح کے گروہ سامنےآئے (۱)تفضیلیہ شیعہ (۲)سبیّۃ شیعہ (۳)غالی شیعہ۔

۱-تفضیلیہ شیعہ؛ یعنی وہ شیعہ جو حضرت علیؓ کوتمام اکابر صحابہ اور خاص کر حضرات شیخین پر فضیلت دیتے تھے، یہ فرقہ ابن سبا ملعون کے ادنیٰ شاگردوں کا تھا۔ حضرت علیؓ نے اس کے بارے میں سخت جملے کہے تھے، اور کہا تھا کہ اگر میں نے کسی کے بارے میں سنا کہ وہ مجھے حضرات شیخین پر فضیلت دیتا ہے تو میں اس پر مفتری (بہتان لگانے) کی حد جاری کروں گا۔

۲-سبیّۃ شیعہ؛ یعنی وہ شیعہ جو تمام صحابہ کرام کو ظالم وغاصب، اور کافر ومنافق گردانتے تھے، ان کے خلاف زبان طعن دراز کرتا تھا، اور خاص کر حضرات شیخین کی شان میں گستاخیاں کرتا تھا، اس گروہ کو''تبرائیہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ گروہ ابن سبا کے درمیانی شاگردوں کا ہے، حضرت علیؓ نے اپنے خطبوں میں ان کے بارے میں سخت الفاظ کہے، اوران سے اپنی براءت کا اعلان کیا۔

۳-غالی شیعہ؛ یعنی وہ شیعہ جو حضرت علیؓ کی الوہیت کے قائل تھے، یہ ابن سبا کے خبیث شاگرد اوراس کے رازداں تھے، حضرت علیؓ نے ابن سبا کے ساتھ انھیں بھی زندہ جلانے کا حکم دیا تھا جس پر کچھ سبائیوں نے تبصرے شروع کردیے تو حضرت علیؓ نے انھیں ملک بدر کردیا(۱)

ان تین فرقوں سے متعدد شاخیں بھی وجود میں آئیں، جن کے عقائد ونظریات ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ تھے، ان کی تفصیلات عقیدۂ امامت کے باب میں ملاحظہ ہو۔

---

(۱) تفصیلی معلومات کے لیے ملاحظہ ہو تحفۂ اثنا عشریہ از حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

امیر المؤمنین حضرت علیؓ المرتضیٰ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب بہت ہیں، آپؓ کا شمار ان جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے جن کے جنتی ہونے کی بشارت خود آنحضرت (ﷺ) نے ان کی زندگی میں ہی دی تھی، آنحضور (ﷺ) کے چچازاد بھائی، اور آپ (ﷺ) کی سب سے چہیتی اور جنتی عورتوں کی سردار بیٹی حضرت فاطمہؓ کے آپؓ شوہر ہیں، آپؓ کی شجاعت وبہادری اور ثابت قدمی کی وجہ سے دربار رسالت (ﷺ) سے آپؓ کو ''اسد اللہ'' کا خطاب ملا، خلفائے راشدین میں آپؓ کا چوتھا مقام ہے۔

حضرت علیؓ کی خلافت

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے پیچھے جو سازشی دماغ کام کر رہا تھا وہ یہودی عبداللہ ابن سبا کی عیار ومکار ذات تھی، اس نے جھوٹے پروپیگنڈوں کے ذریعہ ایک بہت بڑی تعداد کو ورغلا کر حضرت عثمانؓ کے خلاف کر دیا، اور ایک بلوی کی شکل میں انھوں نے مدینہ منورہ کا محاصرہ کیا، اور تلاوت قرآن کی حالت میں حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا۔

جنگ جیتنا تو آسان ہے لیکن جنگ کے بعد امن قائم رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حالات نہایت سنگین ہو گئے، چاروں طرف خوف وہراس اور بدامنی کی صورتحال پیدا ہو گئی، کئی روز تک اہل مدینہ انتظار کرتے رہے کہ مسلمانوں کی سربراہی کے لیے کون آگے بڑھتا ہے؟ اس دوران باغی سردار غافقی بن حرب نے مدینہ پر کنٹرول کر رکھا تھا حتی کہ مسجد میں امامت بھی وہی کرتا تھا، ابن سبا

کے اشارہ پر سبائیوں نے پورے شدومد سے حضرت علیؓ کا نام پیش کیا، اہل مدینہ نے بھی خلافت کے لیے حضرت علیؓ کو ہی سب سے زیادہ موزوں سمجھا، لیکن حضرت علیؓ کو اس سے گُریز تھا، لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اس مشکل کو حل کریں، حضرت علیؓ سے ہی بار بار رجوع کیا جارہا تھا، ان کے پیہم اصرار پر حضرت علیؓ نے فرمایا:

> ''میرا خیال چھوڑ دو، تمہارے حق میں میرا وزیر بننا میرا امیر بننے سے بہتر ہے۔'' انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم ہم آپ سے بڑھ کر کسی کو اس منصب کا حقدار نہیں سمجھتے۔ آپ نے فرمایا: اگر تمہارا اصرار ہے تو میری بیعت یہاں خفیہ نہیں ہوسکتی، میں مسجد کو چلتا ہوں، پھر وہاں جو میری بیعت کرنا چاہے وہ کرلے، پھر حضرت علی مسجد آئے، منبر پر چڑھے، اور تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ واقعہ بروز جمعہ ۲۴/ ذی الحجہ ۳۵ھ کا ہے۔'' (۱)

حضرت علیؓ کی بیعت ایسے وقت میں ہوئی جو تاریخ کا انتہائی نازک وقت تھا، حضرت عثمان ابن عفانؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آچکا تھا، وہ بھی انتہائی بدنمائی، بے رحمی اور وحشیانہ شکل میں، جس کے بعد حالات نہایت پیچیدہ اور مشکل ہوگئے، افواہیں پھیلنے لگیں، قیاس آرائیوں کا زور ہوگیا، چہ می گوئیاں بڑھ گئیں، لوگ آپس میں تبصرے کرتے، ایک دوسرے سے پوچھتے کہ آگے کیا ہونے والا ہے؟ رنگ برنگ کی توقعات اور بھانت بھانت کی خواہشات ظاہر کی جانے لگیں، جس محفل میں جایئے، جس مجلس میں بیٹھیے بس ایک ہی گفتگو اور ایک ہی چرچا، ان حالات میں قاتلان عثمانؓ سے قصاص کے مطالبہ کی آواز اٹھتی ہے، اور خاص کر ان کی آوازیں زیادہ تیز ہوتی ہیں جنھوں نے حادثہ کے زمانے میں خون تو الگ رہا پسینہ کا ایک قطرہ بھی نہیں بہایا تھا، یہ لوگ مصر و عراق کے باشندے اور دیہی قبائل کے افراد تھے۔ اس کے علاوہ ایک اہم

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۲۲۶-۲۲۷ باختصار

بات جسے ذہن میں رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ شہادت عثمانؓ کے وقت سے اطلاعات و رابطہ عامہ کا قلمدان مستقل طور پر سبائیوں نے سنبھال لیا تھا، چنانچہ منظر عام پر وہی خبر سامنے آتی تھی جسے وہ لانا چاہتے تھے، گرچہ وہ خبر بے بنیاد ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت علیؓ نے سب سے پہلا فرمان یہ جاری کیا کہ مختلف علاقوں سے آئے ہوئے بلوائی اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ جائیں، جسے ابن سبا اور اس کے ساتھیوں نے ماننے سے انکار کر دیا اور مدینہ خالی کرنے پر راضی نہ ہوا۔ ''شیعان علیؓ'' کا یہ پہلا کردار تھا کہ جن لوگوں نے اصرار کے ساتھ حضرت علی کو خلیفہ بنایا تھا انھوں نے ہی حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

قصاص عثمانؓ کا مطالبہ

جب حضرت علی المرتضٰی کی بیعت ہوگئی اور خلیفۃ المسلمین منتخب ہوگئے تو مدینہ منورہ میں سب سے پہلے حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے قصاص لینے کا مطالبہ سامنے آیا، اور دھیرے دھیرے اس میں شدت اختیار کی جانے لگی، جن لوگوں نے قصاص عثمانؓ کا مطالبہ کیا تھا ان میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی تھے، لیکن حضرت علیؓ کی طرف سے فوری کارروائی نہ ہونے پر حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے مکہ معظّمہ جانے کی اجازت طلب کی، اور پھر وہ دونوں حضرت عائشہؓ کی خدمت میں پہنچے جو ایک قافلہ کے ساتھ حج پر گئی ہوئی تھیں، حضرت عائشہؓ کو حضرت عثمانؓ کی شہادت کا علم ہو چکا تھا، اور وہ بھی قاتلوں سے قصاص کا مطالبہ کر رہی تھیں، یہ سب حضرات مکہ میں جمع ہوئے اور حضرت عثمانؓ کے قصاص لینے کے کا عزم کیا، ادھر بصرہ سے یعلیٰ ابن منبہ اور کوفہ سے عبداللہ ابن عامر بھی آگئے، اور انھوں نے بھی قصاص لینے کا عزم ظاہر کیا۔

ادھر حضرت علیؓ بھی قاتلان عثمان سے قصاص لینے کا فیصلہ کر چکے تھے، لیکن صورت حال بہت ہی پیچیدہ اور غیر واضح تھی، اور کسی بھی قسم کی سیاسی کارروائی سے حالات کے مزید الجھ جانے کا خطرہ تھا، اس لیے حضرت علیؓ قصاص لینے میں تھوڑا

توقف کرنا چاہتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ میں عثمانؓ کے معاملہ میں پورا انصاف کروں گا مگر ابھی بلوائیوں کا زور ہے اور امر خلافت بھی ابھی مستحکم نہیں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ قصاص کی بنیادی شرطیں بھی مفقود تھیں، اور اگر جلد بازی میں فیصلہ کیا جاتا تو بعض وہ بے گناہ بھی زد میں آجاتے جنھیں سبائیوں نے اپنے طور پر استعمال کیا تھا۔

اس سے بھی زیادہ پیچیدہ صورتحال کچھ اس طرح تھی کہ بقول العقاد:

''حضرت علی نے ایک بار قاتلان عثمان سے قصاص لینے کی بات کی تو یک بارگی پوری فوج جس کی تعداد دس ہزار تھی نیزہ اٹھا کر کھڑی ہوگئی اور علانیہ پکار اٹھی کہ ہم سب عثمانؓ کے قاتل ہیں، جو قصاص لینا چاہتا ہو وہ ہم سے قصاص لے۔'' (۱)

جنگ جمل اور سبائیوں کا کردار

حضرت طلحہؓ وحضرت زبیرؓ اور حضرت عائشہؓ اپنے حامیوں کے ساتھ مکہ سے بصرہ کی طرف چل پڑے، ان کا مقصد قاتلین عثمان سے انتقام لینا تھا، بصرہ پہنچ کر انھوں نے حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ شروع کردیا، اس کے نتیجہ میں حالات خاصے بگڑ گئے اور نوبت خانہ جنگی تک آ پہنچی، حضرت علیؓ کو اس صورتحال کا علم ہوا تو دس ہزار کی تعداد میں ایک عظیم لشکر تیار کیا اور حضرت طلحہؓ وحضرت زبیرؓ سے مقابلہ کے لیے نکل پڑے۔

بصرہ پہنچ کر حضرت علی نے مقداد بن اسود اور قعقاع ابن عمرو کو حضرت طلحہ اور حضرت زبیر سے مذاکرات کے لیے بھیجا، مذاکرات کے نتیجہ میں دونوں فریق میں قاتلان عثمان سے قصاص لینے پر اتفاق ہوگیا، البتہ یہ طے نہیں ہوسکا تھا کہ قصاص کب لیا جائے گا، تاہم دونوں فریق جنگ نہ کرنے پر راضی ہوگئے۔

صلح کی اس رات جب دونوں فریق بے فکر ہوکر چین کی نیند سو رہے تھے،

---

(۱) العبقریات الاسلامیة: ۲۹٤

سبائیوں کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی، اور انھیں یقین ہو گیا تھا کہ اب حضرت عثمان کے قتل کی پاداش میں وہ گرفت میں آنے والے ہیں، چنانچہ عبداللہ ابن سبا کی قیادت میں ایک خفیہ میٹنگ بلائی گئی جس میں اشتر نخعی، شریح بن اوفی، سالم بن ثعلبہ، غلاب ابن ہیثم کے علاوہ تقریباً ڈھائی ہزار افراد شامل تھے، اس میٹنگ میں فیصلہ ہوا کہ اگر یہ صلح ہو گئی تو علیؓ اور عائشہؓ کی تلواریں ہماری گردنوں پر ہوں گی۔

صلح ہو چکی تھی، امن کی فضا سازگار ہوتی دکھائی دے رہی تھی کہ سحر کے وقت سبائیوں کے ایک جتھے نے حضرت طلحہ وزبیر کے لشکر پر حملہ کر دیا، اور کچھ افراد کو شہید کر دیا، حضرت طلحہ کے لشکر نے سمجھا کہ حضرت علی نے ان سے بدعہدی کی ہے، اس لیے انھوں نے حضرت علی کے لشکر پر تیراندازی شروع کر دی، ادھر حضرت علی کے لشکر نے سمجھا کہ حضرت طلحہ وزبیر کی طرف سے بدعہدی ہوئی ہے اور جواباً انھوں نے بھی تیراندازی شروع کر دی، دونوں فریق دوپہر تک تیراندازی کرتے رہے، پھر گھمسان کا رن پڑا جس میں تقریباً تیرہ ہزار مسلمان شہید ہوئے۔

یہ معرکہ ''جنگ جمل'' کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس اس معرکہ میں حضرت عائشہؓ کا اونٹ ان کے لشکر کا علامتی نشان تھا، اور ناموس رسالت کے فدائی اس کی حفاظت کے لیے اپنی جانوں پر کھیل رہے تھے، اور جب تک اونٹ نہ گرا یہ معرکہ گرم رہا، اور بہت سے جاں نثار اس کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوئے، جب اونٹ گر پڑا تو معرکہ تھم گیا، اور حضرت علی کی فتحیابی کا اعلان ہوا، لیکن حقیقت میں یہ سبائیوں کی فتح تھی کہ ہر دو طرف سے نقصان صرف مسلمانوں کا ہی ہوا تھا۔

مرکز خلافت کی منتقلی

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت مدینہ منورہ کی بڑی توہین ہوئی تھی، اور جنگ جمل کے بعد الٹی سیدھی افواہوں کا سلسلہ جاری تھا، ایسے پرفتن اور پرآشوب دور میں اس بات کا قوی امکان تھا کہ خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو جائے اور مسجد

نبوی (ﷺ) ، حرم ثانی اور آرامگاہ رسول اکرم (ﷺ) کی عظمت اور اس کا ادب واحترام پوری طرح باقی نہ رہ سکے، چنانچہ حضرت علیؓ کی حساس اور غیرت مند طبیعت اس فیصلہ پر مجبور ہوئی کہ دارالخلافہ مدینہ منورہ سے کہیں اور منتقل کردیا جائے، اس وقت اسلامی سلطنت جس مرحلہ میں تھی اس میں ضرورت تھی کہ مرکز ایسے مقام پر ہو جہاں تمام قوتیں آکر ملتی ہوں، اور ہندوفارس ویمن، عراق وشام کی باہمی تجارت کے لیے مشترکہ گزرگاہ ہو، اس لحاظ سے کوفہ دارالخلافت کے لیے موزوں ترین جگہ تھی کہ وہ سیاست کے ساتھ ساتھ علم وثقافت کا بھی مرکز تھا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کوفہ ہی سبائیوں کا گڑھ بھی تھا، اور یہ حضرت علی کا سیاسی اجتہاد تھا کہ وہاں رہ کر سبائیوں کی حرکتوں پر نظر رکھی جاسکتی تھی، اوران کے بڑھتے رسوخ کو دبایا جاسکتا تھا، لیکن سبائیوں نے یہ تاثر عام کرنے کی کوشش کی کہ حضرت علیؓ نے ان کی ہمنوائی اوران کی موافقت کی بنیاد پر مدینہ منورہ کے بجائے کوفہ کو اپنادارالخلافہ بنایا ہے۔

حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ

حضرت امیر معاویہؓ کے بہترین سپہ سالار اور ایک کامیاب حاکم ہونے میں کسی کو شبہ نہیں، دربار رسالت (ﷺ) میں آپؓ کو قرب خاص حاصل تھا، آپ کا شمار کاتبین وحی میں ہوتا ہے، امیرالمؤمنین حضرت عمر فاروقؓ نے آپ کو شام کا حاکم مقرر کیا تھا، حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں ان کو ان کے عہدہ پر برقرار رکھا، کیونکہ ان کو معزول کرنے یا کسی اور علاقہ میں منتقل کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی، بلکہ عہد فاروقیؓ ہی میں آپ ایک کامیاب حاکم ثابت ہوچکے تھے، شام کے حالات پرامن تھے، کسی طرح کی کوئی بدامنی نہ تھی، اور عوام بھی اپنے حاکم سے پوری طرح مطمئن تھے، لیکن جب حضرت عثمانؓ کے خلاف پروپیگنڈہ کیا گیا، ماحول بگاڑنے کی سازشیں رچی گئیں، اور سبائیوں نے جو الزامات لگا کر آپؓ کی ذات کو مطعون کرنے کی کوشش کی ان میں ایک الزام یہ

بھی تھا کہ آپؓ نے امیر معاویہؓ کو حاکم بنا رکھا ہے جو کہ آپؓ کے رشتہ دار ہیں (۱)

حضرت علیؓ نے جس وقت زمام خلافت سنبھالی تھی اس وقت کے حالات نہایت گنجلک اور غیر یقینی تھے، مختلف پروپیگنڈوں کا بازار گرم تھا، کسی بھی حاکم پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کر لینا سیاسی مصلحت کے خلاف تھا، کیونکہ عہد عثمانی میں سبائیوں نے اکثر کو مطعون کر رکھا تھا، چنانچہ حضرت علیؓ نے پہلے مختلف صوبوں کے حاکم بدلنے کا فرمان جاری کیا، تاکہ اپنی پسند کے حکمرانوں کے ذریعہ امن کو قائم کرنا اور خلافت کو مضبوط کرنا آسان ہو، آپ نے شام میں بھی حاکم کی تبدیلی کا فرمان روانہ کیا، اور امیر معاویہ کو بھی معزول کر دیا، کیونکہ ان کی جانب سے جو افواہیں پہنچ رہی تھیں اس سے سیاسی استحکام بظاہر ناممکن تھا۔

ادھر شام کی صورتحال دوسرے صوبوں سے بالکل الگ تھی، اس صوبہ پر حضرت امیر معاویہؓ عہد فاروقی سے مقرر تھے جس پر بیس بائیس سال کا عرصہ گذر چکا تھا، حضرت عثمانؓ کے رشتہ دار اور ان کے معتمد ہونے کی وجہ سے ان کو اور اہل شام کو حضرت عثمانؓ سے والہانہ تعلق تھا، حضرت عثمان کی خون آلود قمیض اور ان کی اہلیہ کی کٹی ہوئی انگلیاں شام پہنچ چکی تھیں، جس نے اہل شام کے جذبات کو برانگیختہ کر دیا، اور پورے علاقہ کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا انتقام لیا جائے، ایسے وقت میں حضرت امیر معاویہ کی معزولی سے اہل شام کی بغاوت کا اندیشہ تھا، چنانچہ امیر معاویہؓ نے یہ

---

(۱) آج بھی بہت سے آزاد خیال قسم کے لوگ شیعوں کے شانہ بشانہ ہو کر حضرت امیر معاویہؓ کی شان میں بڑی بے باکی کے ساتھ گستاخانہ جملے استعمال کر جاتے ہیں، اور کچھ تاریخی کتابوں کی بنیاد پر صحابہ کرام کے درمیان ظاہری اختلافات میں دلچسپی لیتے ہیں، اور ان کے صحیح اور غلط کا فیصلہ کرتے ہیں، اور نادانستہ اپنے ایمان کو خطرہ میں ڈالتے ہیں، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ان تاریخی کتابوں کی حیثیت ٹھیک اسی طرح ہے جیسی ہمارے آج کے دور میں اخبارات کی ہے، اس لیے صحابہ کرام کو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس معیار صرف احادیث نبوی (ﷺ) ہیں، اور حضرت امیر معاویہؓ کی عظمت وفضیلت کے لیے بس یہی کافی ہے کہ آپؓ صحابی رسول ہیں، اور یہ وہ مقام ہے جہاں سبھی اولیائے ملت، پیروں کے پیر بلکہ جملہ سلاسل اربعہ کے سرتاج بھی نیازمندی کا دم بھرتے ہیں۔

پیغام بھیجا کہ قصاص لیے جانے کے بعد ہی وہ حضرت علی کو خلیفۃ المسلمین تسلیم کریں گے، اوراس کے بعد ہی وہ بیعت کریں گے۔

مدینہ منورہ میں بلوائیوں کا زور تھا، فوج میں بھی ان کی ایک بڑی تعداد تھی، حضرت علیؓ کے کہنے کے باجود ابن سبا اوراس کے حامی مدینہ خالی کرنے کو تیار نہ تھے، پھر حضرت علی نے اپنا دارالخلافہ مدینہ سے کوفہ منتقل کردیا تھا جو کہ سبائیوں کا گڑھ تھا، اس کے علاوہ مخالفین نے جنگ جمل کو حضرت علی کی مطلق العنانی کی شکل میں پیش کیا، اس سے اہل شام میں یہ تأثر پھیلتے دیر نہ لگی کہ بلوائیوں کو حضرت علی کی پشت پناہی حاصل ہے، بلکہ افواہیں یہاں تک پھیلیں کہ (معاذ اللہ) حضرت عثمانؓ کے قتل کے پیچھے حضرت علیؓ کا ہی ہاتھ ہے، ان افواہوں میں جہاں سبائیوں کا کردار تھا وہیں اہل شام واہل عراق کی دیرینہ رقابتیں بھی اپنا کام کررہی تھیں، امیر معاویہ گرچہ اس بات کو قبول کرنے کو تیار نہ تھے کہ قتل عثمان میں حضرت علی کا ہاتھ ہے لیکن اہل شام کے لیڈر شرحبیل بن سمط کندی اور پھر اس کی ہمنوائی میں اکثر اہل شام کا یہی موقف تھا کہ حضرت عثمانؓ کے قتل میں حضرت علیؓ کا بھی ہاتھ ہے، لہٰذا پہلے وہ قصاص لیں اس کے بعد ہی ان کو خلیفہ تسلیم کیا جائے گا۔

امیر معاویہ نے بڑی کوشش کی کہ اہل شام کو امن وصلح پر آمادہ کرلیا جائے لیکن شرحبیل نے اس کو ماننے سے انکار کردیا بلکہ امیر معاویہ سے سخت کلامی کرتے ہوئے کہا:

> ”أبى الناس الا أن ابن أبى طالب قتل عثمان ، والله لئن بايعته لنخرجنك من الشام، فقال معاوية: ماكنت لأخالف أمركم وانما أنا واحد منك۔“(۱)

(لوگ ہر بات کا انکار کر کے صرف اس بات پر مصر ہیں کہ ابن ابی طالب نے ہی عثمان کو قتل کیا ہے، خدا کی قسم اگر آپ نے ان کی بیعت کی تو ہم

---

(۱) الأخبار الطوال: ۱۶۱، بحوالہ: علیؓ وحسینؓ از:- قاضی اطہر مبارک پوریؒ

آپ کو ضرور بالضرور شام سے نکال باہر کریں گے۔ معاویہ نے کہا میں تم
لوگوں کی مخالفت نہیں کرتا ہوں، میں تم لوگوں کا ہی ایک آدمی ہوں۔

ایک طرف حضرت علی بلوائیوں کے بیچ میں گھرے ہوئے تھے تو دوسری طرف اہل شام کی ضد اور ہٹ دھرمی کے سامنے امیر معاویہ مجبور تھے، چنانچہ حالات ایسے بگڑے کہ حضرت علی اور امیر معاویہ کے درمیان مذاکرات بھی ناکام ہوگئے اور نوبت جنگ تک آ پہنچی۔

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ اس جنگ کا تعلق ہنگامی، سازشی اور مقامی صورتحال سے تھا، اس لیے پورا عالم اسلام اس سے الگ تھلگ رہا، یہ نہ کوئی کفار کے خلاف جہاد تھا نہ کسی ارتداد کے خلاف کوئی جنگ تھی، بلکہ یہ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی تھی اس لیے اس میں امیر معاویہ کے حمایتی اور شیعان علی ہی لڑے بھڑے، اور حضرات صحابہ کرام نے حضرت علیؓ کے موافق ہونے کے باجود خود کو اس جنگ سے دور رکھا اور حضرت علیؓ کی موافقت یا امیر معاویہؓ کی مخالفت میں سامنے نہیں آئے۔ اور بقول علامہ ابن تیمیہ کے کہ اس جنگ میں جو صحابہ کرام شریک ہوئے ان کی تعداد تیس تک بھی نہیں پہنچتی جبکہ اس وقت تقریباً دس ہزار صحابہ کرام موجود تھے۔(۱)

صفین کی جنگ اور سبائی کردار

حضرت علیؓ ایک لاکھ افراد پر مشتمل لشکر لے کر شام کی طرف بڑھے اور صفین کے مقام پر پہنچے، امیر معاویہؓ کو حضرت علیؓ کے کوچ کی خبر ملی تو انھوں نے بھی اپنی فوج کو مرتب کیا اور اسی ہزار افراد کو لے کر میدان جنگ پہنچ گئے، یہ ذی الحجہ ۳۶ھ کا واقعہ ہے، اس مہینہ میں صلح کی کوششوں کے بعد انفرادی لڑائی اور یکا دکا جھڑپیں ہوتی رہیں، دونوں لشکر اس جوش سے خالی تھے جو کفار سے لڑتے وقت ہوتا تھا، کیونکہ آمنے سامنے دونوں مسلمان ہی تھے، اور آپسی قرابت دار بھی، اسی دوران محرم کا مہینہ

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے: علیؓ و حسینؓ، از:- قاضی اطہر مبارک پوریؒ

شروع ہوا، اور جنگ بندی کے اعلان کے ساتھ جنگ صفین کا ایک مرحلہ مکمل ہوا، محرم کے مہینہ میں دونوں طرف کی فوجیں بالکل خاموش رہیں، اور مصالحت کی گفتگو اور سلسلہ جنبانی پھر جاری رہا۔

حضرت امیر معاویہؓ اپنے آپ کو خلیفہ نہیں کہتے تھے، اور نہ خلافت کے مسئلہ پر انھوں نے حضرت علیؓ سے کوئی اختلاف کیا، امیر مسلم خولانیؒ سے مروی ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے پاس گئے اور کہا کہ آپ علیؓ سے خلافت کے سلسلہ میں اختلاف کیوں کرتے ہیں؟ کیا آپ علیؓ کے برابر ہیں؟ اس پر حضرت معاویہ نے فرمایا: بخدا علی مجھ سے افضل ہیں اور خلافت کے حقدار بھی ہیں، لیکن کیا تم نہیں جانتے کہ عثمانؓ کو ظلماً قتل کر دیا گیا، میں ان کا چچا زاد بھائی ہوں اور ان کے قصاص کا مطالبہ کر رہا ہوں، تم علیؓ کے پاس جاؤ اور کہو کہ عثمان کے قاتلوں کو میرے حوالہ کر دیں اور میں یہاں کا انتظام ان کے سپرد کرنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ وہ گئے اور حضرت علیؓ سے گفتگو کی، لیکن حضرت علیؓ اس بات پر راضی نہ ہوئے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس ایک مہینہ کی جنگ بندی میں دونوں لشکر اس نظریہ پر قائم ہو چکے تھے کہ جنگ سے صلح بہر حال بہتر ہے، اور مسلمانوں کو ہرگز آپس میں نہیں لڑنا چاہیے، لیکن سکون وخاموشی کے ان ایام میں سبائی جماعت جنگ کے لیے پوری مستعدی اور احساس مندی سے کوشاں رہی، وہ کسی طرح اس بات پر راضی نہیں تھی کہ معاملہ صلح پر ختم ہو جائے، کیونکہ صلح کی صورت میں ان کی ہلاکت یقینی تھی، چنانچہ جنگ کی دبتی ہوئی آگ کو یہ فرقہ ہوا دیتا رہا، اور سادہ لوح افواج کے جذبات کو بھڑکاتا رہا، بالآخر یہ کوششیں ناکام ہوئیں اور صلح کی بیل منڈھے نہ چڑھی، اور ماہ صفر کے آغاز سے خونیں جنگ کی شروعات ہوگئی۔

یہ جنگ کئی روز تک چلتی رہی، لیکن دونوں فریق میں سے کسی کو بھی غلبہ حاصل نہیں ہو رہا تھا، جنگ کے آخری دن جب اس بات کا قوی امکان ہو چلا تھا کہ امیر

معاویہ کی فوج کو شکست ہونیوالی ہے تو حضرت عمرو ابن العاصؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ قرآن مجید کو نیزوں پر بلند کرلیا جائے اور یہ مطالبہ کیا جائے کہ دونوں فریق میں قرآن مجید کو حکم بنایا جائے اوراس کے مطابق فیصلہ کو سب کو تسلیم کریں، نیزوں پر قرآن مجید کو دیکھ کر دونوں فوجوں نے اپنی تلواریں روک لیں، حضرت علیؓ سمجھتے تھے کہ شکست سے بچنے کی خاطر یہ حیلہ اختیار کیا گیا ہے، اس لیے حضرت علیؓ نے اپنی فوج کو اس فریب میں آنے سے روکنے کی کوشش کی، لیکن سبائیوں کی ایک جماعت نے حضرت علی کی سخت مخالفت کی اور مسعر ابن فدکی تمیمی اور زید ابن حصین الطائی ثم السابی نے حضرت علی سے کہا کہ جب اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جارہا ہے تو اسے قبول کرنا چاہیے، اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو ہم تمہیں دشمنوں کے حوالہ کردیں گے یا تمھیں بھی ابن عفان کے پاس پہنچادیں گے۔اس پر حضرت علیؓ نے کہا کہ اگر تم میری بات مانتے ہو تو جنگ جاری رکھو اور اگر میری بات نہیں مانتے تو جو چاہو کرو۔ بہرحال ماحول ایسا بنا کہ تحکیم کے نام پر یہ جنگ رک گئی۔

خوارج کا ظہور

سبائیوں کے اصرار پر حضرت علی تحکیم پر راضی ہوئے، اور فریقین کی جانب سے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت عمرو ابن العاصؓ کا انتخاب ہوا، پھر ایک دستاویز تیار ہوئی جس میں ان دونوں نے حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ سے معاہدہ اور اقرار لیا کہ فیصلہ ہونے تک کسی بھی قسم کی فوجی کارروائی نہیں ہوگی اور دونوں طرف کی جانیں محفوظ ہوں گی، اور جو بھی فیصلہ کیا جائے گا اسے دونوں تسلیم کریں گے۔

جب یہ معاہدہ پڑھ کر سنایا جانے لگا تو سبائیوں کی ایک جماعت نے اس کی سخت مخالفت کی اور تحکیم کو کفر قرار دیا، عروہ بن اذینہ سبائی نے کھڑے ہوکر کہا: أتحکمون فی دین اللہ الرجال" (کیا تم اللہ کے دین میں لوگوں کو حکم بناتے ہو؟)۔

اس کے بعد حضرت علی کوفہ کی جانب روانہ ہوئے، جب شہر کے قریب پہنچے تو سبائی جماعت کے دو آدمیوں زرعہ ابن برج الطائی اور حرقوس ابن زہیر سعیدی نے حضرت علی سے کہا:

''خدا کے علاوہ کسی اور کو حکم نہیں بنایا جاسکتا، آپ اس غلطی سے توبہ کیجیے، اور ہمارے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کیجیے، لیکن تحکیم کا عہد نامہ لکھا جاچکا تھا، اس لیے حضرت علی نے فرمایا کہ میں نے خود اس کی مخالفت کی تھی لیکن تم ہی لوگوں نے مجھے مجبور کیا، اب جو عہد نامہ لکھا جاچکا ہے تو میں اسے توڑ نہیں سکتا، خدا فرماتا ہے کہ ''جو عہد کرو اسے پورا کرو''۔ انھوں نے آپ کو بہت مجبور کیا لیکن آپ آمادہ نہ ہوئے، آخر میں انھوں نے دھمکی دی کہ اگر آپ تحکیم کو تسلیم کرتے ہیں تو ہم خدا کے لیے آپ سے لڑیں گے، آپ نے فرمایا کہ تمہاری لاشیں خاک اور خون میں تڑپیں گی۔''(۱)

اس کے بعد تقریباً بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) لوگ حضرت علی کے لشکر سے الگ ہوگئے، اور یہیں سے ان کا نام ''خوارج'' پڑا، پھر انھوں نے عبداللہ بن وہب راسبی کے ہاتھوں پر بیعت کی اور حضرت علیؓ کی عملی مخالفت شروع کردی، اس فرقہ نے "لَآ حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ" کا نعرہ دیا جو کہ اس کا شعار اور عقیدہ بنا، اس فرقہ کا عقیدہ تھا کہ معاملات دین میں انسان کو حکم بنانا کفر ہے، اور کسی کو حکم یا اس کا فیصلہ ماننے والے بھی کافر ہیں، اور ان سے جہاد فرض ہے، اس عقیدہ کے مطابق حضرت علی اور امیر معاویہ اور ان کے سبھی حامی کافر تھے، خوارج نے ان عقائد کی بھرپور اشاعت کی اور کوفہ، بصرہ، مدائن اور عراق میں اپنے ہمنوا پیدا کرلیے اور پھر نہروان ان کی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔

ایک مرتبہ حضرت علی خطبہ دے رہے تھے کہ ایک خارجی کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ آپ نے اللہ کے دین میں لوگوں کو شریک کیا، حالانکہ حکم تو صرف اللہ کا چلے گا، اس

---

(۱) ابن الاثیر ج ۳ ص ۱۳۳

پر ہر طرف سے اس کے حامی "لآ حُکمَ اِلا لِلّٰـہ، لآ حُکمَ اِلا لِلّٰہ" کا نعرہ لگانے لگے۔ اس پر حضرت علی فرماتے رہے: "ھذہ کلمة حق یراد بھا باطل" (یعنی یہ بات تو بالکل برحق ہے مگر اس سے جو مطلب لیا جا رہا ہے اور کہنے والوں کی جو نیت ہے وہ باطل ہے) اس کے بعد کوفہ میں بھی جتنے خوارج تھے وہ سب کے سب کوفہ سے نکل کر نہروان میں سمٹ گئے۔

نہروان کی جنگ

خارجیوں نے اپنے عقائد و نظریات کی اشاعت کا کام تیز کر دیا، جو شخص ان کے خیالات کی تائید نہ کرتا اسے بے دریغ قتل کر دیتے، ایک صحابی عبداللہ ابن خبابؓ کو اسی جرم میں شہید کر دیا، اور ان کی حاملہ بیوی کا پیٹ چاک کر کے بے دردی سے قتل کر دیا، قبیلۂ طے کی کئی عورتوں کو بھی نشانہ بنایا، ان کی یہ فتنہ انگیزی دیکھ کر لوگوں نے حضرت علی سے شکایت کی اور عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین! آپ اس فتنہ انگیزی کے لیے خوارج کو آزاد کیوں چھوڑ رہے ہیں، ان کی سرکوبی ضروری ہے، چنانچہ حضرت علی نے ان کو سمجھانے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ باز نہ آئے اور حضرت علی سے جنگ کے درپے ہو گئے، بالآخر انہی کے مرکز نہروان میں ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں خوارج کو نہایت فاش شکست ہوئی اور ان کی اکثریت موت کے گھاٹ اتار دی گئی۔

حضرت علیؓ کی شہادت

نہروان کی جنگ میں اکثر خوارج مارے گئے لیکن ان کی ایک تعداد بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی، چنانچہ اس جنگ کے تقریباً دو سال بعد جبکہ حالات معمول پر آ رہے تھے تین خارجی مکہ میں جمع ہوئے اور تینوں نے باہمی معاہدہ کیا کہ وہ حضرت علی ابن طالبؓ، امیر معاویہؓ اور حضرت عمرو ابن العاص کو قتل کر دیں۔ وہ اپنے فاسق عقیدہ کے مطابق کہہ رہے تھے کہ ہم ان تینوں کو قتل کر کے اللہ کا قرب حاصل کریں گے اور

مسلمانوں کو ان سے سکون مل جائے گا۔

چنانچہ عبدالرحمٰن ابن ملجم مرادی نے کہا کہ میں علی ابن ابی طالب کے قتل کا ذمہ لیتا ہوں۔ برک تمیمی نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں امیر معاویہ کی ذمہ داری لیتا ہوں، اور عمرو ابن بکر تمیمی نے کہا کہ عمرو ابن العاص کو ٹھکانے لگانا میری ذمہ داری ہے۔ پھر اس ''عظیم ذمہ داری'' سے سبکدوش ہونے کے لیے ۱۷/ رمضان المبارک کی تاریخ طے کر دی گئی۔

برک تمیمی فجر کی نماز کے وقت امیر معاویہ کی طرف نکلا اور اپنی تلوار سے آپ کو زخمی کر دیا، زخم بہت گہرا اور ہلاکت خیز نہیں تھا، اس لیے علاج ومعالجہ کے بعد آپ ٹھیک ہو گئے۔ دوسری طرف عمرو بن بکر تمیمی نے بھی اپنے مشن کو پورا کرنے کے لیے مصر پہنچا، اور فجر کی نماز میں حملہ کر دیا، لیکن اتفاق کہ اس روز حضرت عمرو ابن العاص طبیعت کی خرابی کی وجہ سے مسجد نہیں آسکے تھے، ان کی جگہ خارجہ بن حبیب نے امامت کی اور دھوکہ میں وہ شہید کر دیے گئے۔

ابن ملجم نے اپنے کام میں ایک اور شخص شبیب ابن بجیرہ اشجعی کو شریک کر لیا، وہ دونوں حضرت علی کی گذرگاہ میں جا چھپے، حضرت علیؓ فجر کی نماز کے لیے نکلے تو دونوں نے حملہ کر دیا، ابن ملجم نے اگلے حصہ پر وار کیا، سر کے خون سے ریش مبارک رنگین ہو گئی، ابن ملجم نے وار کرتے وقت یہ نعرہ بھی لگایا: ''لا حکم الا للّٰہ، لیس لك و لأصحابك یا علی'' (یعنی حکومت صرف اللہ کی ہے، اے علی! تمہاری یا تمہارے ساتھیوں کی نہیں ہے) حملہ کے بعد شبیب تو بھاگ نکلا لیکن ابن ملجم پکڑا گیا۔

حضرت علیؓ نے وفات سے قبل اپنے صاحبزادوں حضرت حسنؓ وحضرت حسینؓ کو نصیحت فرمائی:

''اے عبدالمطلب کے فرزندو! مسلمانوں کا بے دریغ خون نہ بہانا، تم کہو گے امیر المؤمنین قتل کر دیے گئے مگر خبردار سوائے میرے قاتل کے کسی اور

کو قتل نہ کرنا، دیکھو اگر میں اس کے وار سے مر جاتا ہوں تو اس پر بھی ایک ہی وار کرنا، اس کا مثلہ نہ بنانا۔"(۱)

ابن ملجم نے کہا:

"میں نے اُن (حضرت علیؓ) پر ایسا وار کیا ہے کہ اگر پورے شہر والوں پر یہ وار پڑتا تو سب کے سب مر جاتے، واللہ میں نے اپنی تلوار کو ایک مہینہ تک زہر میں بجھایا، ایک ہزار میں یہ تلوار لی تھی اور ایک ہزار خرچ کر کے اسے زہر آلود کیا تھا۔"(۲)

ابن ملجم کا وار اتنا کرارا تھا اور اس خنجر میں اتنی زہریت تھی کہ حضرت علی جانبر نہ ہو سکے اور تین دن بعد ۲۰/ رمضان المبارک ۴۰ھ کو آپؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔

رسول اللہ (ﷺ) کی پیشین گوئی

حضرت علی کی شہادت کے ساتھ ہی یہودیت و مجوسیت اپنے ناپاک مقاصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوگئی اور مسلمانوں میں دو نئے گروہ پیدا ہوگئے: خوارج اور سبائی۔ یہ دونوں گروہ حضرت علی کے سلسلہ میں افراط وتفریط کا شکار ہوئے، خوارج نے حضرت علی شان اتنی گھٹائی کہ معاملہ تکفیر تک پہنچا دیا، اور سبائیوں نے حضرت علی کا مرتبہ اتنا بلند کیا کہ خدا سے جا ملایا۔

خوارج کی کمر تو حضرت علی نے خود توڑ دی تھی، لیکن سبائیت مختلف شکلوں میں پنپتی رہی، بلکہ برگ و بار لاتی رہی اور اپنے ارتقائی مراحل سے گذر کر "شیعیت" کی شکل میں پائیدار ہوگئی۔

حضرت علی کے سلسلہ میں اللہ کے رسول (ﷺ) نے ایک پیشین گوئی فرمائی تھی جو حرف بحرف صادق آئی۔ حضرت ربیعہ بن الناجدؒ کی روایت ہے:

"حضرت علیؓ نے کہا کہ ایک بار رسول اللہ (ﷺ) نے مجھے بلا کر کہا کہ تم

(۱) المرتضی: ۲۸۱، از:- مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (۲) المرتضی: ۲۸۱

عیسیٰ بن مریمؑ کا نمونہ ہو، ان سے یہود نے اس درجہ بغض بڑھایا کہ ان کی والدہ پر بہتان لگادیا، اور نصاریٰ نے ان سے محبت کی تو اس منزل تک پہنچادیا کہ جو ان کے شایان نہیں تھی۔ (ایک موقع پر) حضرت علیؓ نے فرمایا کہ سن لو میری ذات کے بارہ میں افراط وتفریط کی وجہ سے دو طبقے ہلاک ہوں گے، محبت کرنے والے، ثنا خوانی میں غلو کرنے والے، جو میری ایسی تعریف کریں گے جو مجھ میں نہیں ہے، اور ایسے بغض کرنے والے جن کی دشمنی ان کو مجھ پر بہتان لگانے پر مائل کرے گی، سن لو میں نہ تو پیغمبر ہوں اور نہ مجھ پر وحی آتی ہے، لیکن مین اپنے مقدور بھر کتاب وسنت پر عمل کرتا ہوں، اللہ کی اطاعت کے لیے جو تمھیں حکم دوں اس میں میری اطاعت تم پر واجب ہے، خواہ پسند کرو یا ناپسند کرو۔'' (۱)

حضرت علی کی شہادت کے بعد ابن سبا کہتا تھا کہ علی انتقال کر ہی نہیں سکتے، وہ حضرت عیسیٰ کی طرح آسمان پر چلے گئے ہیں، بعض سبائی کہنے لگے کہ حضرت علی بادلوں میں چھپے ہیں، اور جو بجلی کڑکتی ہے وہ انہیں کی آواز ہوتی ہے، لہذا جب بجلی کڑکتی تو یہ لوگ کہتے "السلام علیك یا امیر المؤمنین" ۔ جب ابن سبا سے کہا گیا کہ حضرت علی شہید ہو چکے ہیں تو اس نے کہا کہ اگر تم ان کا بھیجا بھی ایک تھیلے میں لاکر دکھاؤ جب بھی ہم ان کی موت کا یقین نہیں کریں گے، وہ جب تک آسمان سے نزول نہیں کریں گے وہ مر ہی نہیں سکتے، اور مرنے سے پہلے سارے عالم پر ان کی حکومت ہوگی۔ (۲)

نوٹ

حضرت علی نے جس وقت خلافت کی ذمہ داری سنبھالی وہ فتنوں کی آمد کا وقت تھا، اور جب فتنے آتے ہیں تو ناقابل فہم ہوتے ہیں اور جب فتنے تھمتے ہیں تو حالات واضح ہوجاتے ہیں، اس وقت بھی ان فتنوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت واضح

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۳۵۶ (۲) المرتضیٰ صفحہ: ۲۶۳، از مولانا ابوالحسن علی ندویؒ

نہ تھی، چنانچہ صحابہ کرام نے ان فتنوں سے نمٹنے کے لیے اپنے اپنے اجتہاد پر عمل کیا، کسی ذاتی غرض کا عمل دخل نہ حضرت علیؓ کے اقدام میں تھا، اور نہ امیر معاویہؓ کی کارروائیوں میں، اسی طرح نہ حضرت طلحہؓ وزبیرؓ اور حضرت عائشہؓ کے موقف میں کوئی ذاتی غرض تھی اور نہ ہی ان صحابہ کے فیصلہ میں کوئی ذاتی مصلحت تھی، جنھوں نے "الزموا بیوتکم" کے مصداق پر عمل کرتے ہوئے اپنے گھروں میں بیٹھے رہنے کو ترجیح دی، البتہ اس سے انکار نہیں کہ ان اقدامات سے جو نتائج سامنے آئے اس سے ظاہری طور پر امت مسلمہ کی جان و مال کا خاصا نقصان ہوا تاہم اس سے بھی انکار نہیں کہ ایسے حالات میں صحابہ کرام کی زندگیاں اسوہ کی شکل میں قیامت تک لیے محفوظ ہوگئیں، حالات کی سنگینی اور پیچیدگی اور حالات و مواقع کی کثرت کے باوجود انھوں نے ذاتی اغراض و مقاصد کو بالائے طاق رکھا اور اپنی جان و مال کو راہ خدا میں نچھاور کردیا، اور 'الصحابة کلھم عدول' کی عملی شکل سامنے آئی۔

ابن سبا کی کامیابی

ابن سبا نے ان نومسلم علاقوں کو نشانہ بنایا جن کا عمومی پیشہ لوٹ مار تھا یا وہ افراد جو لوگوں کی توجہ کا مرکز بننا چاہتے تھے اور اقتدار کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے، اس طرح اس نے اپنی کوششوں اور ظاہری دینداری سے انتشار و بغاوت کی ایک ''ذہنیت'' پیدا کردی تھی، جس نے خلیفۃ المسلمین، صحابہ کرام اور عوام کے مابین سارے امتیازات کو مٹادیا، جس کا لازمی نتیجہ شورشوں کی کامیابی اور مسلمانوں کی خانہ جنگی تھا، یہی وجہ ہے کہ کسی فتنہ کے پیچھے ابن سبا براہ راست نظر نہیں آتا، اور اسی کو بنیاد بنا کر بعض مؤرخین نے ابن سبا کے وجود کا یا کم از کم اس کے مؤثر کردار کا انکار کردیا۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں یہی صورتحال عالم اسلام اور خاص کر مشرق وسطیٰ کی بھی ہے کہ تمام فتنوں اور شورشوں کے پس پردہ یہودی سازشوں اور صہیونی دماغ کا قطعی انکار نہیں لیکن وہ کہیں کھل کر نظر نہیں آتا۔

حضرت علیؓ۔شیعوں کی نظر میں

حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ چوتھے خلیفہ منتخب ہوئے، اس وقت امت مسلمہ میں آپ سے افضل کوئی نہ تھا جو خلافت کے عظیم منصب کا اہل ہوتا، لیکن حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت نے امت مسلمہ کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا تھا، اور نوبت باہم جنگ وجدال تک آ پہنچی، اور جمل وصفین کی دو جنگیں ہوئیں۔اس دور انتشار میں عبداللہ ابن سبا کا پورا گروہ جس کی اچھی خاصی تعداد تھی حضرت علیؓ کی ہمنوائی کا دعویدار تھا، اس پر آشوب دور میں اس نے حضرت علی کے نام پر غلط فائدہ اٹھایا، اور حب علیؓ کے جھوٹے دعوے کیے، لشکر کے کم علم اور بے فہم عوام میں حضرت علیؓ کی ذات کو ایک مافوق الفطرت ہستی کی شکل میں پیش کیا، اور کچھ احمقوں کو یہ باور کرایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نبوت کے لیے حضرت علیؓ کا ہی انتخاب کیا تھا لیکن حامل وحی فرشتہ جبرئیل امین سے سہو ہو گیا اور غلطی سے اس نے نبوت حضرت علیؓ کے بجائے آنحضرت (ﷺ) کے پاس پہنچا دی، اس کے علاوہ اس نے سادہ لوحوں کو وہی سبق پڑھایا جو سینٹ پال پولوس (St. Paul Pulos) نے عیسائیوں کو پڑھایا تھا، اور ان کا یہ عقیدہ ہو گیا کہ حضرت علیؓ اس دنیا میں خدا کا مظہر ہیں، اور ان کے قالب میں خداوندی روح ہے، اور گویا وہی خدا ہیں۔ذیل میں حضرت علیؓ سے متعلق شیعوں کے باطل عقائد ونظریات اور ان کی شان میں حد درجہ مبالغہ آرائی کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

علمی کمال

شیعہ علماء نے حضرت علیؓ سے متعلق بے شمار افسانے اور کہانیاں گڑھی ہیں اسی طرح کی ایک افسانوی روایت ملاحظہ ہو:

جلاء العیون میں ملا باقر علی مجلسی نے حضرت علیؓ کے حالات سے متعلق ایک

طویل روایت نقل کی ہے، اس میں پیدائش علیؓ کا حال بیان کرتے ہوئے آنحضرت (ﷺ) کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

''علیؓ نے پیدا ہوتے ہی ابراہیم ونوح کے صحیفے، موسیٰ کی تورات ایسی روانی سے سنادی کہ ان پیغمبروں سے زیادہ اچھی آپ کو یاد تھیں، پھر ساری انجیل پڑھ سنائی کہ اگر عیسیٰ موجود ہوتے تو اس بات کا اقرار کرتے کہ علیؓ ان سے زیادہ انجیل کے قاری وعالم ہیں، پھر وہ سارا قرآن پڑھ ڈالا جو مجھ پر (پیدائش علی کے دس سال بعد) نازل ہوا ہے۔(۱)

واقعاتِ عالم کا علم

حضرت علی نے فرمایا: جبرئیل، تمام فرشتوں اور تمام رسولوں نے میرے لیے ان فضائل ومناقب کا اقرار کیا ہے جو محمد (ﷺ) کے ساتھ خاص ہیں البتہ مجھے چند ایسی صفات عطا کی گئی ہیں، جو مجھ سے قبل کسی کو عطا نہیں کی گئیں، جو مجھے اموات، مصائب وتکالیف اور حسب ونسب کا علم عطا کیا گیا ہے، نیز مجھے قوت خطابت سے بھی نوازا گیا ہے، اس طرح مجھے گذشتہ اور مستقبل کے تمام واقعات عالم کا بھی علم ہے، مجھ پر کائنات کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔''(۲)

ربوبیت

''حضرت علیؓ نے فرمایا: میں زمین کا وہ رب ہوں جس کے ساتھ زمین ٹھہری ہوئی اور ساکن ہے''(۳)

''میں ربوبیت کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہوں''(۴)

(۱) جلاء العیون ص۱۸۰- فارسی
(۲) اصول کافی: ۱/۱۹۶
(۳) مرآۃ الانوار: ۵۹
(۴) شرح الزیارۃ الجامعۃ الکبیرۃ: ۱/۷۰

جنت وجہنم کی ملکیت

’’امیر المؤمنین اکثر فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن جنت اور دوزخ کی تقسیم میرے سپرد ہوگی۔‘‘(۱)

خدا سے ہم کلامی

حضرت علی کے فضائل ومناقب بیان کرتے ہوئے ایک شیعہ راوی کہتا ہے:

’’جب حضرت علی کو فتح خیبر کے لیے بھیجا گیا تو آپ کچھ دیر الگ ہوکر کھڑے رہے، آپ (ﷺ) کے ساتھیوں نے دیکھا تو انھوں نے کہا کہ علی اللہ تعالی سے ہم کلام ہیں، واپسی پر کسی نے رسول اللہ (ﷺ) سے ذکر کیا تو آپ (ﷺ) نے فرمایا: ہاں اس سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ علی سے ہم کلام ہو چکا ہے، یوم طائف کے موقع پر، تبوک کے مقام پر، اور حنین کے مقام پر‘‘(۲)

قرآن ناطق

الحر العاملی اپنی کتاب میں بیان کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے فرمایا:

’’اللہ کی یہ کتاب ’’خاموش‘‘ ہے، اور میں اللہ کی ’’بولنے والی‘‘ کتاب ہوں‘‘۔(۳)

اسی بنیاد پر شیعہ علماء قرآ ن مجید کو ’’قرآن صامت‘‘ (خاموش قرآن) اور حضرت علیؓ کو ’’قرآن ناطق‘‘ (بولنے والا قرآن) کہتے ہیں۔

---

(۱)اصول کافی جلد:۱/۱۹۶ (۲)بصائر الدرجات للصفار جلد:۲/۴۳۱، بحوالہ ’’الشیعة والسنة‘‘ از: علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ (۳)الفصول المهمة فی أصول الأئمة، باب:۳۳، حدیث ۵۵، وسائل الشیعه الی تحصیل مسائل الشریعه باب تحریم الحکم بغیر الکتاب والسنة۔

نبی سے بڑا مقام

ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں:

''رسول اللہ (ﷺ) نے حضرت علی سے کہا: اے علی! تم کچھ ایسی فضیلتوں کے مالک ہو جن سے میں محروم ہوں، مثلاً فاطمہ تمہاری بیوی ہے جبکہ میں ایسی بیوی سے محروم ہوں، تمہارے دو بیٹے حسن اور حسین ہیں جبکہ میں ایسے مقام و مرتبے والے بیٹوں سے محروم ہوں، خدیجہ تمہاری ساس ہے جبکہ میری ایسی کوئی ساس نہیں، میں تمہارا سسر ہوں اور تمہارے سسر کی طرح میرا کوئی سسر نہیں، جعفر تمہارا بھائی ہے میرا اس طرح کا کوئی بھائی نہیں، فاطمہ ہاشمیہ تمہاری ماں ہیں جبکہ میری ماں کا مقام ان کے مثل نہیں۔'' (۱)

فرشتہ کا نازل ہونا

شیعہ مؤرخ مفید حضرت حذیفہؓ کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ان سے پوچھا:

''ابھی ابھی جو شخص مجھ سے ملا تھا کیا تم نے اسے دیکھا؟ حذیفہ نے کہا ہاں یا رسول اللہ! آپ (ﷺ) نے فرمایا یہ فرشتہ تھا، اس سے پہلے کبھی بھی یہ زمین پر نہیں اترا، اس نے اللہ تعالی سے درخواست کی کہ اے اللہ! میں علی کو سلام کرنا چاہتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے اس کی درخواست کو قبول فرمایا اور سلام کرنے کی اجازت دیدی، چنانچہ وہ صرف علی کو سلام کرنے آیا تھا۔'' (۲)

انبیاء کا مجموعہ

ایک روایت میں ہے:

''رسول اللہ (ﷺ) صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ

(۱) بحار الانوار ج ۳۹ ص ۸۹ طبع ایران (۲) بحار الانوار ج ۲۶ ص ۲۶۷ طبع ایران

حضرت علیؓ سامنے سے آتے دکھائی دیے، تو آپ (ﷺ) نے علیؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: جسے آدم کو اپنی خلقت میں، نوح کو اپنی حکمت میں، اور ابراہیم کو اپنے حلم میں دیکھنا ہو وہ علی ابن ابی طالب کو دیکھ لے۔"(۱)

حضرت علیؓ کی قبر کی زیارت

حضرت جعفر صادق کے حوالہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

"جس شخص نے میرے دادا (علی ابن ابی طالبؓ) کی قبر کی زیارت کی ان کا حق مانتے ہوئے، اللہ تعالیٰ اسے ہر قدم کے بدلہ ایک مقبول حج اور ایک مقبول عمرہ کا ثواب عطا کریں گے۔"(۲)

حضرت علیؓ کی شان میں گستاخیاں

شیعہ حضرات جو حضرت علی کی محبت کا دم بھرتے ہیں اور ان کا مقام ومرتبہ نبی سے بھی اونچا کرتے ہیں حقیقت میں ان کے دلوں میں حضرت علی سے سخت نفرت بھری ہوئی ہے، کبھی تو حضرت علی کو ایسا بہادر اور دلیر ثابت کرتے ہیں کہ عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں، اور کبھی نہ صرف تحقیر وتذلیل کرتے ہیں بلکہ ان کو ایک ڈرپوک وبزدل اور ایک درماندہ وعاجز ثابت کرتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھیں حضرت علی یا دیگر ائمہ کی ذات سے نہ محبت وعقیدت ہے اور نہ کوئی دینی وفکری سروکار، بلکہ ان کا مقصد صرف اور صرف ان اہل بیت کا استعمال کرنا اور ان کے حوالہ سے امت مسلمہ میں انتشار پیدا کرنا ہے۔

کچھ روایتیں انہی کی معتبر کتابوں سے ملاحظہ ہوں:

---

(۱)الأمالي للمفيد، المجلس الثاني:۱٤،طبع ایران

(۲)تهذيب الأحكام، كتاب المزار، باب فضل زيارته۔وسائل الشيعة:۲۹٤/۱۰

شیعوں کا کہنا ہے کہ حضرت فاطمہ کسی بھی صورت حضرت علی سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں، اور انھوں نے اس رشتہ سے انکار کر دیا تھا، اس کی وجہ حضرت فاطمہ نے یوں بیان کی تھی:

''جب رسول اللہ (ﷺ) نے فاطمہ کی شادی علی سے کرنے کا ارادہ کیا تو فاطمہ سے بتایا، اس پر فاطمہ کہنے لگیں: آپ کو اپنی مرضی کا زیادہ حق ہے، لیکن قریش کی عورتوں نے مجھے ان کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ توندوالے ہیں، لمبی لمبی کہنیوں والے ہیں، کنپٹی پر سے گنجے ہیں، بدن پر چربی چڑھی ہوئی ہے، آنکھیں ابھری ہوئی ہیں، اونٹ کی طرح ان کے مونڈھے لٹکے ہوئے ہیں، دانت باہر کو نکلے ہیں، اور دام و درم سے بالکل خالی ہیں۔'' (۱)

حضرت علی و فاطمہ کی شادی کے سلسلہ میں کلینی کی یہ روایت بھی ملاحظہ ہو:

''فاطمہ حضرت علی سے اپنے رشتہ پر ناخوش تھیں، ان کے پاس ان کے ابا جان (ﷺ) تشریف لائے، فاطمہ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، انھوں نے کہا: روتی کیوں ہو؟ بخدا خاندان میں علی سے بہتر کوئی ہوتا تو میں یہ رشتہ نہ کرتا، اور پھر تمہارا یہ رشتہ تو اللہ تعالی کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ دوبارہ ان کے والد ان کے پاس آئے، ساتھ میں ایک قاصد بھی تھا ان کو دیکھ کر فاطمہ کی آنکھوں سے آنسو امنڈ پڑے، بیٹی سے رونے کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگیں: غذا کی قلت، غم کی کثرت، اور بیماری کی شدت۔'' (۲)

ابو اسحاق حضرت فاطمہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

''میرے والد جمعہ کے روز مجھے مسجد لے گئے، مجھے اوپر اٹھایا تو میں نے علی کو منبر پر خطبہ دیتے ہوئے دیکھا، وہ ایک بوڑھے اور گنجے آدمی تھے، پیشانی پھولی ہوئی، اور دونوں کاندھوں کے درمیان کافی چوڑائی تھی، ان

---

(۱) تفسیر القمی: ۳۳۶/۲

(۲) کشف الغمۃ: ۱۴۹-۱۵۰

کی داڑھی نے ان کا سینہ بھر دیا تھا، اور آنکھوں میں آشوب تھا۔'' (۱)

شیعوں کا کہنا ہے کہ حضرت علی کی بزدلی اور خوفزدگی پر آپؓ کی بیوی حضرت فاطمہ آپ کو ملامت کیا کرتی تھیں، چنانچہ مجلسی کی روایت ہے:

جب حضرت فاطمہ نے صدیق وفاروق سے فدک کا مطالبہ کیا اور اس سلسلہ میں ان سے سخت گفتگو کی تو حضرت علی نے اس سلسلہ میں ان کی کوئی مدد نہیں کی، اس پر حضرت فاطمہ نے کہا: اے ابن ابی طالب! تو نے یوں اپنے کو چھپالیا جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ، پیٹ کے بچے کی طرح تو بیٹھا رہا، اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا۔'' (۲)

حضرت علی نے اپنی ایک صاجبزادی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمرؓ سے کرایا تھا اس پر تذکرہ کرتے ہوئے کلینی لکھتے ہیں:

''علی اپنی بیٹی ام کلثوم کی شادی عمر سے نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن آپ سے ڈرتے تھے، اس لیے اپنے چچا عباس کو وکیل بنایا کہ وہ ام کلثوم کی شادی عمر سے کردیں۔'' (۳)

ایک موقع پر اللہ کے رسول (ﷺ) حضرت علی سے سخت ناراض ہوئے تھے، چنانچہ معروف شیعہ عالم شیخ صدوق کہتے ہیں:

''حضرت علی نے ابوجہل کی بیٹی سے شادی کرنے کا اراداہ کیا تو آنحضرت (ﷺ) اور ان کی بیٹی سیدہ فاطمہ سخت ناراض ہوئے، حتی کہ رسول اللہ (ﷺ) نے حضرت علی کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: اے علی! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے، جس نے اسے تکلیف دی اس نے گویا مجھے تکلیف دی، اور جس نے مجھے تکلیف پہنچائی اس نے گویا اللہ کو تکلیف پہنچائی۔ (۴)

---

(۱) مقاتل الطالبین: ۲۷ (۲) حق الیقین: ۲۰۳-۲۰۴ ۔الامالی: ۲۵۹ (۳) حدیقة الشیعة از: المقدس اردبیلی: ۲۷۷ (۴) علل الشرائع: ۱/۸۶، باب العلة التی من أجلها دفنت فاطمة باللیل

ایک روایت میں ہے کہ حضرت فاطمہ نے ایک مرتبہ حضرت علی کا سر ایک لونڈی کی گود میں دیکھا تو وہ سخت غضبناک ہو گئیں، انھوں نے کہا کہ اے ابوالحسن! کیا تم نے اس سے مباشرت کی ہے؟ انھوں نے کہا نہیں بنت محمد! خدا کی قسم میں نے کچھ نہیں کیا، تم کیا چاہتی ہو؟ انھوں نے کہا: کیا تم مجھے اجازت دیتے ہو کہ میں اپنے ابا کے گھر چلی جاؤں؟ حضرت علی نے کہا ہاں اجازت ہے۔ بس انھوں نے برقعہ پہنا، چادر اوڑھی، اور نبی (ﷺ) کے پاس چلی گئیں۔(۱)

شیعہ۔حضرت علیؓ کی نظر میں

شیعہ جو حضرت علی کی محبت اور ان کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں، اور جنھیں وہ نبیوں سے بڑا مقام و مرتبہ دیتے ہیں، حضرت علی اپنے پورے عہد خلافت میں ان سے پریشان اور شاکی رہے، شیعان علی کی سب سے بڑی جماعت اہل عراق کی تھی، انہیں کے اصرار اور دباؤ اور انھیں کی دعووں کو دیکھ کر حضرت علی جنگ کے لیے راضی ہوئے تھے، لیکن جب بھی جنگ کا موقعہ آتا تو یہ قوم پوری طرح ساتھ چھوڑ دیتی بلکہ الٹے حضرت علی کو ہی مطعون کرتی اور اپنی تیز کلامی کا نشانہ بناتی۔

شیعوں کو لعنت و ملامت

ایک موقع پر حضرت علیؓ نے اہل عراق کو مخاطب کر کے کہا:

’’میں اس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ یہ دشمن قوم تم پر غالب آجائے گی، اس لیے نہیں کہ وہ تم سے زیادہ حق پرست ہے، بلکہ صرف اس وجہ سے کہ وہ اپنے باطل پر تیز گام ہے، اور تم میرے حق میں سست گام اور کوتاہ خرام ہو، تو میں اپنے حکام کے

(۱)علل الشرائع:۱/۸۶ وحق الیقین:۳۰۳

ظلم سے ڈرتی ہیں اور میرا حال یہ ہے کہ اپنی رعیت کے ظلم سے ڈرتا ہوں، میں نے جہاد پر تم کو ابھارا مگر تم اپنی جگہ سے ہلے نہیں، تم کو سنانا چاہا مگر تم نے سنا نہیں، تم کو رازدرانہ انداز میں بلایا، علانیہ دعوت دی، مگر تم میں ذرا حرکت نہیں ہوئی، نصیحتیں کیں مگر تم پر جوں تک نہ رینگی۔''

حضرت علی کا اظہار حق

شیعوں نے حضرت علی کو عالم الغیب والشہادۃ کے مرتبہ تک پہنچایا حالانکہ حضرت اپنی ذات میں ذرہ برابر بھی مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے، ایک مرتبہ اپنے علم ومعرفت کی وضاحت خود فرمائی۔

''ابوجحیفہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے دریافت کیا کہ کیا آپ کو قرآن کے علاوہ بھی کوئی بات رسول اللہ (ﷺ) سے براہ راست ملی ہے؟ (یعنی ایسا علم جس سے دوسرے ناواقف ہوں) تو آپ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس نے تخم میں شگاف ڈالا، اور جس نے ذی روح کو پیدا کیا، میرے پاس کچھ نہیں سوائے اس کے کہ اللہ نے مجھے وہ سمجھ دی ہے جو قرآن فہمی کے لیے اللہ کسی کو بخشتا ہے، یا وہ جو میرے صحیفہ میں ہے۔ دریافت کیا کہ آپ کے صحیفہ میں کیا ہے؟ جواب دیا: مسلمان کی دیت، قیدیوں کی رہائی، اور یہ کہ کافر کے عوض مسلمان نہ قتل کیا جائے۔''(۱)

(۱) مسند علی ابن ابی طالبؓ

حضرت حسنؓ کا عہد خلافت

حضرت حسن بن علی بن ابی طالبؓ نبی کریم (ﷺ) کی صاحبزادی حضرت سیدہ فاطمہ الزہراؓ کے فرزند اکبر، رسول اللہ (ﷺ) کے دلبند، خلق خدا میں رسول خدا سے سب سے زیادہ قریب اور مشابہ، جب آپ بچے تھے تو نبی کریم (ﷺ) آپ سے انتہائی محبت فرماتے، آپ کے رخسار ولب چومتے، کبھی گود میں کھلاتے، کبھی سینہ پر اور پیٹھ پر بٹھاتے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حضور (ﷺ) سجدہ میں ہوتے اور آپ پشت مبارک پر سوار ہو جاتے، اور حضو(ﷺ) نہ صرف یہ کہ آپؓ کو بیٹھے رہنے دیتے بلکہ آپ کی خاطر سجدہ کو طویل کر دیتے، کبھی اپنے ساتھ منبر پر چڑھاتے۔(۱)

اللہ کے رسول (ﷺ) نے حضرت حسن سے متعلق ایک پیش گوئی فرمائی تھی:

"ابنی هذا سید ولعل اللّٰہ أن یصلح به فئتین من المسلمین۔"(۲)

(میرا یہ بیٹا سردار ہے، اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرادے)

رسول اللہ (ﷺ) کی یہ پیشین گوئی حضرت حسن کے حرکات وسکنات سے بھی ظاہر تھی، اور اس کا اثر آپؓ کے مزاج وطبیعت میں بھی داخل تھا، چنانچہ حضرت علیؓ جب حضرت معاویہ سے مقابلہ کے لیے نکل رہے تھے تو آپ نے سامنے آکر کہا تھا:

"اے ابا جان! آپ جنگ کا ارادہ ترک کر دیں، کیونکہ اس راہ میں مسلمانوں کا بہت خون بہے گا، اور صف آرائی کا لامتناہی سلسلہ شروع

---

(۱) البدایہ والنہایہ ۸/۳۳ (۲) صحیح البخاری، کتاب الفتنة: ۷۱۰۹

ہو جائے گا۔''(۱)

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان جو جنگ ہوئی تھی، وہ جنگ صفین کے نام سے مشہور ہے، اس جنگ میں ہزاروں مسلمان شہید ہوئے، تاریخ اسلام میں یہ واقعہ نہایت دل خراش واقعہ ہے، اور یقیناً حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کو جنگ کی اس سنگینی اور اس کے اتنے دل اندوہ نتائج کا علم ہوتا تو وہ کبھی بھی جنگ نہ کرتے، حضرت علیؓ نے جب جنگ جمل کے شہداء میں حضرت طلحہ بن عبیداللہ کی نعش دیکھی تو پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے، اور تڑپ کر فرمایا تھا کہ کاش میں بیس سال قبل ہی مر گیا ہوتا۔ لیکن حالات کی پیچیدگی اور سبائیوں کی سازش وشورش کے نتیجہ میں یہ جنگ ہو کر رہی اور تاریخ اسلام کے شفاف چہرہ پر ایک داغ پڑ گیا۔

خلافت اور اس سے دست برداری

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد کوفیوں نے حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی، اور حضرت حسن امت مسلمہ کے پانچویں اور آخری خلیفۂ راشد مقرر ہوئے، حضرت حسن کی صلح پسند طبیعت اب تک کی خانہ جنگیوں سے دل برداشتہ ہو چکی تھی، مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام انھیں کسی بھی صورت گوارہ نہ تھا، اس لیے آپ کسی بھی طرح اس جنگ کو روکنے کے متمنی تھے۔

لیکن خلافت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی کوفیوں نے آپ کے سامنے اہل شام کا مسئلہ پیش کیا، اور آپ کو یہ کہہ کر جنگ پر آمادہ کیا کہ انھوں نے ابھی تک آپ کی خلافت تسلیم نہیں کی ہے، اس سے قبل حضرت علی کی خلافت بھی انھوں نے قبول نہیں کی تھی، حضرت علی ان سے جنگ کرنا چاہتے تھے کہ اسی اثنا میں ان کی شہادت ہو گئی، اب یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ اہل شام کو سر جھکانے اور خلافت کو تسلیم کرنے پر آمادہ کریں، چنانچہ اہل عراق حضرت حسن کی منشاء کے بغیر اتنی بڑی تعداد میں جمع

(۱) البدایہ والنہایہ: ۷/ ۲۲۹

ہوئے جتنے پہلے کبھی جمع نہیں ہوئے تھے۔

لیکن حضرت حسنؓ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ حضرت معاویہ سے جنگ جاری رکھنے کا نتیجہ صرف مسلمانوں کی خوں ریزی ہے، جس کی وجہ سے اسلامی معاشرہ اندرونی خلفشار اور بیرونی خطرات سے دوچار رہے گا، اور ہر وقت اس بات کا امکان رہے گا کہ معاشرہ میں بغاوت پھر بدعہدی، اور پھر خلفشار کی صورت پیدا ہوجائے۔

اس کے علاوہ حضرت حسنؓ اہل عراق کی نفسیات اور ان کے متلون مزاج سے بھی واقف تھے، انھوں نے حضرت علیؓ کی حمایت کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن ایک سے زائد بار یہ فوج ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھی، اور مستقل مزاجی اور پامردی سے جنگ کرنے کے بجائے فرار وفریب کا راستہ اختیار کر چکی تھی، حضرت علیؓ ان کی خودرائی ونفس پرستی اور مسلسل نافرمانی سے اپنے پورے عہد خلافت میں پریشان رہے۔ یہ سارے حالات حضرت حسنؓ کی نگاہوں کے سامنے تھے، تاہم اہل عراق کے مسلسل اصرار اور ان کے دباؤ میں آپؓ نے جنگ کی حامی بھرلی۔ اور قیس بن سعدؓ کو بارہ ہزار فوجیوں کے ساتھ آگے بھیجا اور خود فوجیوں کے ساتھ حضرت معاویہؓ کے مقابلہ کے لیے نکل پڑے، جب مدائن سے آگے نکلے تو وہاں آکر رک گئے، اور مقدمۃ الجیش کو اپنے سامنے ٹھہرایا، مدائن کے بیرونی حصہ پر جب وہ لشکر کے ساتھ تھے کسی نے پکار کر کہا کہ قیس بن سعد بن عبادہ قتل کردیے گئے، یہ سننا تھا کہ فوج میں بھگدڑ مچ گئی، اور لوٹ مار شروع ہوگئی، یہاں تک کہ انھوں نے حضرت حسنؓ کا خیمہ تک لوٹ لیا اور اسے اکھاڑ ڈالا، لوگ ایک دوسرے پر حملے کرنے لگے، خود حضرت حسنؓ کو بھی کئی گہرے زخم لگے، زخمی حالت میں آپ وہاں سے نکلے، کسی گھوڑے پر سوار ہوکر مدائن کے قصر میں چلے گئے۔

”انہی حالات کی سنگینی میں بدبخت مختار بن ابی عبید نے اپنے چچا سعد بن مسعود سے کہا (جو کہ مدائن کا گورنر تھا) کیا میں تم کو مال ودولت کے حصول

کا طریقہ بتاؤں؟ اس نے کہا کیا مطلب؟ کہا کہ حسن کو پکڑ و اور قید کر کے معاویہ کے پاس بھیج دو، اس کی اس بات سے سعد بن مسعود سخت ناراض ہوا اور کہا کہ خدا تجھے رسوا کرے، اور تیری تدبیر کو غارت کرے، کیا میں نواسۂ رسول (ﷺ) سے دھوکہ بازی کروں؟ (١)

حضرت معاویہؓ سے صلح

حضرت حسنؓ اپنی فوج کی اس کیفیت سے نہایت دلبرداشتہ ہوئے، اور انھیں اہل کوفہ کے مزاج اور ان کے مقاصد کو سمجھنے میں کوئی شبہ نہیں رہا، چنانچہ انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ حضرت معاویہؓ سے صلح کر لی جائے، اور حضرت معاویہ کو ایک خط لکھا جس میں صلح کی تجویز رکھی، اور چند شرطیں رکھیں کہ اگر وہ اس کو منظور کر لیں تو وہ امارت سے دستبردار ہو جائیں گے اور اس طرح مسلمان مزید خون خرابہ سے بچ جائیں گے، اور ایک لمبے عرصہ سے چلنے والی خوں ریزی کا سلسلہ تھم جائے گا۔

حضرت حسنؓ نے فرمایا:

”يا معاوية إني اخترت ما عند الله فإن يكن هذا الأمر لك فلا ينبغي لي أن أنازعك فيه وإن يكن لي فقد تركته لك.“ (٢)

(اے معاویہ! میں نے اس کو اختیار کیا جو اللہ کے پاس ہے، اگر خلافت آپ کا حق ہے تو اس کے لیے آپ سے نزاع کرنا مناسب نہیں اور اگر میرا حق ہے تو میں آپ کی خاطر اپنے حق سے بھی دستبردار ہوں)۔

امام زہری فرماتے ہیں کہ حضرت معاویہ نے یہ تجویز منظور کر لی، اور ایک سادہ کاغذ پر مہر لگا کر بھیج دیا اور کہا کہ آپ جو شرطیں لکھنا چاہیں لکھ دیں۔ (٣)

---

(١) تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: البدایہ والنہایہ: ١٤/٨

(٢) فتح الباری: ١٣/ ٧٩، مطبوعہ دار السلام ریاض

(٣) مصنف عبد الرزاق: ٤٦٢/٥

شیعوں کا ردعمل

صلح کی خبر سنتے ہی مسلمانوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی، سب نے اللہ کا شکر ادا کیا، اور اس طرح مکمل امارت حضرت معاویہ کے پاس آگئی، اور وہ اکیلے امیر المؤمنین بن گئے، اور اس سال کا نام ''عام الجماعۃ'' یعنی اتحاد کا سال پڑ گیا۔

سالوں سے جاری اس آپسی خونریزی کے اختتام پر جہاں مسلمانوں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور خوشی ومسرت کا اظہار کیا وہیں شیعوں نے اسے اپنے لیے ناکامی سے تعبیر کیا، اور صلح پر سخت تنقیدیں شروع کردیں حتی کہ حضرت حسن کے منھ پر توہین آمیز فقرے کسنے لگے، اور راہ چلتے "یا عار المؤمنین" سے مخاطب کرتے، اس پر حضرت حسن فقط اتنا ہی کہتے: ''العار خير من النار'' یعنی عار نار سے بہتر ہے۔

ایک شخص جس کو ابو عامر کہا جاتا تھا وہ حضرت حسن کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

"السلام عليك يا مذل المؤمنين "(السلام علیکم اے مسلمانوں کو ذلیل کرنے والے!)(۱)

شیعہ عالم کشی نے ابو جعفر کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

''حسن علیہ السلام کا ایک ساتھی جسے سفیان بن ابی لیلیٰ کہا جاتا تھا، اپنی سواری پر بیٹھا، حسن کے پاس آیا، حسن اپنے گھر کے صحن میں چھپے بیٹھے تھے، اس نے آپ سے کہا: اے مؤمنین کو ذلیل کرنے والے! السلام علیک۔ آپ نے کہا تجھے کیا معلوم ہے؟ اس نے کہا کہ تو نے امت کے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہا اور پھر اپنی گردن سے یہ جوا اتار پھینکا، اور اس نافرمان امت کے گلے میں ڈالدیا جو خدا کی نازل کردہ تعلیمات کے برعکس حکومت چلا رہی ہے۔''(۲)

حضرت حسن پر ملامت کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا، لیکن آج تک بہت

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۸/ ۱۸۔ جلاء العیون: ۳۲۴ (۲) رجال الکشی: ۱۰۳

سے دلوں میں اور دماغوں میں یہ کھٹک ہے، اور حضرت حسن کے اس اقدام کو بالکل غلط ٹھہراتے ہیں، جبکہ حضرت حسن کا اقدام آنحضرت (ﷺ) کی پیشین گوئی کے عین مطابق تھا، اور اسکے دوررس اثرات میں بنیادی بات یہ ہے کہ بہت سے مسلمانوں کا خون ناحق بہنے سے رک گیا، اور مملکت اسلامی کو استحکام نصیب ہوا۔

حضرت حسنؓ کی شیعوں سے بیزاری

شیعوں کی نازیبا حرکتوں اور ان کی خودرائی وطوطا چشمی پر حضرت حسن نہایت نالاں اور کبیدہ خاطر تھے، وہ کسی بھی طرح ان سے مطمئن نہیں تھے، بلکہ بارہا ان کو ملامتیں کیں، اور ان کی بدخوئی پر متنبہ کیا۔ ایک موقع پر فرمایا:

> ''خدا کی قسم میں معاویہ کو بہتر سمجھتا ہوں ان جیسے ہزاروں سے جن کا دعویٰ ہے کہ وہ میرے شیعہ ہیں، انھوں نے مجھے قتل کرنا چاہا، میرا مال چھین لیا، خدا کی قسم! وہ لوگ مجھے مار ڈالیں اور میرے گھر والے خانماں برباد ہوجائیں اس سے بہتر ہے کہ میں اپنی جان اور اپنے گھر والوں کی حفاظت کے لیے معاویہ کی امان میں چلا جاؤں، رب ذوالجلال کی قسم! میں اگر معاویہ سے جنگ کروں تو یہی لوگ میری گردن پکڑ کر مجھے ان کے حوالہ کردیں گے، بخدا! وہ مجھے قیدی بنا کر قتل کریں اس سے بہتر ہے کہ میں ان سے عزت کے ساتھ صلح کرلوں۔'' (۱)

اہل کوفہ کو پھٹکار

> ''میں نے کوفہ والوں کو آزمایا، وہ سب کے سب بے وفا، بدعہد اور منافق لوگ ہیں، زبان سے تو کہتے ہیں کہ وہ ہمارے شیعہ ہیں جبکہ ان کی تلواریں ہمارے خلاف تنی ہوتی ہیں۔ (۲)

---

(۱) الاحتجاج: ۲/۱۰ (۲) الاحتجاج: ۲/۱۰

شہادت

روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت حسنؓ کو زہر دیا گیا جو آپ کی شہادت کا باعث بنا، شیعوں کی تاریخی کتابیں کہتی ہیں کہ سیدنا حسنؓ کو حضرت معاویہؓ کے اشارہ پر زہر دیا گیا، انھوں نے اس کا اتنا ڈھنڈورا پیٹا کہ ہمارے بعض مؤرخین نے بھی اسے تسلیم کرلیا، حالانکہ قرائن تو یہی کہتے ہیں کہ یہ گھنونی حرکت خود شیعوں نے ہی انجام دی ہوگی لیکن اس سلسلہ میں قول فیصل خود حضرت حسنؓ کا یہ قول ہے جو انھوں نے حضرت حسینؓ سے کہا تھا:

> ''اگر مجھے زہر دینے والا وہی شخص ہے جس کو میں سمجھ رہا ہوں تو اللہ زیادہ سخت انتقام لینے والا ہے، اور اگر وہ نہیں ہے تو میں نہیں چاہتا کہ تم کسی بے قصور کو شبہ میں قتل کرو۔'' (۱)

اس کے علاوہ حالات کا تجزیہ بتاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کو حضرت حسنؓ سے پوری ہمدردی تھی، کچھ اختلاف حکومت کو لے کر تھا تو حضرت حسنؓ نے اپنی مرضی سے خلافت ان کے سپرد کردی تھی، اب آپسی رنجش کی کوئی معمولی وجہ بھی نہ تھی، جبکہ دوسری طرف حضرت علیؓ کی محبت اور ان کی ہمنوائی کا دم بھرنے والے شیعوں نے نہ صرف حضرت حسنؓ کی صلح کے فیصلہ کو ایک بزدلانہ اور احمقانہ اقدام سمجھا، بلکہ ان کے منھ پر جملے کسے، ان کو طعنے دیے، ان پر نہ صرف لعنت وملامت کرتے رہے بلکہ ان سے اپنا مذہبی رشتہ ہی کاٹ لیا، چنانچہ ان کے مذہب کی بنیاد جس عقیدۂ امامت پر ہے اس سے حضرت حسنؓ کی اولاد کا سلسلہ ہی ختم کردیا گیا، ان کے بارہ اماموں میں سے کوئی بھی امام ایسا نہیں ہے جو حضرت حسن کی اولاد میں ہو۔ انھوں نے یہ مفروضہ قائم کرلیا کہ حضرت حسن کی کوئی اولاد نرینہ ہی نہ تھی۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۴۲/۸

شہادت حسینؓ-اسباب ونتائج

حضرت حسن اور حضرت معاویہ کی صلح کے بعد امیر معاویہ مسلمانوں کے سربراہ بن گئے، اور تقریباً بیس سال تک خلیفۃ المسلمین کے منصب پر فائز رہے، آپ کا دور خلافت چالیس ہجری (۴۰ھ) سے لے کر ساٹھ ہجری (۶۰ھ) تک رہا، اس پورے دور میں امن وامان کی حالت تشفی بخش رہی، اور فتوحات اسلامیہ کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا، کہا جاسکتا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد اسلامی تاریخ کا یہ سنہرا دور تھا۔

یزید کی ولی عہدی

حضرت معاویہؓ نے اپنے بعد حضرت حسنؓ کو ولی عہد متعین کیا تھا، کہا جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت حسنؓ کے درمیان جن شرطوں پر صلح ہوئی تھی ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ حضرت معاویہؓ کے بعد حضرت حسنؓ ہی خلیفۃ المسلمین ہوں گے، لیکن اس دور میں حضرت حسنؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آ گیا۔

حضرت امیر معاویہؓ نے منصب خلافت سنبھالا تو یہیں سے معاملہ خلافت سے ملوکیت میں تبدیل ہوگیا، اور اسلامی تاریخ میں ملوکیت کا سلسلہ شروع ہوگیا، ان کے عہد میں نبوی منہاج پر خلافت نہیں تھی، لیکن امت مسلمہ طویل خانہ جنگیوں اور آپسی کشت وخوں کے بعد ایک پرچم تلے جمع ہوچکی تھی، تقریباً پانچ سال کا عرصہ خانہ جنگی کی نذر ہوچکا تھا، کبار صحابہ اس دنیا سے رخصت ہوچکے تھے، صغار صحابہ میں بھی کچھ ہی حضرات موجود تھے، جن میں نمایاں ہستیاں عبداللہ ابن زبیر، عبداللہ ابن عمر، عبداللہ ابن

عباس اور عبدالرحمٰن ابن ابی بکر (رضی اللہ عنہم) کی تھی۔

عہد نبوی کو گذرے پچاس سال کا عرصہ بیت چکا تھا، اتنی مدت کے بعد وہ جوش وجذبۂ ایمانی بھی اس درجہ کا نہیں رہا جو خلافت راشدہ کے ابتدائی پچیس سالوں تک تھا، خانہ جنگیوں کی وجہ سے لوگوں کے ذہن بدل چکے تھے، مملکت کی وسعت کے ساتھ ہی عجمی عناصر مزاج میں داخل ہو چکے تھے، اور مجموعی اعتبار سے امت مسلمہ کے حالات شورائی نظام کے متحمل نہیں تھے، بلکہ مسلم مزاج میں فتوحات کے پہلو بہ پہلو دنیا کی محبت بھی دبے پاؤں چلی آرہی تھی، چنانچہ عظیم صحابی رسول حضرت مغیرہ بن ابی شعبہؓ نے حضرت معاویہ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنا جانشیں نامزد کردیں، اور اس کی ولی عہدی کی بیعت بھی لے لیں، تاکہ آپ کے بعد مسلمان دوبارہ خلیفہ کے انتخاب میں خانہ جنگی کا شکار نہ ہوں، اور اس کے لیے انھوں نے یزید کا نام بھی پیش کردیا۔ کیونکہ اہل شام اور بنوامیہ کا مزاج اور ان کی طبیعت کسی غیر کو قبول کرنے کو تیار نہ تھی بلکہ ایسی صورت میں خانہ جنگی کے قوی امکانات پیدا ہوجاتے۔

امیر معاویہؓ کے اس موقف کو علامہ ابن خلدون نے اس طرح بیان کیا ہے:

> ''جس بات نے امیر معاویہ کو کسی دوسرے کے بجائے اپنے بیٹے کو ولی عہد بنانے پر آمادہ کیا وہ صرف اس مصلحت کی رعایت تھی کہ اس وقت بنو امیہ کے اہل حل وعقد کے نزدیک یزید پر اتفاق کرنے سے مخالفین کا اتفاق واجتماع حاصل ہوجائے گا، اس وقت بنوامیہ اپنے اصحاب اقتدار کے علاوہ کسی اور کو قبول کرنے پر راضی نہ تھے، اور بنوامیہ ہی قریش اور پوری ملت کے سرگروہ تھے، انھیں ہی تسلط واقتدار حاصل تھا، اسی وجہ سے معاویہ نے دوسروں پر یزید کو ترجیح دی، جس کے متعلق یہ گمان تھا کہ وہ ولایت وخلافت کے لیے زیادہ موزوں اور بہتر ہے، اور انھوں نے افضل وبہتر سے ہٹ کر مفضول وغیر مناسب کو ولی عہد بنادیا، وہ بھی اس خیال

سے کہ اتحاد باقی رہے،اور لوگوں کے افکار منتشر نہ ہوں، کیونکہ اتحاد واتفاق شارع کے نزدیک بہت اہم چیز ہے۔"(۱)

حضرت حسنؓ کی زندگی میں حضرت معاویہؓ نے حضرت مغیرہؓ کی یہ رائے ماننے سے انکار کردیا، کیونکہ وہ حضرت حسن سے ولیعہدی کا وعدہ کر چکے تھے، لیکن حضرت حسن کی شہادت کے بعد حضرت معاویہ کو اس مشورہ پر انشراح ہوگیا۔ حضرت معاویہ کا یہ ایک اجتہادی فیصلہ تھا نیز پدرانہ شفقت ومحبت کی بنا پر ایسا فیصلہ غیر طبعی اور غیر فطری بھی نہ تھا، اس کے علاوہ حضرت معاویہ کے سامنے یزید کی وہ اخلاقی اور معاشرتی خرابیاں اتنی عیاں نہ تھیں جن سے دوسرے افراد واقف تھے، بلکہ چاپلوس اور مفاد پرست ان کے سامنے دوسرا ہی رخ پیش کرتے، بہرحال ۴۹ھ میں انھوں نے یزید کے عمومی بیعت کی دعوت دی، لیکن اس دعوت کو عام طور پر مسلمانوں نے ناپسند کردیا، اور سخت اختلاف کا اظہار کیا، کیونکہ یہ اسلامی مزاج کے عین مخالف فیصلہ تھا نیز لوگوں کو یزید کے مشاغل اور اس کی سیر وتفریح کا بخوبی علم تھا، حالات کی مخالفت کو خود یزید نے بھی سنجیدگی سے لیا، اور اس وقت بیعت کا یہ معاملہ رک گیا۔(۲)

یزید کی ولی عہدی کی خبر جب اہل کوفہ کو پہنچی تو چالیس خوشامد پسند کوفی وفد کی شکل میں حضرت معاویہ کے پاس پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ آپ کے بیٹے جیسا کوئی قابل اور ماہر سیاست نظر نہیں آتا، ہم سب یزید کی ولی عہدی کے لیے بیعت کرنے کو تیار ہیں، اور پھر شام وعراق میں یزید کی بیعت کا خوب پروپیگنڈہ کیا گیا، اور یہ شہرت کردی گئی کہ شام وعراق اور کوفہ وبصرہ سب یزید کی بیعت پر متفق ہیں۔

۵۶ھ کا آغاز ہوا تو حضرت معاویہؓ نے یزید کے لیے بیعت لینے کا سلسلہ شروع کردیا، اور تمام علاقوں میں اس کی اطلاع بھیج دی اور پھر مسلمانوں کی اکثریت نے یہ بیعت قبول کرلی، جن میں متعدد صحابہ کرام بھی شامل تھے۔

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون: ۱۷۵-۱۷۶ (۲) تفصیلات دیکھیں: البدایہ والنہایہ: ۱۸۰/۸

حضرت حسینؓ کا موقف

دوسری جانب ایک جماعت ایسی بھی تھی جس نے یہ محسوس کیا کہ یہ عمل اسلام کے مزاج کے بالکل خلاف ہے، اگر ابھی اس روک نہ لگائی گئی تو آگے چل کر مسلمانوں میں ولی عہدی کی یہ رسم چل پڑے گی اور اس کے ذریعہ قیصر وکسری کی روایتیں زندہ ہو جائیں گی، اس کے علاوہ یزید کی اخلاقی برائیاں اور اس کا فسق وفجور بھی کھل کر سامنے آچکا تھا اور اس کی جو برائیاں علانیہ نہیں تھیں وہ امیر معاویہ کے انتقال اور اس کے حاکم بننے کے بعد طشت از بام ہوگئیں، اس لیے اسی وقت اس کی مخالفت ضروری تھی۔(۱)

مخالفت کرنے والوں میں نمایاں نام عبداللہ ابن زبیر، عبداللہ ابن عمر، عبداللہ ابن عباس، عبدالرحمٰن ابن ابی بکر اور سبط رسول حضرت حسین بن علی (رضی اللہ عنہم) کا تھا، جن کی عظمت ومرتبت مسلم وقابل تقلید تھی۔

حکومت یزید کے کارندوں نے حضرت حسین کے انکار بیعت کو وہ اہمیت دی جو باقی اصحاب کو نہیں دی، وہ جانتے تھے کہ حضرت حسین کی لوگوں کے دلوں میں بڑی اہمیت وعظمت ہے، آپ نواسہ رسول اور جلیل القدر ہستی حضرت علی کی اولاد ہیں، اس لیے حکومت کے ارکان کی پوری توجہ اس بات پر تھی کہ آپ بیعت کرلیں، لیکن ان کے اصرار اور کوششوں کے باوجود حضرت حسین نے جھکنا یا نرم پڑنا قبول نہ کیا، اور اپنے موقف پر پوری بصیرت اور عزم وارادہ کے ساتھ قائم رہے۔ البتہ جب حکومت کا دباؤ بڑھنے لگا تو آپ مدینہ چھوڑ کر مکہ مکرمہ میں پناہ گزیں ہوگئے۔

اہل کوفہ کے دعوت نامے

اہل عراق اور اہل شام کے درمیان حضرت علی کے دور سے اختلافات قائم تھے،

(۱) ملاحظہ ہو:- مقدمہ ابن خلدون: ۱۸

اہل عراق حضرت علی کے ہمنوا تھے اور کوفہ ان کا دارالخلافہ تھا، اہل شام حضرت معاویہ کے حامی تھے اور دمشق ان کا پایہ تخت تھا، گرچہ حضرت حسنؓ نے آپسی اختلافات کو ختم کر کے صلح اختیار کر لی تھی، لیکن اہل عراق اور اہل شام اپنے دلوں میں آپسی نفرت کی چنگاری دبائے ہوئے تھے، جو گاہے گاہے اپنا اثر ظاہر کرتی، چنانچہ جب اہل کوفہ کو خبر پہنچی کہ حضرت حسین نے یزید بن معاویہ کی بیعت سے انکار کر دیا ہے، تو انھوں نے حضرت حسین کو خطوط روانہ کیے جن میں اس بات کی وضاحت تھی کہ وہ خود بھی یزید کو ناپسند کرتے ہیں، بلکہ وہ تو حضرت معاویہ کے بھی خلاف ہیں، اور ہمیشہ وہ حضرت علی کے حامی رہے ہیں، اور آج بھی وہ حضرت علی کی اولاد کو ہی خلیفہ بنانا چاہتے ہیں، انھوں نے صراحت کی کہ ان کے گردنوں میں یزید کی بیعت نہیں ہے بلکہ وہ حضرت حسین کی ہی بیعت کرنا چاہتے ہیں اور انھی کو اپنا خلیفہ تسلیم کرتے ہیں، اور بڑی تاکید سے حضرت حسین کو کوفہ آنے کی دعوت دی تاکہ وہاں سے اسلامی نہج پر خلافت کے قیام کو ممکن بنایا جا سکے۔

اہل کوفہ نے جو خطوط لکھے ان کے نمونے شیعوں کی ہی کتاب سے ملاحظہ ہوں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حسین بن علی کے نام، جو اپنے اور اپنے والد امیر المؤمنین کے شیعوں کی طرف سے امیر المؤمنین ہیں، سلام اللہ علیک، اما بعد!

لوگ آپ کے منتظر ہیں، آپ کے سوا ان کی کوئی رائے نہیں، اے رسول اللہ کے بیٹے جلدی کیجیے جلدی۔ والسلام(۱)

ایک دوسرا خط ملاحظہ ہو:

''اما بعد! باغات سرسبز ہو چکے ہیں، پھل تیار ہو چکے ہیں، بس آپ مضبوط لشکر کی طرف آ جائیے۔ والسلام''(۲)

---

(۱) کشف الغمۃ: ۲/۳۲۔الارشاد للمفید: ۲۰۳

(۲) الارشاد للمفید: ۲۰۵، اعلام الوریٰ للطبرسی:۲۲۳

حضرت حسین کو رمضان المبارک کی ۲۰/ تاریخ کو پہلا خط ملا، لیکن آپ نے اس کو کھولا تک نہیں، اور اسے کوئی اہمیت نہیں دی:

"ثم لم يمس الحسين يومه ذلك" (۱)

حضرت حسین کی خدمت میں اہل کوفہ کے جو خطوط پہنچے ان کی تعداد کم وبیش پانچ سو کی تھی، ان خطوط کے علاوہ کئی وفود بھی حضرت حسین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھوں نے قسمیں کھا کھا کر اپنی وفاداری کا یقین دلایا، ان خطوط اور وفود سے حضرت حسین ضرور متاثر ہوئے، لیکن ان کوفیوں کے سابقہ "کارناموں" کے پیش نظر حالات کی تحقیق ضروری تھی، چنانچہ اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے کوفہ راونہ کیا۔

مسلم بن عقیل کوفہ میں

حضرت حسین کے مشورہ پر مسلم بن عقیل کوفہ پہنچے، کوفیوں نے آپ کا بہت ہی پر تپاک خیر مقدم کیا، آپ وہاں ہانی بن عروہ کے گھر پر ٹھہرے، لوگ آتے اور حضرت حسین کے لیے بیعت کرتے، یہ سلسلہ چلتا رہا اور چند ہی دنوں میں اٹھارہ ہزار کوفیوں نے بیعت کر لی، انھوں نے طلاق وعتاق کی قسمیں بھی کھائیں (یعنی اگر وہ اپنی بات سے پھرے تو ان کی بیوی کو طلاق اور ان کا غلام آزاد) یہ سلسلہ چلتا رہا اور تقریباً چالیس ہزار تک پہنچ گیا، حضرت مسلم کو یقین ہو گیا کہ اہل کوفہ پوری طرح حضرت حسین کے ساتھ ہیں، بس انھوں نے حضرت حسین کو پیغام بھیجا کہ آپ تشریف لائیں، یہاں حالات اطمینان بخش ہیں، شیعہ مؤرخ کے بقول حضرت مسلم نے لکھا:

"آپ کے ساتھ ایک لاکھ تلواریں ہیں، تاخیر نہ کیجیے"۔ (۲)

یہ پیغام ملتے ہی حضرت حسینؓ نے کوفہ روانگی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

کوفہ میں اس وقت حضرت نعمان بن بشیر گورنر تھے، انہیں جب علم ہوا کہ حضرت

(۱) الاخبار الطّوال از علامہ دینوری: ۲۳۱ (۲) الارشاد للمفید: ۲۲۰

مسلم بن عقیل یزید کے خلاف بیعت لے رہے ہیں تو انھوں نے اس معاملہ کو کوئی اہمیت نہ دی اور پوری چشم پوشی کا اظہار کیا، کوفہ ہی کے کچھ یزیدی حاشیہ برداروں نے یزید تک یہ خبر پہنچا دی، یزید نے فوراً کارروائی کی اور حضرت نعمان بن بشیر کو معزول کر کے عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ کا گورنر متعین کر دیا۔

ابن زیاد نے کوفہ پہنچتے ہی چاروں طرف اپنے جاسوس روانہ کر دیے، جب اسے معلوم ہوا کہ حضرت عقیل نے ہانی بن عروہ کے گھر کو اپنا مرکز بنا رکھا ہے تو اس نے ہانی بن عروہ کو گرفتار کر لیا، مسلم بن عقیل کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے چار ہزار کوفیوں کا لشکر تیار کیا اور ابن زیاد کے محل کا محاصرہ کر لیا، کوفہ کے سردار ابن زیاد کے حامی تھے، انھوں نے فوجیوں کو مال ودولت کی رشوتیں دیں، انھیں ڈرایا دھمکایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عورتیں آتیں اور اپنے بیٹوں کو لے جاتیں، مرد آتے اور اپنے بھائیوں اور دوستوں کو لے جاتے، اور قبائل کے سربراہ اور شورش میں حصہ لینے سے اپنے لوگوں کو روکتے، آخرش پوری فوج تتر بتر ہوگئی، اور ابن عقیل کے ساتھ تین سو آدمی رہ گئے، پھر اور گئے اور صرف تیس رہ گئے، مغرب کی نماز تک صرف دس بچے اور پھر وہ سب بھی چلے گئے اور حضرت مسلم تنہا رہ گئے، پورے کوفہ میں ایک شخص بھی ان کا ساتھ دینے والا نہ بچا۔

مسلم بن عقیل کوفہ میں بے یار و مددگار ہو گئے، کوئی راستہ تک بتانے والا نہ تھا، وہ کوفہ کی گلیوں میں سراسیمہ پھر رہے تھے کہ ایک گھر کے باہر ایک عورت کھڑی نظر آئی، مسلم بن عقیل نے اس سے پناہ مانگی، عورت حالات سے آگاہ نہ تھی، مسلم بن عقیل کی پریشان حالی پر اسے رحم آ گیا، اپنے گھر میں پناہ دی، کھانے کو روٹی دی، اسی دوران اس کا لڑکا گھر پہنچا، اسے حالات کا بخوبی علم تھا، جب معلوم ہوا کہ یہی ابن عقیل ہیں تو اس نے مخبری کر دی، اور یکا یک ابن زیاد کی فوج کے ستر سپاہیوں نے پورے گھر کا محاصرہ کر لیا، مسلم کو اس کا علم ہوا تو تلوار سونت کر ان کے مقابلہ کو نکلے، ستر آدمیوں کا تنہا مقابلہ آسان نہ تھا، زخموں سے چور ہو کر واپس گھر میں داخل ہوئے، فوجیوں نے گھر

کی چھت پر چڑھ کر پتھر برسانے شروع کیے اور پھر گھر میں آگ لگادی، ان کا دم گھٹنے لگا، آخراس گھر کے مالک عبدالرحمٰن نے آپ کو پناہ دی، آپ نے خود کو اس کے سپرد کیا مگر اس نے آپ کو دشمنوں کے حوالہ کرنا چاہا، آپ پھر بھی مقابلہ کی کوشش کرتے رہے، محمد ابن اشعث نے پکار کر کہا کہ میں تمھیں امن دیتا ہوں، اپنی جان ہلاک نہ کرو، یہ نہ تمھیں قتل کریں گے اور نہ تمھیں کوئی تکلیف پہنچائیں گے۔ چنانچہ ابن عقیل کو گرفتار کرلیا گیا، تلوار چھین لی گئی، اور ایک خچر پر بٹھا کر ابن زیاد کے سامنے پیش کیا، اس وقت مسلم بن عقیل کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اور انھیں یقین تھا کہ اب وہ شہید کردیے جائیں گے۔انھوں نے ابن اشعث سے کہا: میں اپنی جان کے لیے نہیں روتا ہوں، بلکہ میں حسین اور آل حسین کے لیے رو رہا ہوں جو عنقریب میری تحریر پر یہاں کوفہ آنے والے ہیں، اور میں جانتا ہوں کہ ان کے ساتھ یہاں کیسا برتاؤ کیا جائے گا، تم نے مجھے امان دی تھی، اور میں جانتا ہوں کہ تمہارے اس امان کو قائم رکھنا تمھارے بس میں بھی نہیں ہے، اور یہ لوگ مجھے ضرور قتل کردیں گے، تو اب کم از کم میری ایک بات مان لو، کسی کو حسین کے پاس بھیج کر میری حالت کی اطلاع دیدو، اور کہہ دو کہ واپس لوٹ جائیں، اہل کوفہ کے خطوط سے دھوکہ نہ کھائیں، یہ وہی لوگ ہیں جن سے تمہارے والد بھی پریشان تھے۔

مسلم بن عقیل کو ابن زیاد کے محل میں پیش کیا گیا، ابن زیاد نے انھیں قتل کرنے کا حکم دیا، انھیں محل کی چوٹی پر چڑھایا گیا، وہ تکبیر وتہلیل اور تسبیح واستغفار پڑھتے رہے، اتنے میں ایک شخص جس کا نام بکیر بن عمران تھا اس نے ان کی گردن ماردی، اور ان کا سر قصر سے نیچے پھینک دیا، اور پھر جسم بھی نیچے گرادیا۔(۱)

حضرت مسلم ابن عقیل ۹/ ذی الحجہ کو شہید کردیے گئے، اور ادھر ۸/ ذی الحجہ کو حضرت حسین مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۷/ ۱۵۶

نوٹ

یہ اہل کوفہ وہی لوگ ہیں جن کے ذہنوں میں ابن سبا کے بوئے ہوئے بیج پروان چڑھ رہے تھے، جو اسی کے ساختہ پرداختہ تھے، خود کو شیعان علی کہنے والے انہیں کوفیوں نے حضرت علیؓ کے خلاف بغاوت کی، ان سے جنگ کی، انھیں شہید کیا، حضرت حسن کا خیمہ لوٹا، ان کو ذلیل کیا، اور اب حضرت حسن کے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بلا کر ان کے ساتھ غداری کی، انھیں دھوکہ دیا، اور چارو ناچار انھیں موت تک پہنچادیا۔ (اللہ کی لعنتیں ہوں ان پر بے شمار)۔

حضرت حسینؓ کی روانگی کا عزم

کوفہ کوئی معمولی شہر نہیں تھا، یہ انتہائی حساس جگہ پر واقع تھا، اسلامی مملکت کی سب سے بڑی چھاؤنی تھی، جو حضرت عمر کے دور خلافت میں قائم کی گئی تھی، یہیں سے ایران وشام کی طرف جانے والی شاہراہ کو بھی کنٹرول کیا جاتا تھا، اس لیے حضرت حسین یہ رائے رکھتے تھے کہ اگر کوفہ کی عظیم اکثریت ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے جیسا کہ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے تو اس کے ذریعہ اسلامی نظام کو درست کیا جاسکتا ہے اور اس میں جو تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اس کا ازالہ کیا جاسکتا ہے، اور دین محمدی کو ان بدعات سے روکنے کے لیے یہ فیصلہ ضروری تھا، اس کے علاوہ ان کے معتمد خاص حضرت مسلم بن عقیل کی طرف سے اطمینان بخش رپورٹیں پہنچ چکی تھیں، چالیس ہزار کوفیوں نے بیعت بھی کرلی تھی، اس لیے ظاہری طور پر کوفہ نہ جانے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔

چنانچہ حضرت مسلم کی طرف سے جواب ملنے کے بعد حضرت حسین نے بلا تأمل روانگی کا پختہ ارادہ کرلیا، اور اپنے اہل وعیال کے ہمراہ کوفہ کے لیے روانہ ہوئے۔ متعدد صحابہ نے حضرت حسین کو روکنا بھی چاہا، کیونکہ کسی کو بھی اہل کوفہ کے وعدوں اور

ان کی بیعتوں پر اعتبار نہ تھا، جن صحابہ نے آپ کو روکنے کی کوشش کی ان کے نام یہ ہیں:
عبداللہ ابن عمر، عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن عمرو بن العاص، ابوسعید خدری، عبداللہ ابن زبیر، اور آپ کے برادر محمد بن علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہم)

لیکن حضرت حسینؓ سفر کا پختہ عزم کر چکے تھے، اور انھیں یقین تھا اہل کوفہ ان کے ساتھ پوری وفاداری برتیں گے، اور پھر حضرت مسلم بن عقیل نے بھی آنے کی دعوت دیدی تھی۔ اس کے علاوہ آپ کے سامنے جو بلند اور عظیم مقاصد تھے اس کے لیے خطرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے، راستہ میں اموی دور کے مشہور شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی اس نے کہا:

"لوگوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں اور تلواریں بنوامیہ کے ساتھ۔" (۱)

حضرت حسین مسلم بن عقیل کے انجام سے بے خبر کوفہ کی جانب روانہ تھے، آپ ۸/ ذی الحجہ کو مکہ سے روانہ ہوئے، اور ۹/ کو ابن عقیل کی شہادت کا واقعہ پیش آچکا تھا، راستہ میں محمد بن اشعث کے قاصد نے آپ کو مسلم بن عقیل کی شہادت کی پوری اطلاع دی، اور واپسی کا مشورہ دیا، دوسرے ذرائع سے بھی آپ کو حالات معلوم ہونے لگے، اس واقعہ سے آپ کو سخت صدمہ پہنچا اور آپ بہت دلگیر ہوئے، اور فرمایا: "ہمارے شیعہ نے ہمیں ذلیل کیا"۔ (۲) پھر حضرت مسلم کے گھر والوں سے بھی مشورہ کیا، آخر رائے یہی ٹھہری کہ کوفہ پہنچ کر حکمت عملی طے کی جائے، اور ممکن ہے کہ اہل کوفہ حضرت حسینؓ کو بنفس نفیس سامنے دیکھیں تو جسم وجان سے آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوجائیں، اس کے علاوہ مسلم بن عقیل کا قصاص بھی لینا ضروری تھا۔

کربلا میں

حضرت حسین نے اپنا سفر جاری رکھا اور کربلا میں پہنچ کر قیام کیا، کربلا میں کوفہ کے چند لوگ آپ کے پاس آئے، ان سے آپ نے دریافت کیا کہ کوفہ کے کیا

(۱) طبری: ۱/ ۲۱۸
(۲) خلاصة المصائب: ٤٩

حالات ہیں؟ اس کے جواب میں مجمع بن عبداللہ العامری نے کہا:

''کوفہ کے اشراف اور عہدہ دار آپ کے خلاف جتھہ بنائے ہوئے ہیں، کیونکہ ان کو بڑی بڑی رشوتیں مل چکی ہیں، اور ان کے مطالبات پورے کیے گئے ہیں، وہ سب کے سب آپ کے خلاف برسر پیکار ہیں، رہے عوام تو ان کے دل آپ کے ساتھ ہیں لیکن ان کی تلواریں آپ کے خلاف ہیں۔''(۱)

اب ابن زیاد کے حکم سے عمر بن سعد بن ابی وقاصؓ چار ہزار کا کوفی لشکر لے کر آپ کے پاس پہنچے، انھوں نے آپ کو ابن زیاد کے پاس چلنے کا حکم دیا، اس کے جواب میں حضرت حسین نے ان کے سامنے تین باتیں رکھیں، فرمایا:

''تم مجھے چھوڑ دو، جیسے آیا ہوں واپس چلا جاؤں، اگر اس سے انکار کرتے ہو تو مجھے ترکوں کی طرف جانے دو کہ میں وہاں جہاد میں شریک ہو جاؤں، اور اگر اس سے بھی انکار ہے تو مجھے یزید کے پاس لے چلو اور میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدوں، اور پھر وہی جو فیصلہ کرنا چاہے کرے۔''(۲)

عمر بن سعد نے یہ پیغام ابن زیاد تک پہنچا دیا، ان کی بھی مرضی تھی کہ حضرت حسینؓ کو یزید کے پاس بھیج دیا جائے، لیکن ایسی صورت میں یہ امر یقینی تھا کہ اہل کوفہ کی غداری اور ان کی دھوکہ بازی طشت از بام ہو جاتی، اور اہل بیت اور فرزندان علی سے ان کی محبت وعقیدت کا سارا بھرم کافور ہو جاتا، اور یہ بھی ممکن تھا کہ ان کی غداری کے نتیجہ میں ان کے خلاف فرد جرم عائد ہوتا اور پوری شیعہ قوم کی جگ ہنسائی کی نوبت آتی، اس لیے یہ ضروری ہوا کہ حضرت حسین کو یزید کے پاس جانے سے روکا جائے۔

چنانچہ ملعون شمر ذی الجوشن جو کہ ابن زیاد کا خاص مقرب تھا اس نے ابن زیاد کو ورغلاتے ہوئے کہا کہ خدا کی قسم یہ تو ناممکن بات ہے، حسین کو چاہیے کہ وہ خود کو پہلے ابن زیاد کے حوالہ کریں، چنانچہ ابن زیاد نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ وہ پہلے خود کو میرے

(۱) البدایہ والنہایہ: ۱۷۳/۸ (۲) ایضاً

حوالہ کریں پھر میں فیصلہ کروں گا کہ ان کے ساتھ کیا کیا جائے۔

ابن زیاد نے شمر سے کہا کہ عمر بن سعد اگر تعمیل حکم میں تساہل برتیں اور حسین کو گرفتار کرنے میں ٹال مٹول سے کام لیں تو تُو اس کی جگہ فوج کا افسر ہے۔ چنانچہ شمر ذی الجوشن نے عمر بن سعد کی جگہ خود سنبھالی اور پانچ ہزار کی فوج لے کر حضرت حسین کے بہتر (۷۲) جیالوں سے مقابلہ کے لیے نکل پڑا۔

حضرت حسین کو جب علم ہوا کہ ان کے سلسلہ میں فیصلہ ابن زیاد کو کرنا ہے تو آپ کو اس کی بدنیتی اور سازشی ارادوں کو سمجھنے میں دیر نہ لگی اور آپ نے گرفتاری دینے سے انکار کر دیا، آخرش نوبت جنگ تک پہنچی۔

حضرت حسینؓ کی شہادت

۱۰/محرم الحرام جمعہ کے دن حضرت حسین نے فجر کی نماز ادا کی، آپ کے ساتھیوں میں بتیس سوار اور چالیس پیادہ تھے، حضرت حسین اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے، اور فوج کو مخاطب کر کے انھیں یاد دلانے لگے کہ وہ کون ہیں، کس کے نواسے اور بیٹے ہیں، اور ان کی کیا حیثیت اور مقام ہے! وہ فرماتے تھے کہ لوگو! اپنے دل کو ٹٹولو اور اپنے ضمیر سے پوچھو، کیا مجھ جیسے شخص سے جنگ کرنا جبکہ میں تمھارے نبی کا نواسہ ہوں درست ہے؟ (۱)

شمر الجوشن کی فوج میں وہ کوفی بھی تھے جنھوں نے حضرت حسین کو خطوط لکھے تھے اور آپ کو کوفہ آنے کی پرزور دعوت دی تھی، جب یہ لشکر سامنے آیا تو حضرت حسین نے انھیں پہچان لیا اور ان کوفیوں کو مخاطب کر کے کہا:

”ویلکم یا أهل الكوفة أنسيتم كتبكم وعهودكم التي أعطيتموها وأشهدتم الله عليها، ويلكم أدعوتم ذرية أهل بيت نبيكم، وزعمتم أنكم تقتلون أنفسكم دونهم حتى اذا أتوكم

(۱) البدایہ والنہایہ: ۸/۱۷۹

سلمتموهم الى ابن زياد من قسوهم من ماء الفرات، بئس ما خلفتم نبيكم في ذريته مالكم لاسقاكم الله يوم القيامة۔“ (۱)

(اے اہل کوفہ افسوس ہے تم پر! کیا تم اپنے خطوط اور اپنے وعدوں کو بھول گئے، جو تم نے ہم سے کیے تھے، اور تم نے اس پر خدا کو گواہ بنایا تھا، حیف صد حیف! تم نے اپنے نبی کے اہل بیت کو بلایا اور یہ وعدہ کیا کہ ان کے لیے اپنی جانیں نچھاور کردو گے، اور جب تمہارے وعدوں پر بھروسہ کر کے وہ تمہارے پاس آئے تو تم نے انھیں ابن زیاد کے حوالہ کردیا، جس نے ان پر فرات کا پانی بند کردیا، تم نے اپنے نبی کی اولاد کے ساتھ نہایت ہی گھنونا برتاؤ کیا ہے، قیامت کے دن خدائے پاک تمھیں بھی پیاسا ہی رکھے)

اسی اثناء میں شمر ذی الجوشن آگے بڑھا اور حضرت حسین کے قافلہ پر حملے شروع کردیے، گھمسان کی جنگ ہوئی، حضرت حسین کے جاں نثار ایک ایک کر کے آپ پر فدا ہوتے رہے، آپ ان کے لیے دعا کرتے رہے اور ”جزاكم الله أحسن جزاء المتقين“ فرماتے رہے، آپ کے سامنے آپ کے رفقاء اور خاندان کے افراد شہید ہوتے گئے، آپ تنہا بچے، لیکن کسی کی ہمت نہ تھی کہ آپ کا سامنا کرے، آپ بڑی دیر تک میدان میں گھومتے رہے لیکن مقابلہ کے لیے کوئی آگے نہ بڑھا، بالآخر شمر نے کوفی جنگجوؤں کو للکار کر کہا: اب حسین کا کام تمام کرنے میں کیا انتظار ہے؟ آگے بڑھو اور انھیں گھیرے میں لے کر حملہ کرو، وہ چاروں طرف سے بڑھے، حضرت حسین نے ثابت قدمی سے مقابلہ کیا، پھر زرعہ بن شریک تمیمی نے لپک کر آپ کے شانۂ مبارک پر وار کیا، سنان بن انس نے نیزہ سے حملے کیے، اور پھر گھوڑے سے اتر کر سر مبارک تن سے جدا کردیا۔ (لعنة الله عليهم أجمعين)

---

(۱) ناسخ التواریخ: ۳۳۵

شیعہ-حضرت حسینؓ کے قاتل

حضرت حسین کربلا کے میدان میں جس مظلومیت کے ساتھ شہید ہوئے وہ تاریخ اسلام کا ایک سیاہ باب ہے، اوراس کی سیاہی میں شیعوں کی سیاہ طبیعت کا ہی اثر ہے، حضرت حسین کی شہادت اور کربلا کے اس المناک واقعہ کی تمام تر ذمہ داری کوفہ کے شیعان حسینؓ پر عائد ہوتی ہے، جنھوں نے فریب دہی وفتنہ پردازی کے ارادہ سے آپ کودعوت دی، پھرانتہائی کمینہ پن، خیانت کاری اور بزدلی سے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا، آپ کے خلاف تلواریں اٹھائیں اور آپؓ کے اور آپؓ کے رفقاء کے خون سے اپنے دامن کوتر کرلیا۔

تاریخ میں ساری شہادتیں موجود ہیں کہ شیعوں نے کس طرح حضرت حسینؓ کے ساتھ غداری کی اور خودحضرت حسینؓ اور ان کے خاندان افراد نے کس طرح ان شیعوں کولعنت وملامت کی اور ان سے بیزاری بلکہ نفرت کا اظہار کیا ہے، ذیل میں چند نمونے ملاحظہ ہوں:

اہل کوفہ شیعہ تھے

جن کوفیوں نے حضرت حسین کوخطوط لکھے، ان سے معاہدے کیے، ان کے لیے قسمیں کھائیں، اوراپنے گلے میں ان کی بیعت کا طوق ڈالتے ہوئے ان کے ساتھ بے وفائی کی وہ سب شیعہ ہی تھے، اس کی گواہی مشہور شیعہ مصنف صاحب خلاصۃ المصائب نے دی ہے:

> ''اہل بیت کوشہید کرنے والوں میں کوئی شامی یا حجازی نہیں تھا بلکہ سب کے سب کوفی تھے۔''(۱)

اوراہل کوفہ کے مذہب کی وضاحت قاضی نوراللہ شوستری نے اس طرح کی:

---

(۱) خلاصۃ المصائب ص ۲۰۱

''تشیع اہل کوفہ حاجت باقامت دلیل ندارد وسنی بودن کوفی الاصل خلاف اصل ومحتاج دلیل است۔''(۱)

(اہل کوفہ کے شیعہ ہونے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، کوفیوں کو سنی ہونا خلاف اصل ہے جو محتاج دلیل ہے۔)

حضرت حسینؓ کی گواہی

''خدایا اگر تو انھیں زندہ رکھ تو انھیں ٹکڑیوں میں بانٹ کے رکھ، ان کے درمیان پھوٹ ڈالدے، کبھی حکمرانوں کو ان سے مطمئن نہ رکھ، انھوں نے ہمیں بلایا تھا کہ ہماری مدد کریں گے، مگری یہ دشمنی پر اتر آئے اور ہمارے قتل کے درپے ہوگئے۔''(۲)

ایک دوسرے موقع پر شیعوں کو بددعا دیتے ہوئے فرمایا:

''ہم سے بیعت کرنے کے لیے تم اس طرح لپکے جیسے ٹڈیوں کے دَل کے دَل ٹوٹ پڑتے ہیں، تم پروانوں کی طرح نچھاور ہوئے، پھر تمہیں نے بیعت توڑ بھی دی، ہلاکت ہو، تباہی ہو، بربادی ہو امت کے ان فرعونوں پر! باطل کی ان ٹکڑیوں کے ان پس ماندہ حصوں پر! کتاب اللہ کے پس پشت ڈالنے والوں پر! تمہیں ہو جنھوں نے ہمیں بے یارو مددگار چھوڑ دیا، ہمیں موت کے گھاٹ اتارا، سن لو! ظالموں پر خدا کی لعنت ہے!''(۳)

حضرت زین العابدینؒ کی گواہی

حضرت زین العابدین اس جانکاہ واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں، وہ فرماتے ہیں:

''کیا تمہیں یاد نہیں کہ تم نے میرے والد کو خطوط لکھ کر کوفہ بلایا تھا، مگر تم نے دھوکہ دیا، ان سے پیمان وفا باندھا مگر انہی سے لڑ بیٹھے، ان کی مدد سے ہاتھ

(۱) مجالس المؤمنین، مجلس اول، ص:۲۵ (۲) الارشاد للمفید: ۲٤۱ (۳)الاحتجاج: ۲/۲٤

کھینچ لیا، اب تم کیا منھ لے کر رسول اللہ (ﷺ) کے پاس جاؤ گے؟ جب آپ (ﷺ) فرمائیں گے: تم نے میرے گھر والوں سے لڑائی کی، میری حرمت پامال کی، دفع ہو جاؤ تم لوگ میری امت کے نہیں۔" (۱)

"جب امام زین العابدین عورتوں کے ہمراہ کربلا سے تشریف لائے اور وہ بیمار تھے تو اس وقت کوفہ کی عورتیں اور مرد گریباں چاک' رو پیٹ رہے تھے، اس وقت امام زین العابدین اپنی کمزور آواز میں فرمانے لگے: "یہ لوگ رو رہے ہیں حالانکہ ان کے علاوہ کسی غیر نے ہمیں قتل نہیں کیا۔" (۲)

حضرت زینبؓ کی گواہی

امیر المؤمنین حضرت علیؓ کی صاحبزادی اہل کوفہ سے فرماتی ہیں:

"اے کوفہ والو! اے دھوکہ بازو! مکارو اور دغابازو! تمھاری مثال اس بڑھیا کی سی ہے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا مگر دسرے ہی لمحہ اپنی محنت ضائع کر دی، غرور و تکبر، جھوٹ اور مکاری کے سوا تمھارے اندر رہے ہی کیا، تم میرے بھائی پر ماتم کرتے ہو؟! ہاں کرو خوب ماتم کرو، خوب روؤ، ہنسنا تمھارے مقدر میں نہ ہو، تمھارے دامن پہ داغ لگ چکا ہے، خاندان نبوت کا خون کب تک ارزاں سمجھتے رہو گے؟!" (۳)

حضرت فاطمہ صغریٰؒ کی گواہی

"اے کوفہ والو! اے غدارو! اے مکارو! اے گھمنڈی انسانو! تمھاری وجہ سے اللہ تعالی نے ہم اہل بیت کو آزمائش میں ڈالا، اور تمھیں ہمارے ذریعہ آزمایا، ہم تو آزمائش میں کھرے اترے، مگر تم ہمارے ناشکرے نکلے، اور ہمیں جھٹلانے لگے، تم نے ہم سے جنگ و قتال کو جائز ٹھہرایا،

---

(۱) الاحتجاج ۲/۳۲ (۲) الاحتجاج: ۲/ ۱۵۸ (۳) الاحتجاج: ۲/ ۲۹-۳۰

ہمارے مال کو تم نے لوٹ لیا، اسی طرح کل ہمارے پیارے دادا کو بھی تم نے قتل کیا تھا، تمھاری تلواروں سے ہمارا خون اب بھی ٹپک رہا ہے، ہلاکت ہو تمھارے لیے، خدا کی لعنت اور اس کے عذاب کا انتظار کرو جو تم پر آیا ہی چاہتا ہے، وہ تمھارا شیرازہ منتشر کر کے تمھیں باہم دست و گریباں کر دے گا، پھر قیامت کے دن وہ تمھیں دردناک عذاب سے دوچار کرے گا ان مظالم کی پاداش میں جو تم نے ہم پر کیے ہیں، سن لو خدا کی لعنت ہو ظلم کرنے والوں پر! اے کوفہ والو! تمہارا بیڑہ غرق ہو!'' (۱)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی گواہی

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں:

''عراق والے مجھ سے مکھی مارنے کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں حالانکہ انہی لوگوں نے رسول اللہ (ﷺ) کی صاحبزادی کے بیٹے کو قتل کیا ہے۔'' (۲)

شیعوں کے نزدیک کربلا کی اہمیت

عبداللہ ابن سبا نے اپنے نظریات کی اشاعت کے لیے مختلف ملکوں کا دورہ کیا، وہ شہر شہر گھوما اور ایک ایک فرد سے ملا، ہر کسی کو اپنا ہمنوا بنانے کے جتن کیے، لیکن کہیں بھی اسے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہوئے، البتہ جب وہ کوفہ پہنچا تو وہاں اسے غیر معمولی پذیرائی ملی، اور اس کی باتوں کو بخوشی قبول کر لیا گیا، اس کی بنیادی وجہ اہل کوفہ کا مزاج اور ان کی علمی و ایمانی نور سے دوری ہے، چنانچہ کوفہ کی سرزمین سے شیعیت کا فتنہ نمودار ہوا، اور پھر اس نے اسلام کے مضبوط قلعہ میں شگاف پیدا کرنے کی کوشش کی۔

حضرت حسینؓ کی شہادت اور پھر ان کی تدفین کے بعد کربلا کی سرزمین شیعوں

(۱) الاحتجاج ۲/ ۲۸ (۲) بخاری: ۳۷۵۳

کی زیارت گاہ، ان کا کعبہ وقبلہ، بادشاہوں اور سلاطین کا مطاف اوران کے نمازیوں کے لیے مسجد بن گئی، اہل کوفہ نے کربلا کو بہت ہی انچا مقام دیا، اس کی تقدیس وعظمت میں حد درجہ غلو سے کام لیا اوراس کے فضائل میں ساتوں قلابے ملا دیے۔

ذیل میں کچھ روایتیں ملاحظہ ہوں:

ابوعبداللہؒ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی طرف یہ وحی کی:

''اے کعبہ! اگر کربلا کی مٹی نہ ہوتی تو میں تجھے فضیلت نہ بخشتا، اوراگر کربلا کی زمین کے لوگ نہ ہوتے تو میں تجھے پیدا نہ کرتا، اور نہ وہ گھر پیدا کرتا جس پر تجھ کو فخر ہے، لہٰذا اسی فضیلت پر راضی ہو جا، اور سکون کر اور تواضع اختیار کر، کربلا کی زمین کے سامنے فخر وغرور نہ کر، ورنہ میں تجھ سے ناراض ہو جاؤں گا اور تجھے جہنم کی آگ میں جھونک دونگا۔''(۱)

شیعوں کے آیت اللہ آل کاشف الغطاء لکھتے ہیں:

''کربلا روئے زمین پر سب سے افضل جگہ ہے، اور یہ بات شیعہ مذہب کے لوازمات میں سے ہے۔''(۲)

آج کم ہی شیعہ کا کوئی ایسا گھر ہوگا جہاں مٹی کی وہ ٹکیا نہ ہو جس پر شیعہ نمازوں میں سجدہ کرتے ہیں، اس کے علاوہ اسے بوسہ دینا، اس سے تبرک حاصل کرنا اوراپنے ساتھ سفر میں رکھنا ایک عام سی بات ہے۔

حضرت حسینؓ کی قبر کی فضیلت

ابوعبداللہ فرماتے ہیں:

''حضرت حسینؓ کے قبر کے پاس پڑھی جانے والی نماز کی ہر رکعت کا ثواب تمھیں اتنا ملے گا جتنا کسی شخص نے سوچ کر کے کمایا ہو، اس نے سو عمرے کیے ہوں، سو غلام آزاد کیے ہوں، اور گویا کہ اس نے کسی نبی مرسل

---

(۱) کامل الزیارات، فضل کربلا وزیارۃ الحسینؑ (۲) ایضاً

کے ساتھ ایک لاکھ مرتبہ جہاد میں شرکت کی ہو۔''(۱)

کلینی روایت کرتے ہیں:

''ایک شخص ابوعبداللہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں نے انیس حج ادا کیے ہیں، آپ اللہ سے دعا کر دیجیے کہ وہ مجھے بیسواں حج ادا کرنے کی بھی توفیق دیدے۔ انھوں نے فرمایا: کیا تم نے حضرت حسین کے قبر کی زیارت کی؟ جواب دیا نہیں۔ فرمایا: حسینؓ کے قبر کی زیارت بیس حج سے بھی بہتر ہے۔(۲)

وسائل الشیعہ کے مصنف لکھتے ہیں:

''رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا: جس شخص نے حسین کی وفات کے بعد اس کی زیارت کی تو اللہ تعالی اس کے اعمال نامہ میں میرے ساتھ ادا کیا ہوا ایک حج لکھ دیں گے۔ راوی نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ) ایک حج کا ثواب؟ تو آپ (ﷺ) نے فرمایا: ہاں دو حج کا ثواب۔ انھوں نے تعجب سے پوچھا: دو حج کا ثواب؟! آپ نے فرمایا: ہاں چار حج کا ثواب، پھر وہ مسلسل پوچھتے رہے، اور آپ (ﷺ) مسلسل اضافہ فرماتے رہے، حتی کہ ایک زیارت کا ثواب رسول اللہ (ﷺ) نے ستر حج اور عمروں کے برابر قرار دیا۔''(۳)

پھر سرکشی بڑھتی گئی اور فضیلت میں اضافہ ہوتا ہوگیا:

''رضا علیہ السلام نے فرمایا: جس شخص نے فرات کے کنارے پر حسین کے قبر کی زیارت کی تو وہ اس شخص جیسا ہے جس نے اللہ کی زیارت اس

---

(۱)الوافی:۸/۲۳۴۔تہذیب الاحکام:۶/۱۳۴۱

(۲)فروع الکافی:۴/۶۴۷، الوافی:۸/۲۱۹۔ وسائل الشیعہ :۱/۳۴۸

(۳) وسائل الشیعة: ۱۰/۳۵۱، ۲، ۵ باب استحباب زیارة الحسین......۔

کے عرش پر کی۔"(۱)

"ابوعبداللہ سے روایت ہے، انھوں نے فرمایا کہ عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ حضرت حسین کی قبر کی زیارت کرنے والوں پر نظر رحمت ڈالتا ہے، میں (راوی) نے عرض کیا کہ کیا میدان عرفات میں وقوف کرنے والوں سے بھی پہلے ڈالتا ہے؟ فرمایا: ہاں۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیوں کر؟ انھوں نے جواب دیا کہ میدان عرفات میں وقوف کرنے والوں میں حرامیوں کی اولاد بھی ہوتی ہے، جبکہ حسین کے قبر کی زیارت کرنے والوں میں حرامی نہیں ہوتے۔"(۲)

شیعوں کے نزدیک کربلا سے جڑی ہر چیز کو بے انتہا فضیلت حاصل ہے، اور خدا ہی جانے کہ فضیلتوں کا یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا؟!

حضرت حسینؓ کے نام پر رونا

حضرت جعفر صادق سے روایت ہے:

"جو شخص شہادت حسین بیان کرے، خود روئے اور دوسروں کو بھی رلائے، اس کے تمام گناہ معاف کردیے جاتے ہیں اور اس کے لیے جنت واجب ہوجاتی ہے۔"(۳)

کربلا کے بعد

عبداللہ ابن سبا نے جن فتنوں کی بنیاد ڈالی تھی وہ سارے فتنے سیاسی نوعیت کے تھے، حضرت عثمانؓ کی شہادت سے لے کر حضرت حسینؓ کی شہادت تک مسلمانوں کی

---

(۱) بحار الأنوار، باب جوامع ما ورد من الفضل في زيارته ونوادرها

(۲) كامل الزيارات، باب ثواب زيارة الحسين ـ تهذيب الأحكام: ١٣٢٥/٦

(۳) رجال الكشي: ٢٤٦

تاریخ، خانہ جنگی اور خونِ ناحق کی داستانوں سے لبریز ہے، کربلا کی خونچکاں داستاں رقم ہونے کے بعد سبائیت نے اپنا سیاسی چوغہ اتار کر شیعیت کا مذہبی پیراہن اوڑھ لیا اور اسلام کے اندر ایک نئے مذہب نے جنم لیا جس کی شاخیں ہر دور میں پھلتی پھولتی رہیں، اس مذہب کے عقائد الگ، نظریات جدا اور پس پردہ مقاصد نہایت ہی خطرناک ہیں۔ چنانچہ اسی شیعیت کی ترویج واشاعت کے لیے مختلف تحریکات، شخصیات اور جماعتیں وجود میں آتی رہیں، اور سب نے ذہنی قلابازیاں دکھائیں اور اس میں من چاہے اضافے کیے۔

توابین کا خروج

حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد بعض اہل کوفہ کو اپنی وعدہ خلافی، بدعہدی اور حضرت حسینؓ کے ساتھ دھوکہ دہی کا احساس ہوا، اپنی غلطی پر انھوں نے پچھتاوا ظاہر کیا، اور قاتلین کربلا سے انتقام کی تیاری شروع کی، یہ گویا ان کی توبہ کی ایک ظاہری شکل تھی اسی لیے انھیں ''توابین'' کہا گیا، انھوں نے سلیمان بن صرو کو اپنا امام منتخب کیا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سلیمان نے اعلان کیا کہ سب سے پہلے قاتلوں کے سردار ابن زیاد کا کام تمام کرنا ہے، اس کی ہلاکت کے بعد باقی قاتلوں پر آسانی سے قابو پایا جاسکتا ہے، ۶۵ھ کو سلیمان بن صرو تقریباً سترہ ہزار آدمی لے کر ابن زیاد کے مقابلہ کے لیے نکلا، پہلے کربلا کی سرزمین پر پہنچا، ایک دن اور ایک رات وہیں قیام کیا، سب نے وہاں خوب گریہ وزاری کی، اور پھر ابن زیاد سے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے، ادھر ابن زیاد کو خبر ہوئی تو اس نے حصین بن نمیر کو بارہ ہزار کی فوج دے کر روانہ کیا، ''عین الوردہ'' کے مقام پر زبردست جنگ ہوئی، جو دو دن تک جاری رہی، اس درمیان ابن زیاد نے مزید دس ہزار کی کمک روانہ کی، توابین کے اکثر لوگ اس جنگ میں مارے گئے، رات کی تاریکی میں جو بچ سکتے تھے بچ نکلے، اس جنگ میں توابین کی کمر ہی ٹوٹ گئی حتی کہ ان کا سردار سلیمان بن صرو بھی اس جنگ میں کام آ گیا، چونکہ یہ جنگ توابین نے

لڑی تھی اس لیے تاریخ کی کتابوں میں ''جنگ توابین'' کے نام سے بھی مذکور ہے۔(۱)

مختار ثقفی کا ظہور

کوفہ ایک نوآباد بستی تھی، جہاں اکثر عجم کے نومسلم آباد تھے، اسلامی مرکز سے دوری کی وجہ سے روح اسلام کی حقیقت سے بالکل بے خبر اور اسلامی مزاج واقدار سے بالکل ناآشنا تھے، مزاج میں لوٹ مار اور قتل وغارت گری تھی، اپنے مفاد کے لیے کسی کا بھی ساتھ دینا یا کسی سے بھی دغا کرنا کوئی معیوب بات نہ تھی، لڑنے بھڑنے کے اس قدر عادی تھے کہ حق اور ناحق سے کوئی غرض نہ تھی، اسی مزاج کا نتیجہ ہے کہ جب حضرت علیؓ اقتدار میں آئے تو سب نے ان کی بیعت کرلی، حضرت حسن کا عہد آیا تو ان کے ساتھی ہوگئے، حضرت حسینؓ سے امیدیں وابستہ ہوئیں تو ان کے پرستار بن گئے، لیکن جب مفادات کی تکمیل نہ ہوسکی تو ''خوارج'' کی شکل میں حضرت علیؓ سے ہی بغاوت کرلی اور ان کو شہید کرڈالا، حضرت حسنؓ کا نہ صرف خیمہ لوٹا بلکہ ان کی جان کے درپے بھی ہوگئے، حضرت حسینؓ کو اصرار کرکے بلکہ ناک کے بل ان کے پاس پہنچ کر انھیں کوفہ آنے پر راضی کرلیا لیکن ابن زیاد کی دھمکی اور کچھ مالی پیش کش کے عوض میں اپنے ضمیر کو بیچ ڈالا اور حضرت حسینؓ کے خون ناحق سے کربلا کی سرزمین کو لالہ زار کردیا۔

مختار ثقفی نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز اس اعلان کے ساتھ کیا کہ حضرت حسینؓ کے جانشیں محمد بن الحنفیہؒ نے اسے اپنا نائب مقرر کیا ہے اور قاتلان حسینؓ سے انتقام لینے کی ذمہ داری اس کے سپرد کی ہے، پھر جب اسے معلوم ہوا کہ اہل کوفہ میں ''توابین'' کی ایک جماعت اس مقصد کے لیے سرگرم ہے تو اس نے ان کو بھی اپنے ساتھ کرلیا، اور ابن زیاد کے لشکر سے جنگ کی تیاری شروع کردی لیکن عین جنگ سے قبل کوفہ کے گورنر نے اس کو قید کردیا، جنگ میں توابین کی کمر ٹوٹ گئی، جو بچ نکلے ان

(۱) تاریخ اسلام، جلد دوم، از:- اکبر شاہ نجیب آبادی، ص:۹۷، ۹۸

کے نام مختار نے خط لکھا کہ تم لوگ بالکل غم نہ کرو، اگر میں زندہ رہا تو تمہارے سامنے شہیدوں کا بدلہ لوں گا اور حضرت حسین کے قاتلوں سے انتقام لوں گا، دنیا میں کوئی شخص اگر ایسا باقی ہے جو خون حسین کا قصاص لینا چاہتا ہو وہ اس کام میں مجھ سے عہد کرلے۔

رفتہ رفتہ حضرت حسینؓ کے نام پر ایک بڑی تعداد اس کے گرد جمع ہوگئی، اہل کوفہ میں اس کا رسوخ بڑھنے لگا، اس نے اپنی فوج تیار کی، پھر اپنی چالاکی، عیاری اور جنگی واقفیت کے بدولت جلد ہی کوفہ میں رسوخ حاصل کرلیا، اول اول اس نے کوفہ میں قاتلان حسینؓ کو تلاش کر کے قتل کرنا شروع کیا، امیر کوفہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ نکلا، اس طرح کوفہ پر مختار کا قبضہ ہوگیا۔

کوفہ کے بعد اس نے شام و دمشق کی طرف نظریں بڑھائیں، خلیفہ عبدالملک بن مروان کو اس کے ارادہ کی بھنک ملی، اس نے عبیداللہ ابن زیاد کو ایک لاکھ کی فوج کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا، گھمسان کی جنگ ہوئی اور ابن زیاد مارا گیا، اس کے بعد مختار کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ گئی، اس کی یہ اقبال مندی دیکھ کر چاروں طرف سے شیعہ سمٹ سمٹ کر اس کے پاس آنے لگے اور اس کے ہمنوا بننے لگے۔

کوفہ کی حکومت کے ملنے اور اقتدار کے مضبوط ہونے کے بعد مختار نے شیعیت کا سوانگ بھرا، اور اپنی چودھراہٹ قائم رکھنے کے لیے شیعیت کا سہارا لیا، سب سے پہلے حضرت علیؓ کی محبت کا دم بھرا، اسی دوران اسے خبر ملی کہ حضرت علیؓ کسی خاص کرسی پر بیٹھ کر حکومت کے فیصلے کیا کرتے تھے، اس نے ایک بڑھئی جعدہ سے ایک کرسی خریدی، اس پر رنگ و روغن لگایا، اس کو ریشم سے منڈھ دیا، اس کے سامنے دو رکعت نماز پڑھی، پھر اپنے مریدوں سے کہا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے تابوت سکینہ کو فتح و نصرت کا ذریعہ بنایا تھا اسی طرح ''شیعان علیؓ'' کے لیے یہ کرسی باعث برکت و کامیابی ہے، اس کے مریدین نے اس کرسی پر آنکھیں ملیں، اس کو بوسے دیے، اس کے آگے سر جھکائے، پھر ایک خوبصورت تابوت میں اس کو رکھ کر

چاندی کا تالا ڈال دیا، اس کی حفاظت کے لیے افراد متعین ہوئے، جامع مسجد کوفہ میں وہ تابوت رکھا گیا جہاں نماز بعد اس کو بوسہ دیا جاتا، اس سے نذریں مانی جاتیں، اور عقیدت کا اظہار کیا جاتا۔

اس کے بعد وہ بلند بانگ دعووں پر اتر آیا، مثلا کہتا کہ جبرئیلؑ میرے پاس آتے ہیں اور مجھے غیب کا علم حاصل ہے، پھر اس نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا، اس کے علانیہ دعووں کی وجہ سے بہت سے شیعہ اس سے متنفر ہونے لگے، بالآخر اس کی ہفوات عبداللہ ابن زبیرؓ کے گوش گزار ہوئیں اور لوگوں نے اس کا مداوا کرنے کی درخواست کی، انھوں نے حضرت مصعب ابن زبیرؓ کو مختار کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا، حضرت مصعب نے پہلے اس کی طاقت کمزور کی، کوفہ کے شیعوں سے مراسلاتی رابطہ کر کے انھیں مختار سے برگشتہ کیا، مختار کے دست و بازو اور شمشیر براں ابراہیم بن اشتر کو سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ ملایا، اس طرح اس کے ہمنواوں میں بددلی پیدا ہونے لگی اور مختار کی طاقت کمزور پڑگئی، ہر طرف سے مختار کو تنہا و کمزور کر کے اسے قتل کر دیا، اور اس کی جمعیت کو پراگندہ و منتشر کر کے اس فتنہ کا سد باب کیا۔(۱)

شیعیت کا آغاز

عبداللہ ابن سبا نے اسلام کے خلاف جس بغاوت کا آغاز کیا تھا، وہ بغاوت ابتدا ہی سے مذہب و سیاست کے شانہ بشانہ چلتی رہی، سیاسی دغابازیاں کھلے عام ہوتی رہیں اور مذہبی سرگرمیاں زیرزمین جاتی رہیں، بالآخر کربلا کی سرزمین پر سبائیت کا عبوری دور مکمل ہوا اور اس نے اسلامی ساخت کو خراب کرنے کے لیے ایک نئی بساط بچھائی اور اپنی چالوں سے عوام اور حکومت دونوں کو ایک ساتھ مات دینے کی کوشش کی، اس تصادم کے نتیجہ میں عالم اسلام ایک نئے مذہب سے متعارف ہوا جسے آج ''شیعیت'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

---

(۱) تحفۂ اثنا عشریہؒ۔ تاریخ اسلام جلد دوم از اکبر شاہ نجیب آبادیؒ باختصار: ۱۰۰-۱۰۲

شیعیت دراصل سبائیت ہی کا جدید ایڈیشن ہے جس نے اسلام کے متوازی ایک مستقل مذہب کی حیثیت حاصل کرلی ہے، ایک ایسا مذہب جس کے عقائد و نظریات اسلام سے بالکل جداگانہ ہیں، اس کی مستقل شریعت ہے، اس کا نبی اماموں سے بھی کمتر اور اس کے امام خدائی صفات کے حامل ہیں، اس کی کتابیں قرآن مجید سے زیادہ محکم اور باعث فلاح ونجات ہیں لیکن انسانی دست رس سے بہت دور حتی کہ اس کا خدا خطا ونسیان کا مرکب اور اپنی خدائی میں اماموں کی منشاء کا محتاج ہے، غرض شیعیت ایک ایسا مذہب ہے جس کے باطل عقائد ونظریات سے واقفیت حاصل کرنا علمائے امت کی بنیادی ذمہ داری ہے تاکہ ان کی ملمع سازی، دروغ گوئی، اور سیاسی قلابازیوں سے بچنا اور بھولے بھالے مسلمانوں کو بچانا آسان ہو۔

اگلے صفحات میں اسی نئے مذہب کے عقائد ونظریات کا جائزہ لیا گیا ہے:

امامت-شیعیت کی اساس

فرقۂ اثنا عشریہ کے مذہب کا بنیادی پتھر امامت کا عقیدہ ہے، باقی تمام مباحث اسی بنیادی عقیدہ کی فروعات ہیں، حقیقت میں یہ عقیدہ الوہیت ونبوت کا ایک مرکب ہے، یعنی منصب امامت کے حامل افراد الوہی صفات واختیارات اور مقام نبوت دونوں کے جامع ہیں، اس عقیدہ کی زد براہ راست عقیدۂ توحید وعقیدۂ ختم نبوت پر پڑتی ہے۔اور پھراس کے اثرات سے شریعت اسلامیہ عملاً معطل ہوجاتی ہے۔

سبائیت ایک نئے قالب میں

سبائی فرقہ نے حضرت علیؓ، اہل بیت اور واقعۂ کربلا کو اپنی تحریک کی روح بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا، اوراس کے ذریعہ اپنے لیے ڈھیر ساری ہمدردیاں بٹوریں، چونکہ اس جماعت نے اپنی بنیاد حضرت علیؓ اور اہل بیت کی محبت پر رکھی تھی اس لیے اسے ''شیعیت'' (شیعان علیؓ) کے نام سے بہت جلد فروغ حاصل ہوا، اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جذباتی طور پراس سے وابستہ ہوئی، اس میں خاص کروہ علاقے شامل تھے جو قدیم زمانہ سے نسلی فتنہ کا شکار تھے، اور نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

شیعیت نے حضرت علیؓ اور اہل بیتؓ کی محبت کو ایک مؤثر حربہ کے طور پر استعمال کیا، اوراس کی آڑ میں مسلمانوں کے عقائد کو مسخ کرنے کی کوشش کی، جس کے نتیجہ میں اسلام کے پہلو سے ایک ایسے مذہب کا وجود ہوا جس کا چہرہ مہرہ تو اسلام سے میل کھاتا تھا لیکن حقیقت میں وہ اسلام کے خلاف ایک بغاوت تھی، اور ایک ایسے مذہب کا

آغاز تھا جس کے ڈانڈے کہیں یہودیت سے ملتے ہیں تو کہیں مجوسیت سے، چنانچہ اس نئے مذہب میں ان سبھی خرافات کو اہمیت دی گئی جن کا اسلام ہمیشہ سے مخالف رہا ہے، بلکہ ان بنیادوں پر تیشے چلائے گئے جن پر اسلام کا نظام قائم ہے۔اور یہ عقیدہ پیش کیا گیا کہ امامت کا اقرار شریعت اسلامی کا بنیادی رکن ہے اور نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو بھی وہ مقام وفضیلت حاصل نہیں جو عقیدۂ امامت کو حاصل ہے، پس یہی وہ بنیاد ہے جہاں سے اہل سنت والجماعت اور اہل تشیع کی راہیں جدا ہوجاتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی نظر میں کفر کے مرتکب قرار پاتے ہیں۔

شیعوں کے عقائد کی بنیاد بلکہ اہل سنت والجماعت سے ان کا امتیاز ان کا عقیدۂ امامت ہی ہے اس لیے اس عقیدہ کو قدرے تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے:

امامت کا مفہوم

اللہ کے رسول (ﷺ) اس دنیا سے تشریف لے گئے، اور عمداً آپ (ﷺ) نے اپنی جانشینی پر کوئی فیصلہ یا وصیت نہیں فرمائی، کیونکہ ایسا کرنے پر رسول اللہ (ﷺ) کے ہر فرمان اور عمل کو قیامت تک مسلمانوں کے لیے نا قابل تبدیل قانون کی حیثیت حاصل ہوجاتی، بالفرض اگر آپ (ﷺ) اپنے خاندان میں سے کسی کو اپنا جانشین نامزد کر دیتے تو یہ خاندانی حکومت کی مثال بن جاتی، اور اگر آپ (ﷺ) کسی اور نظام کی ہدایت فرمادیتے تو اس نظام سے ہٹنا مسلمانوں کے لیے ناممکن ہوجاتا جبکہ دنیا کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کو مختلف نظام اختیار کرنے پڑے ہیں۔

چنانچہ رسول اللہ (ﷺ) کے بعد مسلمانوں کے باہمی اتفاق سے حضرت ابوبکرؓ پھر حضرت عمرؓ، پھر حضرت عثمانؓ اور پھر ان کے بعد حضرت علیؓ حضور (ﷺ) کے جانشین اور خلیفہ مقرر ہوئے، مسلمانوں نے جسے مناسب سمجھا اپنا امیر منتخب کیا، اس میں نہ کوئی سیاست ہوئی نہ کسی کی حق تلفی، خود چاروں خلفاء ہمیشہ ایک دوسرے کے معاون ومشیر رہے، اور منصب خلافت کی ادائیگی میں حد درجہ مخلص اور حقوق العباد میں انتہائی حساس۔

حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ کے عہد تک خلافت کے سلسلہ میں کسی طرح کا کوئی نظریاتی اختلاف نہیں تھا، بلکہ پوری امت اسلامیہ اختلافی وبا سے محفوظ اور کفر کے مقابلہ میں ایک قلب وقالب تھی، لیکن حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں اسلامی یلغار اور اسلامی فتوحات سے سب سے زیادہ یہودیوں کے مفادات پر ضرب لگی چنانچہ اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا رخ موڑنے کے لیے انھوں نے یہ پالیسی اختیار کی کہ مسلمانوں میں زہریلے نظریات کا بیج بو کر انھیں فرقوں میں تقسیم کردیا جائے، اور جب مسلمان باہم دست وگریباں ہوں گے تو ان کے اندر کفر کو للکارنے کی تب وتاب باقی نہیں رہے گی، لیکن اسلام کی حقانیت اور قیامت تک اس کی بقا کے خدائی فیصلے نے ان سازشوں کو ناکام کردیا، ورنہ جس طرح یہودی سینٹ پال نے عیسائیت کو مسخ کیا تھا اسی طرح یہودی سازشیں اسلام کا حلیہ بھی بگاڑ دیتیں، تاہم اس سے بھی انکار نہیں کہ یہودی سازشیں اہل اسلام کے بیچ ایک نئے فرقہ کو جنم دینے میں کامیاب ہوئیں جسے آج ''شیعیت'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

شیعوں نے جو عقائد اور نظریات اختیار کیے وہ سب اسلام کی تعلیمات کے بالکل خلاف بلکہ اسلام کے مقابلہ مستقل ایک مذہب کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی اپنی الگ شریعت ہے، اپنے الگ عقائد ونظریات ہیں اور اپنا الگ دستور العمل ہے اور انہیں میں بنیادی عقیدہ امامت کا ہے۔

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت (ﷺ) کی وفات کے بعد حضرت علیؓ ہی آپ (ﷺ) کی جانشینی کے مستحق تھے، ان سے ان کا حق چھین لیا گیا، اور تینوں خلفاء کے سامنے حضرت علیؓ مجبور محض اور مختلف زیادتیوں کا شکار ہوتے رہے۔ (نعوذ باللہ)

یہی وجہ ہے کہ شیعہ خلفائے ثلاثہ کی خلافت کے منکر بلکہ انھیں غاصب گردانتے ہیں، اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضور (ﷺ) کے حقیقی جانشین اور مسلمانوں کے پہلے خلیفہ حضرت علیؓ ہیں، پھر آپؓ کے بعد خلافت کا یہ سلسلہ آپؓ کی اولاد میں قائم رہا جو کہ

آخری اور بارہویں امام محمد ابن حسن العسکری ملقب بہ مہدی پر پورا ہوگا۔

شروع میں معاملہ صرف حضور (ﷺ) کی جانشینی تک محدود تھا، اور حضرت علی پھر ان کی اولاد کے لیے امامت کا تصور عام ہوتا گیا، اس تصور کے ساتھ ساتھ بہت سارے فضائل ومناقب بھی جڑتے گئے جن کی روشنی میں امامت کا مقام نہ صرف نبوت کے برابر ہوا بلکہ بعض لحاظ سے امامت خدا کی خدائی میں بھی شریک ہوتی گئی۔

چنانچہ شیعہ عقیدہ کے مطابق جس طرح انبیاء کرام کی بعثت ہوتی رہی اسی طرح اللہ رب العزت نے آنحضرت (ﷺ) کے بعد اماموں کو بھی مبعوث کیا، یہ امام نبی کی ہی طرح ہر غلطی سے پاک اور معصوم ہوتے ہیں، ان پر وحی کا نزول ہوتا ہے، ان کی اطاعت نبی کی طرح ہی فرض ہے، وہ نبی کی طرح احکام شریعت کونافذ کرتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر شریعت کے جس حکم کو چاہیں معطل یا منسوخ بھی کر سکتے ہیں۔

امام کا مقام ومرتبہ

شیعہ قوم اپنے اماموں کے بارے میں بہت سے کفریہ عقائد رکھتی ہے، ان کے مطابق ان کے بارہ امامٔ انبیاء ورسل سے افضل ہیں، وہ خدائی اختیارات اور تصرفات کے مالک ہیں، صفات الٰہی سے متصف ہیں، مخلوق کے حاجت روا اور مشکل کشا ہیں، دنیا ان کے دست تصرف میں ہے، فرشتے اور انبیاء ورسل ان کے مطیع وفرمانبردار ہیں اور دنیا کی کوئی بھی چیز ان سے مخفی نہیں۔ کائنات کے ذرہ ذرہ پر ان کی تکوینی حکومت ہے، ان کی تعلیمات قرآنی تعلیمات ہی کی طرح دائمی اور واجب العمل ہیں، توحید ورسالت کے ساتھ بارہ اماموں کی امامت کی گواہی دینا بھی ایمان کا جزء ہے۔(۱)

خمینی صاحب لکھتے ہیں:

"ہمارے مذہب کا بنیادی عقیدہ ہے کہ ہمارے امام اس مرتبہ ومقام کے

---

(۱) یہ تمام تفصیلات ایرانی انقلاب کے بانی خمینی صاحب کی کتاب "الحکومة الاسلامية" اور "تحرير الوسيلة" میں بھی موجود ہیں۔

مالک ہیں جن تک کوئی فرشتۂ مقرب اور نبی مرسل بھی نہیں پہنچ سکتا۔“(۱)

امامت کا منکر کافر ہے

شیعہ مفسر ابوالحسن بحرانی لکھتے ہیں:

”من جحد امامة امام اللّٰه فهو كافر مرتد۔“ (۲)

(جس نے اللہ کے کسی امام کی امامت کا انکار کیا وہ کافر ہے مرتد ہے)

حضرت جعفر صادق فرماتے ہیں:

”من عرفنا كان مؤمنا ومن أنكرنا كان كافراً“(۳)

(جس نے ہمیں پہچانا وہ مؤمن ہوا اور جس نے ہمارا انکار کیا وہ کافر ہوا)

”فلا يدخل الجنة الا من عرفنا وعرفناه ولا يدخل النار الا من أنكرنا وأنكرناه“۔(۴)

(جنت میں وہی داخل ہوگا جو ہمیں پہچانتا ہو اور جسے ہم پہچانتے ہیں، اور جہنم میں وہی جائے گا جس نے ہمیں پہچاننے سے انکار کیا اور جسے ہم نے نہیں پہچانا)

نبوت اور امامت

علامہ حلی (ابومنصور الحسن) لکھتے ہیں:

”يجب على اللّٰه نصب الامامة كنصب النبى“ (۵)

(اللہ پر واجب ہے کہ نبی کی طرح امام بھی مقرر کرے)

صرف اسی پر بس نہیں، شیعوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ کسی نبی یا رسول کو اس وقت

---

(۱) الحكومة الاسلامية صفحه : ۳۵ (۲) مقدمۂ تفسير البرهان: ۲۱ (۳) أصول كافى: ۱/۱۸۷، باب طاعة الأئمة (۴) أصول كافى: ۱/۱۸۷، باب معرفة الامام والرد اليه (۵) منهاج الكرامة: ۲

تک نبوت یا رسالت نہیں ملی جب تک کہ اس نے اماموں کی امامت کا اقرار نہیں کرلیا۔ ابوعبداللہ علیہ السلام کی روایت ہے:

"ما من نبی ولا من رسول أرسل الا بولایتناو تفضیلنا علی من سوانا"(۱)

(کسی نبی کو نبی اور کسی رسول کو رسول اس وقت تک نہیں بنایا گیا جب تک اس نے ہماری ولایت اور سب پر ہماری فضیلت کا اقرار نہیں کرلیا)

جناب موسیٰ کاظم کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے کہ انہیں ائمہ کی خاطر انبیائے کرام کو آزمائشوں سے گذرنا پڑا اور انہیں کے طفیل ان کی آزمائشیں دور ہوئیں:

"بنا غفر لآدم و بنا ابتلی أیوب و بنا افتقد یعقوب و بنا حبس یوسف وبنا رفع البلاء وبنا أضاء ت الشمس ونحن مکتبو ن علی عرش ربنا۔"(۲)

(ہمارے وسیلہ سے آدم کو معافی ملی، ہمارے ہی سبب ایوب مصیبت میں مبتلا ہوئے، ہماری وجہ سے یعقوب کو صدمۂ فراق اٹھانا پڑا، یوسف زندانی ٹھہرے، اور ہمارے ہی طفیل ان کے مصائب دور ہوئے، ہماری ہی خاطر سورج روشن ہوتا ہے، ہمارے ہی اسماء رب کے عرش پر کندہ ہیں۔)

انبیاء سے افضل

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے ائمہ دنیا میں سب سے افضل ہیں حتی کہ انبیاء کرام سے بھی ان کا مقام ومرتبہ بڑھا ہوا ہے، بلکہ بعض روایتوں میں ان کے ائمہ خدا کی خدائی میں بھی شریک نظر آتے ہیں، تاہم عمومی روایات میں اکثر ائمہ نبی آخرالزماں (ﷺ) سے اعلی وافضل تو نہیں ہیں لیکن مقام ومرتبہ میں آپ (ﷺ) سے کم بھی نہیں ہیں۔

(۱) بحارالانوار: ۲۸۱/۲۶ (۲) بحار الأنوار: ۲۵۱/۲۶

چنانچہ مجلسی اپنی کتاب ''مرآۃ العقول'' میں لکھتے ہیں:

''ائمہ محمد (ﷺ) کے علاوہ تمام انبیاء سے افضل ہیں''(۱)

شیعہ قائد خمینی کا کہنا ہے:

''ہمارے ائمہ کو وہ مقام ومرتبہ حاصل ہے جو کسی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل کو بھی حاصل نہیں ہے۔''(۲)

باقر مجلسی رقمطراز ہیں:

''حق اینست کہ در کمالات وشرائط وصفات فرقے در پیغمبر و امام نیست۔''(۳)

(حق بات یہ ہے کہ کمالات وشرائط اور صفات میں پیغمبر اور امام کے درمیان کوئی فرق نہیں)

''مرتبہ امامت بالاتر از مرتبہ پیغمبر است''(امامت کا مرتبہ پیغمبر کے مرتبہ سے کہیں بلند ہے)

آسمانی کتابوں کے مالک

شیعوں کے ہر امام کے پاس اس کی ہدایت ورہنمائی کے لیے مستقل ایک کتاب ہوتی ہے، وہ اسی کتاب کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتا ہے، اسے قرآن کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کے علاوہ اسے دیگر آسمانی کتابوں کا بھی علم ہوتا ہے:

ملا باقر علی مجلسی لکھتے ہیں:

''کلینی بسند معتبر روایت کردہ است کہ حریز بحضرت صادق عرض کرد، حضرت فرمود: ہر یک از ما صحیفہ دارد کہ آنچہ باید در مدت حیات خود عمل آورد در آں صحیفہ است چوں آں صحیفہ تمام مے شود مے داند کہ وقت ارتحال است۔''(۴)

---

(۱) مرآۃ العقول: ۲/۲۹۰ (۲) تحریر الوسیلۃ: ۵۲-۹۴

(۳) حیات القلوب: ۳/۱۰ (۴) جلاء العیون (فارسی): ۳۰۸، طبع ایران

(کلینی نے معتبر سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ حضرت صادق نے فرمایا: ہم میں سے ہر امام کے پاس ایک آسمانی کتاب ہوتی ہے،، زندگی میں جو اعمال کرنے ہوتے ہیں وہ اس کتاب میں لکھے ہوتے ہیں، اور جب وہ کتاب پوری ہو جاتی ہے تو ہر امام جان لیتا ہے کہ اس کی وفات کا وقت قریب ہے۔)

ایک دوسری روایت ملاحظہ ہو:

"ان عندنا علم التورات، والانجیل، والزبور، وتبیان ما فی الألواح،وفی روایة ؛ عندنا الصحف صحف ابراهیم وموسیٰ"(۱)

(بے شک ہمارے پاس تورات وزبور اور انجیل کا علم ہے...... نیز ہمارے پاس ابراہیم وموسیٰ کے صحیفے بھی ہیں)

عیوب سے پاک

کلینی صاحب لکھتے ہیں

"الامام المطهر من الذنوب والمبرء من العیوب"(۲)

(امام گناہوں سے پاک اور عیوب سے مبراء ہوتا ہے)

خمینی صاحب کے الفاظ ہیں:

"لا نتصور فیهم السهو والغفلة"۔ (۳)

(ہم ان کے بارے میں کسی سہو یا غفلت کا تصور بھی نہیں کر سکتے)

ائمہ معصوم ہیں

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے ائمہ ہر طرح کے چھوٹے بڑے سب گناہوں

(۱)أصول کافی ج۱ ص۲۲۵، باب ان الأئمة ورثوا علم النبي وجمیع الأنبیاء

(۲)أصول الکافی: ۱۲۱ (۳) الحکومة الاسلامیة : ۹۱

سے پاک ہیں اس لیے وہ اپنے امام کو امام معصوم بھی کہتے ہیں۔

شیعہ عالم مجلسی کے الفاظ ہیں:

''جان لو شیعہ امامیہ کا اتفاق ہے کہ ان کے ائمہ ہر طرح کے چھوٹے بڑے گناہ سے محفوظ ہیں، ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوتا، نہ عمداً اور نہ بھول کر، نہ کسی تاویل میں غلطی سے اور نہ ان کے بھلانے سے کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے۔''(۱)

ائمہ کی بات فرمان الٰہی کے مثل

شیعوں کے عالم شیخ محمد المازندرانی بیان کرتے ہیں:

''عام ائمہ طاہرین کی حدیث اللہ تعالی کا فرمان ہیں، اور ان کے اقوال میں کوئی تضاد و اختلاف نہیں جیسا کہ اللہ تعالی کے اقوال میں کوئی اختلاف نہیں۔''(۲)

وہ مزید لکھتے ہیں:

اگر اس بنیاد پر تم یہ کہو تو جائز ہوگا کہ جو شخص ابوعبداللہ علیہ السلام سے حدیث سنے تو وہ اس حدیث کو ابوعبداللہ کے والد یا دادا سے بیان کرے، بلکہ یہ بھی جائز ہے کہ وہ صرف کہے: قال اللہ تعالیٰ (یعنی اللہ تعالی کا ارشاد ہے)(۳)

علم غیب

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے امام کو ہر طرح کا علم غیب حاصل ہوتا ہے، اگر کسی کو علم غیب نہیں ہے تو گویا وہ امام نہیں ہے، جبکہ اسلامی عقیدہ ہے کہ ہر طرح کے غیب کا حقیقی علم صرف اللہ کو ہے، البتہ اللہ نے اپنے بہت سے مقبول بندوں کو تھوڑا بہت غیب

(۱) بحار الانوار ۲۵/۲۱۱ (۲) شرح اصول کافی ج۲ ص۲۲۵

(۳) شرح اصول کافی ج۲ ص۲۲۵ - از محمد صالح بن المازندانی

کا علم دیا ہے لیکن وہ علم اپنی ساری وسعت وجامعیت کے باوجود بہت ہی معمولی ہے، نیز اس علم غیب کا تعلق روزمرہ کے واقعات سے ہے، چنانچہ قیامت کا علم، زندگی اور موت کا علم، رزق کی کشادگی اور تنگی کا علم، برسات کے ہونے اور نہ ہونے کا علم اور جنین کی حقیقت کا علم، یہ غیب کے وہ علوم ہیں جو صرف اللہ کے ساتھ خاص ہیں، اور اللہ کا کوئی محبوب ترین بندہ بھی اس علم کا حصہ دار نہیں ہے۔

﴿إِنَّ اللَّـهَ عِـندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَـدْرِي نَـفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَداً وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ (لقمان:٣٤)

(یقیناً اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہی بارش کرتا ہے اور رحم کے اندر جو کچھ ہے اس کو جانتا ہے اور کوئی بھی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا اور کوئی نہیں جانتا کہ کس جگہ اس کی موت ہوگی بلاشبہ اللہ خوب جانتا پوری خبر رکھتا ہے)

لیکن شیعوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے امام کو ہر طرح کا غیبی علم حاصل ہے، بلکہ اس امام کی امامت ایک بنیادی رکن ہے کہ وہ عالم الغیب ہو، اور یہ ساری تفصیلات ان کی معتبر کتابوں میں مذکور ہیں:

کلینی صاحب اپنی کتاب الکافی میں روایت کرتے ہیں:

''جو امام غیب کا علم نہیں رکھتا اور اپنے انجام سے باخبر نہیں ہوتا وہ امام لوگوں کے لیے حجت نہیں ہے۔''(۱)

آگے لکھتے ہیں:

''امام کو ہر چیز کا علم ہوتا ہے، جب کبھی کسی بھی واقعہ کے بارے میں جاننا چاہیں انھیں فوراً اس کا علم ہو جاتا ہے۔''(۲)

مزید لکھتے ہیں:

---

(۱) اُصول الکافی، کتاب الحجہ (۲) ایضاً

''ہر امام اپنی موت سے آگاہ اور اس سلسلہ میں بااختیار ہوتا ہے، جب تک وہ خود نہ چاہے اس کی موت واقع نہیں ہوسکتی۔''(۱)

محدث کلینی کا کہنا ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے متعلق فرمایا:

''مجھے وہ خوبیاں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں، انبیاء کو بھی نہیں، مجھے مصیبتوں اور آفتوں کا علم دیا گیا ہے، مجھے انساب اور فصل الخطاب کا علم عطا کیا گیا، جو مجھ سے پہلے ہو چکا وہ میرے علم سے باہر نہیں، جو مجھ سے غائب ہے وہ مجھ سے دور نہیں۔''(۲)

رافضی محدث کلینی آٹھویں امام علی رضا سے روایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہم اللہ کے امین ہیں، ہمیں لوگوں پر نازل ہونے والے مصائب و مشکلات کا، ان کی موت کے وقت کا اور ان کے حسب ونسب کا علم ہے، ہم شکل دیکھ کر ہی کسی کے مؤمن یا منافق ہونے کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔''(۳)

یہی کلینی راوی یوسف التمار سے ایک روایت نقل کرتے ہیں:

راوی کہتا ہے کہ ہم ایک روز امام جعفر صادقؑ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، کہ آپ فرمانے لگے: ہمارے درمیان کوئی جاسوس بیٹھا ہوا ہے، ہم نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، ہمیں کوئی مشکوک شخص نظر نہیں آیا، ہم نے کہا: ہمارے خیال میں یہاں کوئی جاسوس نہیں ہے۔ امام صاحب اپنی بات کی تردید پر غصہ میں آگئے اور فرمایا: رب کعبہ کی قسم! اگر میں موسیٰ اور خضر کے ساتھ موجود ہوتا تو انھیں بتاتا کہ میں ان دونوں سے زیادہ علم رکھتا ہوں، ان دونوں کے پاس ماضی کا علم تھا مگر وہ حال اور مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے، جبکہ مجھے قیامت تک کے تمام واقعات کا

(۱) ایضاً (۲) الأصول من الكافي: ۱۹۷/۱۹ (۳) الكافي، كتاب الحجة

علم ہے۔"(۱)

ایک اور روایت میں ہے:

امام صادق نے فرمایا: جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے مجھے سب اشیاء کا علم ہے، اور جو کچھ جنت اور دوزخ میں ہے مجھے اس کا بھی علم ہے، اسی طرح مجھے گذشتہ واقعات اور ہونے والے واقعات کا بھی علم ہے۔(۲)

قدرت کاملہ

شیعہ قوم نے اپنے اماموں کو الوہیت کے مرتبہ تک پہنچا دیا ہے، ملاحظہ ہو:

حضرت جعفر صادق کے حوالہ سے کلینی کے الفاظ ہیں:

"ہم حکومت الٰہیہ کے نگہبان ہیں، ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کے علوم اور وحی خداوندی کا خزانہ ہے۔"(۳)

حضرت جعفر ہی کے حوالہ سے مزید لکھتے ہیں:

"دنیا اور آخرت امام کے قبضۂ اختیار میں ہیں، جسے چاہے اور جو چاہے عطا کر دے۔"(۴)

خمینی صاحب امام کی قدرت کاملہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فان للامام مقاما محمودا ودرجة سامية وخلافة تكوينية تخضع لولايتها وسيطرتها جميع ذرات الكون۔"(۵)

(امام کو مقام محمود، بلند حیثیت اور تکوینی حکومت حاصل ہوتی ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے حکم اور اس کی قدرت کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے۔)

کلینی اور باقر مجلسی دونوں حضرات روایت کرتے ہیں:

"عن أبی عبد الله علیه السلام قال: ولايتنا ولاية الله التی لم

---

(۱) اصول کافی باب "امام کو تمام واقعات کا علم ہے اور کوئی چیز ان سے مخفی نہیں"۔(۲) ایضا (۳) ایضا ۱۹۲ (۴) اصول کافی ج ۱ ص ۴۰۹، ط ایران (۵) الحکومة الاسلامية: ۵۲

یبعث نبی قط الا بھا۔"(۱)

(جعفر صادق فرماتے ہیں کہ ہماری ولایت (امامت) ایسی ہی ہے جیسی اللہ کی ولایت ہوتی ہے، اور ہر نبی اس کا حکم لے کر مبعوث ہوا ہے۔)

قانون سازی کا حق

مسلمانوں کا عقیدہ ہے شریعت سازی کا حق اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی نہیں ہے، خود آنحضرت (ﷺ) کو بھی اجازت نہیں کہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دیں، بلکہ جو بھی احکامات آپ (ﷺ) صادر فرماتے ہیں ان سب کی اللہ کی جانب سے آپ کو ہدایت دی جاتی، جیسا کہ قرآن کریم میں صراحت سے موجود ہے:

﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى ☆ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى ﴾(النجم:۲،۳)

(آپ اپنی مرضی سے کچھ نہیں فرماتے بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو آپ کی طرف بھیجی جاتی ہے)

لیکن شیعوں کا عقیدہ ہے کہ ان کے اماموں کو کسی چیز کے حلال یا حرام کرنے کا حق حاصل ہے، یعنی وہ قانون ساز بھی ہوتے ہیں:

چنانچہ کلینی نے "اصول الکافی" میں اور مجلسی نے "بحار الانوار" میں لکھا ہے:

"خلق -أی الله- محمدا وعلياً وفاطمة، فمكثوا ألف دهر، ثم خلق جميع الأشياء فأشهدهم خلقها وأجرى طاعتهم عليها، وفوض أمورها اليهم فهم يحلون مايشائون ويحرمون ما يشائون۔"(۲)

(اللہ تعالیٰ نے محمد، علی اور فاطمہ کو پیدا کیا پھر ان کے ہزار سال بعد دوسری تمام مخلوقات کو پیدا فرمایا، اور ان کو اپنی مخلوقات کی آفرینش پر گواہ بنایا، اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کو ان پر لازم کر دیا، اور ان کے تمام امور کی

---

(۱) بحار الأنوار:۲۶/۲۸۱ (۲) أصول الكافي كتاب الحجة، باب مولد النبي ﷺ

دیکھ بھال ان کے سپرد کردی، لہٰذا وہ چاہیں تو کسی چیز کو حلال کردیں اور
چاہیں تو کسی چیز کو حرام کردیں)
اصول الکافی کتاب الحجہ میں ایک باب کا عنوان ہے:

”التفويض الى رسول الله صلى عليه وآله والى الأئمة عليهم السلام فى أمر الدين“

(اللہ نے دین کے امور رسول اللہ (ﷺ) اور ائمہ کے سپرد کردیے ہیں)
یعنی جس چیز کو چاہیں حلال قرار دیں اور جس کو چاہیں حرام ٹھہرائیں، ان پر کوئی روک ٹوک نہیں بلکہ جو ان کی مرضی وہی شریعت کا حکم۔ (العیاذ باللہ)

ائمہ کی قبروں کا مقام ومرتبہ

شیعوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ان کے ائمہ کی قبریں بھی فائدہ پہنچاتی ہیں، اور اس کی مٹی تو اکسیر کا حکم رکھتی ہے، وہ ان قبروں کی عبادت کرتے ہیں، ان پر رکوع وسجود کرتے ہیں، ان سے منت مانگتے ہیں، ان کی قسمیں کھاتے ہیں، مدد کے وقت انھیں پکارتے ہیں، اوران قبروں کے لیے بڑی بڑی رقمیں جمع کرتے ہیں۔

شاید ہی شیعوں کو کوئی گھر یا کوئی مسجد ایسی ہو جہاں خاک کربلا سے بنی ہوئی مٹی کی ٹکیا موجود نہ ہو، شیعہ اس پر اپنی نمازوں میں سجدہ ریز ہوتے ہیں، اسے بوسہ دیتے ہیں، اس سے تبرک حاصل کرتے ہیں، بعض اوقات حصول شفا کے لیے اس میں سے کچھ کھا بھی لیتے ہیں، اس کی مختلف شکلیں بنا کر سفروں میں اپنی جیب میں بھی رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ تقدیم وتقدیس کا سلوک کرتے ہیں۔

حضرت حسینؑ کی قبر کی مٹی

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت حسین کی قبر کی مٹی اور گارا ہر بیماری سے شفا ہے
ابوعبداللہ کہتے ہیں:

''اپنے بچوں کو حسین کی قبر کی مٹی سے گھٹی دو، کیونکہ وہ ہر خوف سے امان ہے''۔(۱)

مزید کہتے ہیں:

بے شک اللہ تعالی نے میرے دادا حسین کی قبر کی مٹی کو ہر بیماری کی شفا بنایا ہے، اور ہر خوف سے امان بنایا ہے۔''(۲)

زیارت قبور

ائمہ کی قبروں کی زیارت کرنا شیعوں کے نزدیک ایک اہم دینی فریضہ سمجھا جاتا ہے، وہ ان قبروں پر کھڑے ہوکر لمبی لمبی عبارتیں پڑھتے ہیں، جسے وہ ''زیارت'' کا نام دیتے ہیں، یہ زیارت ائمہ کی مدح وثنا، ان کے مخالفین پر تبراء اور اخیر میں کچھ دعا پر مشتمل ہوتی ہے، شاید ہی کوئی شیعہ گھر ہو جہاں ان زیارتوں پر مشتمل کتابیں نہ ہوں، جیسے، مفتاح الجنان، مزار البحار، ضیاء الصالحین وغیرہ، ان کتابوں میں شیعی ائمہ اور ان کی اولاد کے لیے سینکڑوں ''زیارت'' موجود ہیں۔

ظاہری طور پر قبروں کی زیارت شیعوں کے نزدیک ایک مذہبی فریضہ ہے، لیکن حقیقت میں اس کے پس پردہ ان کے سیاسی، ثقافتی و مذہبی مفاد ہوتے ہیں، جن کے ذریعہ وہ شیعیت کی صفوں کو مضبوط کرتے ہیں، اور اپنے طریقۂ کار اور اہل سنت والجماعت کے خلاف تخریبی سازشوں کی اشاعت کرتے ہیں۔

ائمہ کی قبروں پر حاضری دینے کا سلسلہ صدیوں پرانا ہے، اس کا آغاز حضرت حسینؓ کی شہادت کے چالیس دن بعد ہوا، جب حضرت حسینؓ کے متعلقین کا ایک قافلہ قبر پر سلام کے لیے کربلا پہنچا، اس کے بعد سے مختلف جہتوں سے قافلوں کے پہنچنے کا سلسلہ شروع ہوگیا، یہ دراصل شیعہ حضرات کے مابین ملاقاتوں کا سلسلہ تھا جو دور دراز شہروں سے چل کر حصول ثواب کے نام پر شیعی مذہب کی اشاعت اور بنو امیہ اور پھر بنو

---

(۱) أصول الکافی: ۱/۴۲، کتاب فضل العلم باب التقلید (۲) بحار الانوار: ۸۹/۱۱۸

عباس کے خلاف اظہار نفرت کے لیے جمع ہوتا تھا، اس لیے ان قبروں پر تلاوت ودعا کے بجائے ایسی عبارتیں پڑھی جاتی ہیں جن میں خلافت کے مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے، ان زیارتوں کے ذریعہ حاضرین میں ایک جوش پیدا کیا جاتا ہے اور انھیں اپنی شیعی مقاصد پر مضبوطی سے جمنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

زیارت کی فضیلت

لوگوں میں شوق پیدا کرنے اور ائمہ کی قبروں اور خاص کر حضرت حسینؓ کی قبر پر جمع ہونے کی مختلف روایتیں بھی گڑھی گئیں ہیں، مثلاً

"لـكل خطوة يخطوها الزائر فی سبيل زيارة الحسين له قصر فی الجنه". (۱)

(حضرت حسین کے قبر کی زیارت کے راستہ میں زائر کے ہر قدم کے بدلہ جنت میں ایک محل ہے)

حتی کہ انھوں نے کربلا کو کعبۃ اللہ سے بھی اعلی مقام دیدیا، ایک شاعر کہتا ہے:

وفی حديث كربلا والكعبة لكربلا بان علو الرتبة(۲)

(کربلا اور کعبہ کے متعلق گفتگو ہوئی تو پتہ چلا کہ کربلا کا مرتبہ کعبہ سے کہیں اونچا ہے)

حضرت حسینؓ کے قبر کی زیارت کی جو فضیلتیں ہیں وہ بے حد وبے شمار ہیں، اس زیارت کا ثواب نبی (ﷺ) کے ساتھ حج کرنے کے برابر بلکہ رؤیت الٰہی کے برابر ہے:

وسائل الشیعہ کے مصنف لکھتے ہیں:

"رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا: جس شخص نے حسین کی وفات کے بعد اس کی زیارت کی تو اللہ تعالی اس کے اعمال نامہ میں میرے ساتھ ادا کیا ہوا

---

(۱) بحار الأنوار، باب جوامع ما ورد من الفضل فی زيارته ونوادرها

(۲) اصلاح شیعہ، از:- ڈاکٹر موسی موسویؒ: ۱۶۷

ایک حج لکھ دیں گے۔ راویہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ) ایک حج کا ثواب؟ تو آپ (ﷺ) نے فرمایا: ہاں دو حج کا ثواب۔ انھوں نے تعجب سے پوچھا: دو حج کا ثواب؟! آپ نے فرمایا ہاں چار حج کا ثواب، پھر وہ مسلسل پوچھتی رہیں، اور آپ (ﷺ) مسلسل اضافہ فرماتے رہے، حتی کہ ایک زیارت کا ثواب رسول اللہ (ﷺ) کے ستر حج اور عمروں کے برابر قرار دیا۔"(۱)

پھر سرکشی بڑھتی گئی اور فضیلت میں اضافہ ہوتا ہو گیا:

"رضا علیہ السلام نے فرمایا: جس شخص نے فرات کے کنارے پر حسین کے قبر کی زیارت کی تو وہ اس شخص جیسا ہے جس نے اللہ کی زیارت اس کے عرش پر کی۔"(۲)

خدا ہی جانے کہ فضیلتوں کا یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا؟!

کلمۂ امامت

قرآن وسنت سے کلمۂ توحید وکلمۂ رسالت کا ثبوت ملتا ہے، دنیا کا ہر مسلمان اس کلمہ سے واقف ہے، اور اسی کلمہ کے ذریعہ کوئی شخص اسلام میں داخل ہوتا ہے، وہ کلمہ ہے: " لااله الاالله محمد رسول الله"۔

لیکن شیعوں نے جب اپنے اماموں کی شان میں غلو سے کام لیا تو ان کے نام کا کلمہ بھی وضع کیا، چنانچہ " لااله الاالله محمد رسول الله" کے بعد کبھی علي ولي الله، کبھی علي وصي رسول الله، کبھی علي حجة الله، کبھی علي خليفة الله، کبھی علي خليفته بلا فصل جیسے الفاظ کا اضافہ کرتے رہے، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ سارے الفاظ شیعہ کی کسی بھی کتاب میں موجود نہیں ہیں، اور نہ کہیں اس بات کا ذکر ہے

(۱) وسائل الشيعة: ۱۰/۳۵۱-۵۲، باب استحباب زيارة الحسين......الخ

(۲) بحار الانوار: ۹۸/۱۰۵۔ مستدرك الوسائل: ۱۰/۲۹۱

کہ ان کے کسی بھی امام نے کبھی کسی کو اسلام میں داخل کرتے وقت یہ کلمہ پڑھایا ہو۔

اذان میں اس تیسری شہادت کا اضافہ اس وقت ہوا جب شاہ اسماعیل صفوی نے ایران کو شیعیت میں داخل کیا، اور مؤذنوں کو حکم دیا کہ اذان میں اس تیسری شہادت کا اضافہ کریں، اس طرح اس نے حضرت علیؓ کو رسول اللہ (ﷺ) کے بعد خلافت کا مستقل مقام دیدیا، وہ دن ہے اور آج کا دن پوری دنیا میں شیعوں کی تمام مسجدوں سے یہی اذان بلند ہوتی ہے اور اب اسے شیعوں کے مذہبی شعار کے طور پر جانا جاتا ہے۔

حضرت علیؓ سے متعلق شیعوں کے یہاں پانچ مختلف الفاظ پائے جاتے ہیں، یعنی ان کا حضرت علیؓ کے متعلق اجماع نہیں ہوسکا، شاید یہی وجہ ہے کہ باقی گیارہ اماموں کے کلمے وہ وضع نہ کرسکے، تاہم ایرانی شیعوں نے یہ جرأت ضرور دکھلائی کہ انھوں نے اپنے ''انقلابی امام'' جناب خمینی کے لیے یہ کلمہ وضع کر ڈالا:

" لاالـه الاالله مـحمد رسول الله، علي ولي الله، وخميني حجة الله"

(اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد اللہ کے رسول ہیں، علی اللہ کے ولی ہیں اور خمینی اللہ کی حجت ہیں)(۱)

شیعوں کے مابین اختلافات اور ان کے فرقے

بلاشبہ امامت کا عقیدہ شیعیت کا بنیادی رکن ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ اماموں کا تعین خدا کی جانب سے ہوا ہے، اور ہر امام نے اپنے جانشیں کی وضاحت اور اس کی تعیین بھی کی، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کہ یہ عقیدہ صرف اور صرف یہود کے ذہن فاسد کا اختراع اور اس کے پہلو بہ پہلو مجوسیت کی ''کرم فرمائی'' کا منطقی نتیجہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اول وقت سے شیعہ اپنے اماموں کے نام پر کشت وخوں کا بازار گرم کرتے رہے، اور پوری تاریخ میں کسی ایک امام کی امامت پر ان کا اتفاق نہیں ہوسکا، چنانچہ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد حضرات حسنینؓ تک تو امام کا انتخاب کسی قدر آسان تھا لیکن پھر ان کی

---

(۱) ماہنامہ وحدت اسلامی، تہران، سالنامہ ۱۹۸۴ء

اولاد میں امامت کے منصب کو لے کر شیعوں میں خاصے اختلافات رونما ہوئے، اور حق امامت کے عنوان سے شیعیت کے بطن سے مختلف گروہ اور فرقے نمودار ہوئے، پھر ان فرقوں سے متعدد شاخیں نکلیں اور پھر ان سے مختلف کوپلیں نمودار ہوئیں، شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی کتاب ''تحفۂ اثناعشریہ'' میں سو(۱۰۰) سے زائد فرقوں کا تذکرہ کیا ہے، جبکہ شاہ عبدالقادر جیلانیؒ نے ''غنیۃ الطالبین'' میں اور علامہ عبدالکریم شہرستانی نے ''الملل والنحل'' میں ایک سوبیس (۱۲۰) فرقوں کا تذکرہ کیا ہے۔

جب بھی کسی امام کا انتقال ہوتا تو اگلے امام کے تعین میں ایک طوفان کھڑا ہو جاتا، اور ہر اختلاف کے نتیجہ میں شیعیت مزید نئے فرقوں میں تقسیم ہو جاتی، جن میں سے بہتیرے فرقے تو اوراق پارینہ کی زینت بن گئے، البتہ بعض فرقے سیاسی قوت ،گھنونہ پن اور ضمیر فروشی کی بدولت پنپتے رہے اور تاریخ اسلام کے چہرے کو مسخ کرتے رہے۔ ذیل میں شیعوں کے مابین اختلافات، امامت کے عنوان سے اٹھنے والی شخصیات اور ان کے گاہے گاہے پنپنے والے فرقوں کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

پہلا اختلاف

امامت کے سلسلہ میں شیعیت میں سب سے پہلا اختلاف واقعۂ کربلا کے بعد رونما ہوا، ایک فرقہ نے دعوی کیا کہ حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد امامت ختم ہوگئی، امام بس یہی تین تھے، حضرت علی، حضرت حسن اور حضرت حسین (رضی اللہ عنہم)۔

دوسرے فرقہ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ دونوں کی امامت کا انکار کیا، اس نے کہا کہ چونکہ حضرت حسنؓ نے امیر معاویہ سے مصالحت کرلی تھی اس لیے حضرت حسین کا یزید ابن معاویہؓ کے مقابلہ میں خروج کرنا درست نہیں تھا، اور اگر حضرت حسینؓ کا خروج درست تھا تو حضرت حسنؓ کا مصالحت کرنا غلط تھا۔

نوبختی اپنے رسالہ ''فرق الشیعہ'' میں لکھتے ہیں:

''یہ لوگ ان دونوں بزرگوں کے متضاد طرز عمل سے بدگمان ہوگئے، اور

دونوں کی امامت سے پھر گئے، اور عقیدہ میں عام لوگوں کے ساتھ ہم داستاں ہو گئے۔"(۱)

تیسرا فرقہ ان لوگوں کا تھا جو یہ دعوی کرتا تھا کہ امامت صرف حضرت حسینؓ کی اولاد کا حق نہیں، بلکہ دونوں کی اولاد میں جو بھی امامت کے لیے کھڑا ہوا اور لوگوں کو اپنی اطاعت کی دعوت دے وہ حضرت علی کی ہی طرح واجب الاطاعت ہے۔

چوتھے فرقہ نے حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد حضرت علی کے تیسرے صاحبزادہ محمد بن حنفیہؒ کی امامت کو تسلیم کیا۔

پانچواں فرقہ اس بات کا داعی ہے کہ حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادہ زین العابدینؒ ہی امام ہیں۔

فرقۂ مختاریہ-کیسانیہ

حضرت محمد بن حنفیہؒ کو جن لوگوں نے اپنا امام تسلیم کیا وہ "مختاریہ" اور "کیسانیہ" کے نام سے مشہور ہوئے، شیعوں کے سیاسی لیڈر مختار بن عبید ثقفی کی طرف نسبت کی وجہ سے اس فرقہ کے لوگ "مختاریہ" کہلاتے ہیں۔اس فرقہ میں ایک بااثر نومسلم شخص "موسیٰ کیسان" تھا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ حضرت حسنؓ کا متبع اور محمد بن الحنفیہؒ کا شاگرد تھا، اس کی نسبت سے اس فرقہ کو "کیسانیہ" بھی کہتے ہیں۔

فرقۂ کیسانیہ اور سبائیہ نے مل کر شیعیت کی جڑوں کو مضبوط کیا اور ابن سبا نے اسلام مخالف جس مہم کا آغاز کیا تھا اسے مختار اور کیسان نے آگے بڑھایا اور رفتہ رفتہ شیعیت کی جڑیں عالم اسلام میں پھیلنے لگیں، ایک بڑی تعداد اس فتنہ کا شکار ہوئی اور بہت سے سادہ لوح مسلمان تذبذب میں گرفتار ہو کر رسوا بھی ہوئے۔

اس فرقہ کا عقیدہ ہے کہ اس کے امام زندہ ہیں، اور یمن کے "کوہ رضواں" میں پوشیدہ ہیں، مہدی کی شکل میں ظاہر ہوں گے اور دجال کو قتل کریں گے، اس فرقہ کی

---

(۱)فرق الشیعة: ۷٤

بعض شاخیں حلول واتحاد اور تناسخ کی بھی قائل ہیں، اور احکام شرعیہ میں تاویلیں کرتے ہیں۔

اس فرقہ نے شام اور اردن کی سرحد کو اپنی دعوت کا مرکز بنایا، شام میں الاخوان المسلمون کے رسوخ کو ختم کرنے میں یہی کیسانی شیعہ (جو بعد کو نصیری فرقہ میں ضم ہوئے) بعث پارٹی کے دوش بدوش تھے، نیز موجودہ ظالم حکمراں بشارالاسد کا مذہبی تعلق اسی فرقہ سے ہے۔

دوسرا اختلاف

امام زین العابدین علی بن حسینؒ کے انتقال کے بعد حق امامت کے لیے پھر طوفان کھڑا ہوا، ایک فرقہ حسن ابن حسن مجتبیٰؓ کی امامت کا قائل ہوا، ان کے بعد ان کے بیٹے عبداللہ المحض پھر ان کے بیٹے محمد ذوالنفس الزکیہ کی امامت کا قائل ہوا، اس فرقہ کو ''حسنیہ'' کہتے ہیں۔

دوسرے فرقہ نے ان کے صاحبزادہ حضرت زیدؒ کو اپنا امام تسلیم کیا۔

تیسرا فرقہ حضرت علی ابن حسین کے دوسرے صاحبزداہ محمد باقرؒ کی امامت کا قائل اور ان کا پیروکار رہا۔

فرقۂ زیدیہ

امام زین العابدینؒ کے انتقال کے بعد شیعوں کی ایک بڑی جماعت نے حضرت زید بن علی ابن حسینؒ کو اپنا امام تسلیم کیا، پھر ان سے وعدے وعید کر کے ان کو بنوامیہ سے جنگ پر راضی کیا، بنوامیہ نے اس وقت کھلے طور پر ظلم وزیادتی کی راہ اختیار کر رکھی تھی، امام ابوحنیفہؒ نے بھی ان کے خلاف جنگ کا فتوی دے رکھا تھا، چنانچہ چالیس ہزار کی فوج لے کر انھوں نے والی عراق کے خلاف خروج کیا، دوران سفر شیعوں نے حسب عادت صحابہ کرام پر تبرا بکنا شروع کیا، جس پر حضرت زیدؒ نے انھیں سخت تنبیہ

کی، اور ایسی گستاخیوں سے باز رہنے کی تاکید کی، لیکن خبث باطن شیعوں کو حضرت زیدؒ کا صحابہ کرام کی حمایت اور ان سے اظہار محبت کرنا بالکل پسند نہ آیا، اور عین جنگ کے موقع پر تقریباً تیس ہزار شیعوں نے یہ کہہ کر ان کا ساتھ چھوڑ دیا کہ آپ ہمیں اصحاب رسول (ﷺ) پر تبرا کرنے سے منع کرتے ہیں تو آپ ہمارے امام برحق نہیں ہو سکتے، اس لیے آپ کی قیادت میں جنگ کرنا جائز ہی نہیں، اور حضرت زید کو دشمنوں کے نرغہ میں چھوڑ دیا، جس کا لازمی نتیجہ حضرت زید کی شہادت کی شکل میں ظاہر ہوا، اس طرح ایک بار پھر تاریخ نے خود کو دوہرایا اور حضرت حسینؓ کی سنت تازہ ہوئی۔

جن لوگوں نے حضرت زید کا ساتھ دیا اور ان کی شہادت کے بعد انہی کی امامت سے وابستہ رہے وہ ''زیدیہ'' کہلائے، یہ لوگ حضرت زید کے مہدی موعود ہونے کے بھی قائل ہیں۔ حضرت زیدؒ کے حامیوں نے کہا: "رفضوا زیدا" یعنی انھوں نے زید کو چھوڑ دیا، پس اسی زمانہ سے ''رافضی'' کا لفظ مستعمل ہو گیا۔

فرقۂ زیدیہ کی ایک شاخ ''خالص زیدیہ'' کہلاتی ہے، یہ صحابہ کرام پر تبرا نہیں کرتے، خلفائے ثلاثہ کی خلافت کو برحق مانتے ہیں، کیونکہ حضرت علیؓ ان سے راضی تھے، البتہ حضرت علیؓ کی تفضیل کے قائل ہیں، اور امام معصوم بھی نہیں مانتے، بعد میں یہ فرقہ اپنے عقائد پر قائم نہیں رہ سکا اور ''اثنا عشری'' اور دیگر فرقے اس پر غالب آ گئے۔

زیدیہ فرقہ کی دوسری شاخ ''جارودیہ'' کہلاتی ہے جس کا داعی ابوالجارود زیاد بن ابی زیاد تھا، یہ جارودی صحابہ کرام کو کافر مانتا ہے کہ انھوں نے حضرت علیؓ کی موجودگی میں کسی اور کو خلیفہ کیوں تسلیم کیا۔

زیدیہ فرقہ کی بڑی تعداد یمن کے علاقہ میں آباد ہے اور سنیوں کے خلاف سرگرم ''حوثی تحریک'' میں انہیں کی اکثریت ہے۔

فرقۂ باطنیہ وظاہریہ

جب ''کیسانیہ'' فرقہ کی تعداد اور ان کے سروسامان میں کمی آئی تو انھوں نے خود

کو ''رافضیوں'' سے وابستہ کرلیا، ان میں ایک شخص عبداللہ ابن معاویہ رافضی پیدا ہوا جس نے اپنی نسبت حضرت جعفر طیار کی جانب بیان کی، اس نے رافضیت میں اعلی مقام حاصل کیا، اور اس کے اصول وضوابط تیار کیے، اس میں وہ ''جدول'' (کیلنڈر) بھی جو اس نے عربی تاریخ معلوم کرنے کے لیے تیار کیا تھا، اس نے اس جدول کو اہل بیت کی جانب منسوب کرتے ہوئے کہا کہ اس جدول کے بعد رویت ہلال کی ضرورت نہیں ہے، شیعوں نے اس نظریہ کی مخالفت کی جس کے بعد جدولیوں نے کہا کہ یہ سب باطنی علوم ہیں جن سے ظاہر پرست واقف نہیں، جس طرح شریعت کا ایک ظاہر ہے اسی طرح اس کا ایک باطن بھی ہے اور ہمارے سوا کوئی بھی اس باطن سے واقف نہیں، پھر انھوں نے اپنے لیے ''اہل باطن یا باطنیہ'' کا لقب اختیار کیا اور دوسرے شیعوں کے لیے ''ظاہریہ یا اہل ظاہر'' کا لقب اختیار کیا۔

نصیری فرقہ

اسی فرقہ باطنیہ کا ایک شخص ابوشعیب محمد بن نصیر بصری نمیری تھا، یہ شیعوں کے امام حضرت علی ہادی اور پھر حضرت حسن عسکری کا معاصر رہا ہے، بارہویں امام محمد بن حسن عسکری کی غیوبت کے بعد اس نے دعویٰ کیا کہ وہ امام مہدی کے علوم کا وارث ہے اور وہی حجت ہے، پھر اس کی کوششوں سے اس کے ماننے والوں کی ایک جماعت تیار ہوگئی جسے ''نصیری'' کہا جاتا ہے۔

اس فرقہ کے لوگ غالی شیعہ ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ ہی خدا ہیں، ان کا روحانی ظہور انسانی جسم میں ہوا تھا، شہادت کے بعد حضرت علی بادلوں میں رہنے لگے، وہ بادلوں کو دیکھ کر کہتے ہیں ''السلام عليك يا امير المؤمنين!'' یہ فرقہ حضرت علی کے قاتل عبدالرحمٰن ابن ملجم سے محبت رکھتا ہے، اور کہتا ہے کہ ابن ملجم نے لاہوت کو ناسوت سے یعنی انسانی صورت کو الٰہی سے الگ کیا تھا، یہ فرقہ عقیدۂ تناسخ کا بھی قائل ہے۔

اس فرقہ کے لوگ اپنے گھروں میں ہی پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہیں کیونکہ ان کی عبادت گاہیں نہیں ہوتیں، اسی طرح ان کی نماز میں سجدہ نہیں ہے، تھوڑا سا رکوع ہے، پہلی نماز ظہر ہے جو محمد (ﷺ) کے لیے ہے، اس میں آٹھ رکعتیں ہیں، دوسری نماز عصر کی ہے جس میں چار رکعات ہیں، یہ نماز حضرت فاطمہ کے لیے ہے، تیسری مغرب کی نماز میں پانچ رکعات ہیں جو حضرت حسن کے لیے ہیں، اس کے بعد عشاء کی نماز حضرت حسین کے لیے ہے جس میں چار رکعات ہیں پھر آخری نماز فجر کی ہے جو حضرت محسن خفی کے لیے اور اس میں دو رکعات ہیں۔ اسی طرح ان کا روزہ صرف اتنا ہے کہ رمضان کے مہینہ میں بیوی سے جماع کرنے سے رک جایا جائے۔

یہ فرقہ صحابہ کرام سے شدید بغض رکھتا ہے، ان پر تبرا بکتا ہے، اور اہل سنت والجماعت کا سخت دشمن ہے۔

نصیری فرقہ خصوصا سوریہ کے ساحلی علاقوں میں آباد ہوا، اس فرقہ نے شروع سے ہی فوجی وعسکری قوت پر زیادہ توجہ دی، اس فرقہ کے لوگ سوریا میں بھی آباد ہوئے، لبنان کے علاقہ میں بھی یہ موجود ہیں، طرابلس میں بھی ان کی خاصی تعداد ہے، غرب اناضول جو کہ اسکندریہ کا علاقہ ہے وہاں بھی ان کی ایک بڑی تعداد موجود ہے، اس کے علاوہ فلسطین میں بھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

نصیری فرقہ ابتداء سے ہی اہل سنت والجماعت کا سخت مخالف رہا ہے، بلکہ جب بھی اسے موقع ملا اس نے سنیوں کے خلاف سخت کارروائیاں کی ہیں، عیسائیوں کے ساتھ مل کر اس نے سنیوں پر خوب ظلم ڈھائے، تاتاریوں کی اس نے بھرپور مدد کی، ماضی کی خونچکاں داستاں تو تاریخ میں موجود ہے، ملک شام کی موجودہ خانہ جنگی اسی فرقہ کے ظلم وستم کا شاخسانہ ہے، اس فرقہ کے مشہور لیڈر حافظ الاسد اور پھر بشارالاسد کی بربریت وحیوانیت اور انسانیت سوز واقعات ابھی ذہنوں میں تازہ ہیں۔(۱)

---

(۱) تفصیلات کے لیے دیکھئے: اثنا عشریہ-عقائد ونظریات کا جائزہ اور گھناؤنی سازشیں، از:- فضیلۃ الشیخ ممدوح الحربی (اسلامک یونیورسٹی، مدینہ منورہ)

تیسرا اختلاف

امام باقرؒ کی وفات کے بعد شیعیت میں پھر زبردست اختلافات رونما ہوئے، جس کے نتیجہ میں مختلف فرقے پیدا ہوئے، ایک فرقہ نے کہا کہ امام باقر کو موت نہیں ہوئی، وہ حی لایموت ہیں، ان کے بعد کوئی امام نہیں، وہ دوبارہ تشریف لائیں گے۔ یہ فرقہ ''باقریہ'' کہلاتا ہے۔

ایک فرقہ نے ان کے صاحبزادہ حضرت زکریا کو اپنا آخری امام تسلیم کرلیا، ان کے مطابق حضرت زکریا کسی حاصریہ پہاڑ میں روپوش ہیں، جب حکم ہوگا تو ظاہر ہوں گے، اس فرقہ کو ''حاصریہ'' بھی کہتے ہیں۔

ایک فرقہ محمد ذوالنفس الزکیہ کی امامت کا قائل ہوا جنھیں وہ ''مہدی آخرالزماں'' کا لقب دیتے ہیں۔

ایک فرقہ نے حضرت جعفر صادقؒ کی امامت کو تسلیم کرلیا۔

چوتھا اختلاف

امام جعفر صادقؒ کے انتقال کے بعد پھر اختلافات رونما ہوئے، ایک فرقہ نے کہا کہ وہ آخری امام ہیں، اب کوئی نیا امام نہیں ہوگا، وہ روپوش ہوگئے ہیں، مہدی کی شکل میں ان کا دوبارہ ظہور ہوگا، یہ فرقہ ''ناؤسیہ'' کہلاتا ہے کیونکہ اس فرقہ کے بانی کا نام ناؤس بصری ہے۔

ایک گروہ امام جعفر کے تیسرے صاحبزادہ محمد بن جعفر کی امامت کا قائل ہوا، یہ فرقہ ''سمیطیہ'' کہلاتا ہے۔

فرقہ افطحیہ امام جعفر کے چوتھے صاحبزادہ عبداللہ بن جعفر الافطح کی امامت کا قائل ہوا۔

ایک جماعت نے امام کاظم حضرت موسیٰ بن جعفر بن محمدؒ کو اپنا امام تسلیم کرلیا۔

اسماعیلی فرقہ

امام جعفر صادق کے پانچ صاحبزادے تھے: اسماعیل، عبداللہ، موسیٰ، اسحٰق، محمد۔ امام جعفر سے منسوب ان کا یہ قول تھا کہ "ان هـذا الأمر فی الأکبر مالم یکن به عاهة" یعنی امامت بڑے بیٹے میں ہی رہے گی تا آنکہ اس میں کوئی عیب نہ ہو۔ چنانچہ ایک فرقہ نے ان کے سب سے بڑے صاحبزادہ حضرت اسماعیلؒ کو اپنا امام تسلیم کرلیا، یہ فرقہ انھیں امام مہدی بھی جانتا ہے۔ حضرت اسماعیل کا انتقال اپنے والد کی موجودگی میں ہی ہوگیا تھا جسے کچھ لوگوں نے ماننے سے انکار کیا اور کچھ نے حضرت اسماعیل کے صاحبزادہ حضرت محمدؒ کو اپنا امام تسلیم کرلیا، یہ فرقہ "اسماعیلی" کہلاتا ہے۔ اس فرقہ کا بانی عبداللہ میمون تھا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ امام جعفر صادق کے صاحبزادہ اسماعیل کی خدمت میں رہتا تھا، جب اسماعیل کا انتقال ہوگیا تو اس نے ان کے بیٹے محمد کی ہم نشینی اختیار کرلی۔

اسماعیلی فرقہ پانچ مختلف فرقوں (۱-قرامطہ، ۲-مبارکیہ، ۳-مقنعیہ، ۴-بابکیہ، ۵-مہدویہ) میں تقسیم ہوا جن کی متعدد شاخیں بھی نکلیں ہیں، ان فرقوں میں قرامطہ اور مہدویہ نے زیادہ شہرت پائی، اور خاص کر مہدویہ سے مختلف شاخیں وجود میں آئیں پھر ان شاخوں کے مابین بھی اختلافات رونما ہوتے رہے۔ آج بھی مختلف فرقے اسماعیلی نام سے جانے جاتے ہیں وہ دراصل اسی مہدویہ کی مختلف شاخیں ہیں، اور ان شاخوں کے مابین زبردست اختلافات بھی موجود ہیں۔

قرامطہ

سرزمین کوفہ میں ایک شخص حمدان نامی تھا، اس کی ٹانگیں چھوٹی ہونے کی وجہ سے اس کا لقب "قرمط" تھا، اس کا دعویٰ تھا کہ وہ محمد ابن اسمٰعیل کے بیٹے عبیداللہ کا نائب ہے، اس نے سیاسی محاذ پر خوب محنت کی، اور اپنے متبعین کی ایک جماعت تیار کرلی،

اس کے ماننے والے اس کی نسبت سے ''قرامطہ'' کہلائے۔

قرمط نے شروع سے ہی لوٹ مار کا پیشہ اختیار کیا، عراق، شام اور بحرین میں خوب دراندازیاں کیں، انھوں نے ہجر (دارالسلطنت بحرین) کو اپنا مرکز بنایا اور مختلف علاقوں میں اقتدار بھی حاصل کیا، قرامطہ کے دور اقتدار میں ان کا ایک سردار ابوطاہر تھا، اس نے ۳۱۷ھ میں اچانک مکہ معظّمہ پر حملہ کردیا، سیکڑوں حاجیوں کو شہید کردیا، بیت اللہ کا دروازہ اکھیڑ دیا، مقتولین کی لاشیں چاہ زمزم میں پھینک دی، غلاف کعبہ کو اتار کر اپنے لشکر میں تقسیم کردیا، اور حجر اسود کو اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے گیا اور اعلان کردیا کہ اگلے سال سے حج اس کے یہاں ہوا کرے گا، تقریباً بیس سال تک حجر اسود قرامطہ کے قبضہ میں تھا، بالآخر خلیفہ مطیع اللہ کے زمانہ میں ۳۳۹ھ کو حجر اسود قرامطہ سے حاصل کر کے اس کی سابقہ جگہ پر نصب کیا جاسکا۔(۱)

حمدان قرمطہ غالی شیعہ تھا، وہ محمد ابن الحنفیہ ابن علی ابن ابی طالب کو رسول کہتا تھا، چنانچہ اقتدار ملنے کے بعد اذان میں یہ الفاظ بڑھوا دیے: ''اشھد ان محمد بن الحنفیۃ رسول اللہ'' (میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ابن الحنفیہ اللہ کے رسول ہیں) بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا، دن رات میں صرف دو نمازیں باقی رکھیں، یعنی دو رکعت طلوع آفتاب سے پہلے اور دو رکعت غروب آفتاب کے بعد، اسی طرح سال میں صرف دو روزے فرض رکھے۔ حمدان کے بعد جانشینی کو لے کر مختلف دعویدار سامنے آتے رہے اور قرامطہ شیعہ بھی کئی گروہ میں بٹتے رہے۔

مہدویہ

مہدویہ فرقہ کی نسبت ابومحمد عبداللہ (فاطمی سلطنت کا بانی) کی طرف ہے جس کے متبعین اسے مہدی بھی کہتے ہیں، اسی کی نسبت سے یہ فرقہ مہدویہ کہلاتا ہے، ایک لمبے عرصہ تک یہ فرقہ حکومت و اقتدار کا مالک رہا، مہدی کا آٹھواں جانشین ابوتمیم معد

(۱) تاریخ اسلام: ۲/ ۵۰۰، از: اکبر شاہ نجیب آبادی

مستنصر باللہ گذرا ہے، مستنصر کے دو بیٹے تھے، بڑے کا نام المصطفی لدین اللہ تھا جس کا لقب ''نزار'' ہے اور دوسرے کا نام ابوالقاسم احمد تھا اور لقب ''مستعلی باللہ'' تھا، یہ دونوں اپنے مسلک کے زبردست داعی تھے، نزار کے پیروکار کو ''نزاریہ'' کہتے ہیں، اور جن لوگوں نے مستعلی کی امامت کو تسلیم کیا وہ ''مستعلیہ'' کہلاتے ہیں۔

حسن بن صباح

حسن بن صباح ''نزاریہ'' فرقہ کا داعی تھا، اس نے ناقابل فتح سمجھے جانے والے قلعہ الموت کو اپنی چال بازی سے حاصل کرلیا، جہاں اس نے باقی زندگی گذاردی، اس قلعہ میں محصور ہوکر اس نے سیاسی تدبیریں کیں اور ایک مضبوط حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوا، اسے ''شیخ الجبل'' بھی کہا جاتا تھا۔ اس نے ایک مصنوعی جنت بنوائی تھی، جس میں اس کے فدائیوں کو ''حشیش'' کھلا کر داخل کیا جاتا، انھیں جنت کا احساس دلایا جاتا اور کہا جاتا کہ اس سے بھی خوبصورت جنت تمہارے انتظار میں ہے، بس تم فلاں شخص کو قتل کردو، ان فدائیوں کو ''حشاشین'' کہتے تھے، جن کے ذریعہ حسن بن صباح نے بہت سے بادشاہ وامراء کو قتل کرایا، ان میں خواجہ نظام الملک طوسی، وزیر اعظم سلطان الپ ارسلان، ملک شاہ سلجوقی، سلطان شہاب الدین غوری، اور یورپ کے بعض مسیحی سلاطین خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ سلطان صلاح الدین ایوبی اور امام فخر الدین رازی کو بھی اس نے قتل کرانے کی کوششیں کیں لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکا۔

حسن بن صباح نے عام باطنیوں کے خلاف اعمال وعبادات میں نئے نئے طریقے بھی ایجاد کیے، اس کے تمام مریدین اس کو ''سیدنا'' کہا کرتے تھے، اس کی سازشوں اور جنگی تدبیروں کی وجہ سے نزاریوں کو خاصی تقویت ملی، اور قہستان میں ۴۸۳ھ سے ۶۵۵ھ تک تقریباً پونے دوسوسال اسماعیلی نزاری حکومت قائم رہی۔

آغا خانی/خوجہ فرقہ

حسن بن صباح کے مرنے کے بعد اس کے جانشین اس کی حکومت کو سنبھال نہ سکے، اوران کے ہاتھوں سے پہلے "قلعة الموت" گیا اور پھر حکومت بھی چھن گئی، جس کے نتیجہ میں نزاری کمزور پڑ گئے، سیاسی مسائل سخت ہو گئے، کچھ نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا اور زیادہ تر ایران منتقل ہو گئے اور زیر زمین اپنے مذہب کی اشاعت میں مصروف ہو گئے، اکثر درویشوں کی وضع میں رہتے تھے اور پوری تندہی کے ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کرتے تھے، ایران میں پہلے سے امامی شیعہ موجود تھے، نزاریوں کی دعوت وتبلیغ سے دونوں کے مابین زبردست کشمکش کا سلسلہ شروع ہوا، بالآخر نزاریوں کو زبردست شکست اٹھانی پڑی اور امامی شیعوں نے ان کے آخری امام خلیل اللہ علی کو قتل کردیا، اس پر نزاریوں نے زبردست احتجاج کیا، بادشاہ فتح علی شاہ نے قاتلوں کو موت کی سزادی اوران کے بیٹے حسن علی کو "آغا خاں" خطاب دے کر زبردست پذیرائی کی، خطاب ملنے کے بعد آغا خان ہندستان آگئے اور اس طرح نزاری امامت "آغا خاں" کے نام سے یہاں منتقل ہوگئی۔

ہندستان کے اسماعیلی خوجے اسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور آغا خاں کو اپنا امام مانتے ہیں اسی وجہ سے آغا خانی بھی کہلاتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ آغا خاں امام اور خدا کے قائم مقام ہیں، ان میں حضرت علیؓ کا نور ہے، یہ لوگ اپنی دعاؤں میں سترہ مرتبہ امام حاضر کا نام لیتے ہیں، اور ہر دفعہ جب امام کا نام آتا ہے تو سجدہ کرتے ہیں، ان کے امام کو سونے میں تولا جاتا ہے، ان کی عبادت گاہ کو "جماعت خانہ" کہتے ہیں، یہ تین وقت کی نماز کے قائل ہیں، اس فرقہ کے ماننے والے ہندستان، ایران، افغانستان، شام ومصر اور شمالی افریقہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔(۱)

---

(۱) دیکھئے: حقیقت مذہب شیعہ، از: حکیم فیض عالم صدیقی، مرکز اشاعت دین اسلام (لاہور)

بوہرہ

مستعلی باللہ کے ماننے والے ''مستعلیہ'' کہلاتے ہیں، ہندستان میں بوہروں کا تعلق اسی فرقہ سے ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ مہدی کے دسویں جانشین آمر باحکام اللہ کے صاحبزادہ ابوالقاسم طیب سات سال کی عمر میں غائب ہوگئے تھے، چونکہ وہ غائب ہوگئے اس لیے ان کے بعد امامت کا سلسلہ منقطع ہوگیا البتہ امام کی جگہ دعاۃ کا سلسلہ شروع ہوا جو امام کا وارث ہوتا ہے۔

ساتویں صدی ہجری میں مستعلیہ فرقہ کے دو مبلغ ملا عبداللہ صاحب اور ملا احمد صاحب ہندستان پہنچے اور کھمبائیت کے ساحل سے دعوت وتبلیغ کا کام شروع کیا، جس کے نتیجہ میں کچھ لوگوں نے ان کے مذہب کو اختیار کرلیا، فی الحال ان کا مرکز سورت کا علاقہ ہے۔(۱)

بوہرہ کے لفظی معنی تجارت کرنے والے کے ہیں، چونکہ اس قوم نے تجارت کے پیشہ میں خاصی ترقی کی اس لیے انھیں بوہرہ کہا گیا، یہ لوگ ایک ملاّ کے ماتحت ہوتے ہیں جو ''موٹو ملا'' یا ''ملائے اعظم'' کہلاتا ہے، پوری بوہرہ قوم ہر قسم کے صدقات وزکاۃ کا روپیہ ملائے اعظم کے پاس بھیجتے ہیں، جو بیت المال میں جمع ہوتا ہے اور پھر ملا کی حسب ہدایت تقسیم ہوتا ہے، ملا طاہر سیف الدین نے اپنی وسیع المشربی اور رفاہ عامہ کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل کی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر بھی رہے، ان کیجانشین ان کے صاحبزادہ ملا برہان الدین اور پھر ان کے صاحبزادہ سیدنا مفضل سیف الدین بوہروں کے قائد ہیں، اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر بھی ہیں۔

اس فرقہ میں دعوت کی صدارت کے سلسلہ میں اختلافات پیدا ہوئے، جس کے نتیجہ میں مزید کئی فرقے وجود میں آئے جیسے داؤدیہ، سلیمانیہ، علیہ، اور مہدی باغ وغیرہ۔

---

(۱) تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: سفرنامۂ حجاز، از: قاضی سلیمان منصور پوریؒ

آغا خانی اور بوہرہ؛ یہ دونوں فرقے سرمایہ دار اور مادہ پرست ہیں، ان کے مابین بنیادی فرق یہ ہے کہ آغا خانی فرقہ ہر دور میں اپنے امام کا موجود ہونا تسلیم کرتا ہے جبکہ بوہرہ فرقہ اپنے امام کو مخفی اور اس کے نائب وداعی کو ظاہر مانتا ہے۔ بوہرہ فرقہ کے لوگ کولمبو، سنگھاپور، عراق، اور دارالسلام وغیرہ میں پائے جاتے ہیں(۱)

بابیہ اور بہائی

شیعوں کے امام غائب کے بعد کچھ لوگوں نے امام اور عوام کے درمیان سفارت کی ذمہ داری ادا کی، انھیں ''باب'' یعنی امام غائب تک پہنچنے کا دروازہ کہا جاتا ہے، یہ اصطلاح حضرت علی سے متعلق اس حدیث سے ہے کہ: "أنا مدينة العلم وعلي بابها" (میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں)(۲)

ایران میں باطنی فرقہ کے لوگ آباد تھے، ان کا یہ عام عقیدہ تھا کہ امام غائب مہدی اور مومنین کے درمیان رابطہ کے لیے ایک زندہ باب کی ضرورت ہے، مختلف اوقات میں مختلف لوگوں نے باب ہونے کا اعلان کیا، اس طرح ''بابیت'' کے عقیدہ کو خاصا فروغ حاصل ہوا، تیرہویں صدی کے وسط میں محمد علی نامی شخص نے باب ہونے کا دعویٰ کیا، جب اس میں کامیابی ملی تو مہدی پھر حامل نبوت اور پھر مظہر الوہیت ہونے کا دعویٰ کیا، اس کے ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہوگئی۔

محمد علی کے انتقال کے بعد اس کے دو مریدوں نے جو بھائی تھے جانشینی کا دعویٰ کیا، ایک کا نام تھا مرزا حسن علی جس کو باب نے صبح ازل کا خطاب دیا تھا، اور دوسرا بہاء اللہ کے لقب سے ممتاز ہوا، دو دعویداروں کی وجہ سے فرقہ بابیہ مزید دو حصوں میں تقسیم ہوگئی، صبح ازل کی اقتداء کرنے والے ''ازلی'' کہلائے، اور بہاء اللہ کو ماننے والے ''بہائی'' کہلائے، اور جس نے ان دونوں کی جانشینی کا انکار کیا وہ ''بابیہ'' کہلائے۔

---

(۱) تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: خمینی ازم اور اسلام، از: ابو ریحان فاروقی، اور "الفرقة الناجية في الاسلام" از: آیۃ اللہ سید علی رضوی گوپال پوریؒ (۲) المستدرك على الصحيحين: ٤٦٣٧

ازلی فرقہ بہت کم پھل پھول سکا اور رفتہ رفتہ فنا ہوگیا، لیکن بہائی فرقہ ترقی کرتا گیا، جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس نے ہر مذہب اور ہر فرقہ کے اصول کو سمجھ کر اس کے مطابق اپنے دعویٰ کو مرتب کیا، عیسائیوں سے وہ عیسائیت کی تعلیم کے ساتھ ملتا، پارسیوں سے پارسیت کی باتیں کرتا، سنیوں سے ان کے عقیدے کے مطابق بات کرتا اور شیعوں سے شیعیت کے ساتھ خود کو روشناس کراتا، اور ساتھ ہی اپنے معاشرتی خیالات کو بھی ظاہر کرتا اس طرح اس نے ایک ایسا مذہب تیار کرلیا جس میں ہر مذہب سے اس کے عقائد کے متعلق گفتگو کی جانے لگی، رفتہ رفتہ اس نے اپنے دعوں میں تبدیلی پیدا کرنی شروع کی، پہلے اس نے باب کے خلیفہ ہونے کا دعویٰ کیا، پھر مہدی، پھر حامل نبوت اور پھر مظہر الوہیت کا دعویٰ کیا، اور بالآخر ۱۸۵۲ء میں وہ ایک ایسے دین کا داعی بنا جس کی نسبت اس نے اعلان کیا کہ یہ دین تمام ادیان و مذاہب کا ناسخ ہے، تمام مذاہب اپنے اپنے وقت میں حق پر تھے لیکن اب میرے دین کے بعد سارے ادیان منسوخ ہو چکے ہیں۔ اس طرح پرانی ''باطنیت'' کو ''بہائیت'' کے نئے نام سے آشکارا کیا۔(۱)

پانچواں اختلاف

امام موسیٰ کاظم کی وفات کے بعد شیعوں میں پھر کچھ نئے فرقوں نے جنم لیا، ایک گروہ نے دعویٰ کیا کہ انتقال کے فوراً بعد وہ زندہ ہوکر کہیں روپوش ہوگئے، خاص لوگ ان کی زیارت کرتے ہیں، وہ انھیں ہدایات دیتے ہیں، وہ دوبارہ ظاہر ہوں گے اور زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے، ان لوگوں کو ''رجعیہ'' کہا جاتا ہے۔

ایک گروہ نے کہا کہ ان کا انتقال تو ہوگیا لیکن دوبارہ امام مہدی کی شکل میں پیدا ہوں گے۔

ایک گروہ نے کہا کہ ان کا انتقال ہوگیا، اللہ نے انھیں آسمان پر بلالیا، آخری

---

(۱) تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: اسلام اور بہائیت، از علامہ سید سلیمان ندویؒ

زمانہ میں ان کو دوبارہ بھیجیں گے۔

یہ چاروں فرقے ''واقفہ'' کہلاتے ہیں، ان کے عقیدہ کے مطابق امام موسی کاظم پر امامت ختم ہوگئی، اب امام مہدی کی شکل میں وہی دوبارہ آئیں گے۔

ایک فرقہ نے کہا کہ ہمیں معلوم نہیں کہ امام موسیٰ کاظم زندہ ہیں یا وفات پاگئے، ہم ان کے مہدی موعود ہونے کا انکار بھی نہیں کرسکتے، اور چونکہ موت برحق ہے اس لیے ہم ان کی زندگی یا موت کا فیصلہ کیے بغیر انھیں آخری امام تسلیم کرتے ہیں۔

ایک فرقہ نے امام موسیٰ کاظم کے لڑکے احمد بن موسیٰ کو اپنا امام تسلیم کیا، یہ فرقہ ''احمدیہ'' کہلاتا ہے۔

اسی دوران محمد بن بشیر نامی شخص نے دعویٰ کیا کہ امام موسیٰ کاظم روپوش ہیں، اس کی ان سے ملاقات ہوتی ہے، انھوں نے اسے اپنا جانشین مقرر کیا ہے، جن کے توسط سے وہ اپنے شیعوں سے رابطہ میں رہیں گے، دلیل کے طور پر اس نے امام کاظم کا جعلی خط بھی پیش کیا، بہت سے شیعوں نے اس کی بات مان لی، اور وہ فرقۂ بشریہ کہلائے۔

ایک فرقہ نے ان کے صاحبزادہ حضرت علی رضاؒ کو اپنا امام تسلیم کرلیا۔

چھٹا اختلاف

امام علی رضاؒ کے بعد شیعوں کے عقیدۂ امامت کو زبردست دھچکا لگا، کیونکہ ان کے صاحب زادہ محمد بن علی (المعروف بہ امام جواد) اس وقت صرف سات سال کے تھے، اس لیے اگلے امام کو لے کر شیعہ انتشار کا شکار ہوئے۔

ایک فرقہ نے کہا کہ امام علی رضاؒ پر امامت کا سلسلہ مکمل ہوگیا، اگر ان کے بعد امامت کو آگے چلنا ہوتا تو وہ نابالغ جانشیں چھوڑ کر کیوں جاتے؟!

کچھ لوگوں نے امام رضا کے بعد عقیدۂ امامت کو ہی خیر باد کہہ دیا، اور انھوں نے مرجئی مذہب اختیار کرلیا۔

ایک فرقہ نے اپنے امام کے اس سلسلہ کو چھوڑ کر زیدی مذہب اختیار کرلیا۔

ان فرقوں کا کہنا تھا کہ نابالغ کی امامت جائز نہیں، کیوں کہ نابالغ احکام شریعت کا مکلّف نہیں ہوتا، وہ نہ لوگوں کے درمیان فیصلے کرسکتا ہے، نہ شریعت کی تعلیم دے سکتا ہے۔ چونکہ امام عالم الغیب ہوتا ہے، اور اگر امامت کو آگے چلنا ہوتا تو امام علی رضاؒ اپنے بعد کسی نابالغ کو نہ چھوڑتے۔

ایک فرقہ نے کہا کہ امام جواد اگرچہ نابالغ ہیں لیکن وہ امام زادہ ہیں، اس لیے امامت ان کا حق ہے، پس انھوں نے مجبوراً ایک نابالغ کو اپنا امام تسلیم کرلیا۔

ساتواں اختلاف

امام جواد محمد ابن علی کے بعد ان کے صاحبزادہ علی ہادیؒ ان کے جانشیں ہوئے جو کہ صرف چھ سال کے تھے، لیکن جن لوگوں نے امام جواد کو ان کی نابالغی میں امام تسلیم کرلیا تھا انھوں حضرت علی ہادی کو بھی اپنا امام تسلیم کرلیا، اس سلسلہ میں کوئی بہت بڑا اختلاف رونما نہیں ہوا، اور شیعیت کی تاریخ میں یہ دوسری مرتبہ ہوا جب انھیں کسی نابالغ کو اپنا امام تسلیم کرنا پڑا۔

البتہ ایک گروہ نے امام جوادؒ کے بھائی موسیٰ بن محمدؒ کی امامت کو تسلیم کیا، لیکن کچھ عرصہ بعد امام علی ہادی جب بالغ ہوگئے تو اس گروہ نے بھی ان کو اپنا امام تسلیم کرلیا۔

آٹھواں اختلاف

امام ہادی علی کے انتقال کے بعد شیعیت میں ایک زبردست بھونچال آیا، امام علی ہادی کے بعد ان کے صاحبزادہ محمد بن علی کا اگلے امام کی حیثیت سے تعین ہو چکا تھا لیکن اتفاق کہ محمد بن علی کا انتقال ان کی زندگی میں ہی ہوگیا۔

چنانچہ امام علی ہادی کے بعد ایک فرقہ نے کہا کہ محمد بن علی (جن کا انتقال ہو چکا تھا) ہی ان کے اگلے امام ہیں، اور چونکہ ان کی امامت ان کے والد نے طے کی تھی اور

امام نہ جھوٹ بولتا ہے اور نہ اس سے سہو ہو سکتا ہے، اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ ان کا وقت سے پہلے انتقال ہو، بلکہ دشمنوں کے خوف سے ان کے والد نے انھیں روپوش کردیا اور جلد ہی وہ امام مہدی کی شکل میں ظاہر ہوں گے۔

ایک فرقہ نے یہ تو تسلیم کرلیا کہ حضرت محمد بن علی کا انتقال ہو چکا ہے لیکن اسے انھوں نے خدا کی غلطی قرار دیا کہ یہاں خدا سے بہت بڑی چوک ہوگئی (معاذ اللہ) اس نظریہ کو ''عقیدۂ بداء'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ایک گروہ امام علی ہادی کے صاحبزادہ حضرت جعفر کی امامت کا قائل ہوا۔

ایک فرقہ نے ان امام علی ہادی کے ایک دوسرے صاحبزادہ حضرت حسن عسکریؒ کو اپنا امام تسلیم کرلیا۔

نواں اختلاف

شیعیت کی تاریخ میں یہ سب سے زیادہ سنگین اور ہولناک اختلاف تھا، امام حسن عسکری کا انتقال ہوگیا اور ان کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، گویا شیعہ اماموں کا تسلسل یہاں آکر ٹوٹ گیا، ان کے مرید زبردست انتشار کا شکار ہوئے، اور وہ کم وبیش چودہ فرقوں میں تقسیم ہوگئے۔

ایک فرقہ نے دعویٰ کیا کہ امام حسن عسکری کے بعد ان کے بھائی حضرت جعفر امامت کے مستحق ہیں، اور اس فرقہ نے ان کو اپنا امام بنالیا۔

ایک فرقہ اس بات کا مدعی ہوا کہ امام حسن عسکری کا انتقال نہیں ہوا بلکہ وہ روپوش ہوگئے ہیں، امام مہدی کی شکل میں دوبارہ آئیں گے۔

بعض نے کہا کہ وہ انتقال کر گئے ہیں لیکن وہی امام مہدی ہیں اور پھر سے زندہ ہوکر ظاہر ہوں گے۔

ان فرقوں میں سب سے زیادہ دلچسپ موقف ان لوگوں کا تھا جو اس بات کے

مدعی تھے کہ امام حسن عسکریؒ کا ایک بیٹا بھی ہے جس کی ولادت کو مخفی رکھا گیا ہے، اپنے والد کے انتقال سے تقریبا دس دن پہلے اپنے شہر "سر من رای" (سامرہ) کے ایک غار میں روپوش ہو گئے ہیں، اس وقت ان کی عمر چار پانچ سال کی ہے، وہ اپنے ساتھ امامت کی وہ تمام نشانیاں بھی لے گئے ہیں جو امام حضرت علیؓ سے لے کر امام حسن عسکریؒ تک سبھی اماموں کے پاس تھیں مثلاً حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن، قدیم آسمانی کتابیں، توریت، انجیل، زبور، انبیاء کرام کے معجزانہ تبرکات جیسے عصائے موسیٰ، قمیص آدم، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی وغیرہ وغیرہ۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امام حسن عسکری کے انتقال کے وقت ان کا کوئی لڑکا تو دور کی بات ان کی بیوی یا باندی میں سے کوئی حاملہ بھی نہ تھی، چنانچہ ان کا کوئی وارث نہ ہونے کی وجہ سے ان کی وراثت ان کی والدہ اور ان کے بھائی میں تقسیم کر دی گئی۔

یہ تھا عقیدۂ امامت کا وہ جاں گسل راستہ جسے عبور کرتے کرتے شیعیت انتشار وافتراق کا شکار ہوتی رہی، ہر امام کے بعد نئے نئے فرقہ اور نئے نئے دعوے سامنے آتے، ان کے اثبات کے لیے سازشیں ہوتیں، تلواریں کھنچتیں، اور عزت وناموس پامال ہوتے، ان ہفوات سے شیعوں کا عام معاشرہ بھی بوجھل ہو چکا تھا، یہی وجہ ہے کہ شیعیت امامت کے اس عقیدہ کا بوجھ بارہ اماموں سے زیادہ نہ سنبھال سکی، اور شیعوں نے مجبور ہو کر اس سلسلہ کو اپنے بارہویں "بے نام ونشاں امام" پر ختم کر دیا اور اسے ایک نامعلوم غار میں ہمیشہ کے لیے غائب کر دیا۔ اور پھر مختلف قسم کی روایات اور افسانے گڑھ کر اس کی جانب منسوب کر دیے، جس فرقہ نے بارہ اماموں کو تسلیم کیا وہ فرقہ "اثنا عشریہ امامیہ" کہلاتا ہے۔ (۱)

---

(۱) یہ تمام تفصیلات معروف شیعہ عالم نوبختی کی کتاب "فرق الشیعة" میں موجود ہیں، نیز ملاحظہ ہو: "تحفہ اثنا عشریہ" از: شاہ عبدالعزیزؒ اور "شیعہ سنی اختلافات اور صراط مستقیم" از: مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ

نوٹ

امامت کا عقیدہ شیعیت کا بنیادی رکن ہے، امام کو تسلیم کرنا ان کے ایمان کا اہم جزء ہے، اور امام کے فضائل اتنے ہیں کہ کسی نبی کو بھی وہ مقام حاصل نہیں، ہر امام عالم الغیب ہوتا ہے بلکہ شریعت سازی کا حق بھی رکھتا ہے بلکہ بعض مرتبہ تو وہ اللہ رب العزت کا ہمسر بھی ہو جاتا ہے، اور اللہ تعالی نے جس طرح انبیاء مبعوث کیے اسی طرح اماموں کو بھی مبعوث کرتا رہا، اور سارے امام ناموں کے ساتھ اللہ رب العزت کی طرف سے متعین ہیں، لیکن غور کیجیے کہ اگر یہ عقیدہ درست ہوتا یا عقلی طور پر بھی اسے تسلیم کیا جا سکتا تو کیا ہر امام کی وفات کے بعد ایک نیا فتنہ کھڑا ہوتا؟ اگر ہر امام عالم الغیب تھا اور اپنے بعد کے امام کو اس نے صراحت سے طے کر دیا تھا تو شیعیت اپنے امام کے نام پر اتنے فرقوں میں کیوں بٹتی؟ اور اگر امام کو ماننا لازمی ہے تو خیر القرون کے بعد بارہویں امام پر اس سلسلہ کو کیوں ختم کرنا پڑا؟ اور ہر امام کے ساتھ یہ نظریہ سامنے کیوں آیا کہ وہی امام مہدی ہیں، وہ دوبارہ زندہ ہوں گے، اور ان پر امامت مکمل ہو گئی؟! اور سب سے بڑھ کر امامت کے سلسلہ میں سارے اختلافات کا آغاز خود انہیں اماموں کے گھروں سے پیدا ہوا اور بیک وقت کئی کئی لوگوں نے امامت کا دعویٰ کیا اور ان کے نام پر فرقوں پر فرقے پیدا ہوئے؟!

سچائی تو یہ ہے کہ نہ حضرت علیؓ اس عقیدۂ امامت سے آشنا تھے اور نہ ان کی پاکیزہ ذریت کو اس کی خبر تھی، یہ خودغرض شیعوں کا ''خود تراشیدہ عقیدہ'' ہے جس کی آڑ میں وہ امت مسلمہ میں افتراق وانتشار برپا کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خود ہی فرقوں میں بٹتے رہے اور آپس میں لڑتے رہے، یہ گویا عملی تفسیر ہے قرآن مجید کی اس آیت کی: ﴿إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعاً لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ﴾ (بے شک وہ لوگ جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا وہ خود فرقے فرقے ہو گئے، آپ ان سے بالکل علیحدہ ہیں)

شیعہ اثنا عشریہ امامیہ جعفریہ

عقیدۂ امامت میں شیعیت ابتداء سے ہی اختلاف وانتشار کا شکار رہی، ہر امام کی وفات کے بعد زبردست اختلافات رونما ہوتے، مختلف فرقے پیدا ہوتے اور پھر ان فرقوں کی متعدد شاخیں ظاہر ہوتیں، اس طرح شیعیت میں سو سے زائد فرقے پیدا ہوئے، جن میں اکثر فرقے تو ناپید ہوگئے لیکن کچھ فرقے اپنے مخلص داعیوں اور حکومت کی سرپرستی کی وجہ سے برگ وبار لاتے رہے، انہیں پنپنے والے فرقوں میں ایک فرقہ اثنا عشریہ کا ہے جو اس بات پر عقیدہ رکھتا ہے کہ حضرت علی کے بعد امامت ان کی اولاد میں منتقل ہوتی رہی، اور ابتداء سے ہی اس نے اپنا امام متعین کیا، بالغ امام نہ ہونے کی صورت میں اس نے نابالغ کو ہی اپنا امام تسلیم کرلیا لیکن حضرت علی کے خاندان سے ہٹنے کو گوارہ نہ کیا، اس کا عقیدہ ہے کہ اماموں کی کل تعداد بارہ ہے جن میں آخری امام کم سنی میں روپوش ہوگئے اور قرب قیامت میں ''امام مہدی'' کی شکل میں ظاہر ہوں گے، اور ان سبھی بارہ اماموں کے نام اللہ تعالیٰ نے صراحت کے ساتھ متعین فرمادیے تھے، اس فرقہ کا مکمل نام ''شیعہ اثنا عشریہ امامیہ جعفریہ'' ہے، اس فرقہ کو ''انقلاب ایران'' سے زبردست تقویت ملی، اور آج خاص کر مشرق وسطی میں سنیوں کے خلاف ہونے والی ہر کارروائی کے پس پردہ یہی طاقت سرگرم ہے۔ اس فرقہ کے نام کی وضاحت حسب ذیل ہے:

شیعہ

یہ فرقہ خود کو حضرت علی کا وفادار، ان کا حامی اور مددگار کہلاتا ہے، یہ خلفائے اربعہ میں صرف حضرت علیؓ کی امامت کے قائل اور آنحضور (ﷺ) کی وفات کے بعد حضرت علی کے خلیفۂ بلافصل ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے، حضرت علی سے ان کے دعوائے حب ووفا کی بنیاد پر انھیں ''شیعان علی''، یعنی ''علی کے حامی'' کہا جانے لگا، خود یہ فرقہ

بھی اپنے آپ کو شیعہ ہی کہلاتا ہے۔عصر حاضر میں جب شیعہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو عمومی طور پر اس سے مراد شیعہ اثنا عشریہ امامیہ جعفریہ ہوتے ہیں، آج ایران، عراق، شام، لبنان اور خلیجی ممالک میں یہ فرقہ اکثریت کے ساتھ موجود ہے۔

اثنا عشریہ

چونکہ ان کے نزدیک امامت کا آغاز حضرت علی سے ہوا اور ان کی اولاد میں منتقل ہوتا ہوا بارہویں امام پر ختم ہوگیا، اس لیے انھیں ان کے بارہ اماموں کے عقیدہ کی وجہ ''اثنا عشریہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

امامیہ

شیعوں کی بنیاد امامت کے عقیدہ پر ہے جو کہ ان کے نزدیک اسلام کا پانچواں رکن ہے، اور جس کا مقام و مرتبہ نبوت سے بھی بڑھ کر ہے، اس کا ایمان نہ رکھنے والا کافر کے زمرہ میں شامل مانا جاتا ہے، اس لیے اس فرقہ کو امامیہ بھی کہا جاتا ہے۔

جعفریہ

شیعوں کے بارہ اماموں میں ان کے چھٹے امام حضرت جعفر صادقؒ گذرے ہیں، آپ بہت ہی نیک، باا‌ثر اور اپنے دور کے فقہاء میں شامل تھے، شیعوں نے اپنی کذب وافترا کی فقہ کو آپ کی جانب منسوب کیا اور ''فقہ جعفری'' کے نام سے اسے مشہور کیا، اسی نسبت کی وجہ سے اس فرقہ کو ''جعفریہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

بارہ امام

شیعہ اثنا عشریہ امامیہ جعفریہ نے اپنے لیے جو بارہ امام تجویز کیے ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں:

۱-المرتضیٰ: حضرت علی بن ابی طالبؓ، آپ کی کنیت ابوالحسن ہے، آپ کا لقب

''اسد اللہ ہے، آپ کو ''مرتضیٰ'' کا لقب دیا جاتا ہے، ہجرت سے ۲۳ سال قبل ولادت ہوئی اور ۴۰ ہجری میں شہید ہوئے۔

۲- الزکی؛ حضرت حسن بن علیؓ، آپ کی کنیت ابو محمد اور لقب ''الزکی'' ہے، ۲ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۵۰ ہجری میں وفات پائی۔

۳- الشہید؛ حضرت حسین بن علیؓ، آپ کی کنیت ابوعبداللہ اور لقب ''الشہید'' ہے، پیدائش ۳ ہجری اور شہادت ۶۱ ہجری ہے۔

۴- زین العابدین؛ حضرت علی بن حسین بن علیؓ، آپ کی کنیت ابو محمد اور لقب ''زین العابدین'' ہے، ۳۸ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۹۵ ہجری میں وفات ہوئی۔

۵- باقر؛ محمد بن علی بن حسینؒ، آپ کی کنیت ابوجعفر اور لقب ''باقر'' ہے، پیدائش ۵۷ ہجری اور وفات ۱۱۴ ہجری۔

۶- الصادق؛ حضرت جعفر بن محمد بن علی بن حسینؒ، آپ کی کنیت ابوعبداللہ لقب ''الصادق'' ہے، پیدائش ۸۳ ہجری اور وفات ۱۴۸ ہجری۔

۷- الکاظم؛ حضرت موسیٰ بن جعفر بن محمدؒ، آپ کی کنیت ابوابراہیم اور لقب ''الکاظم'' ہے، پیدائش ۱۲۸ ہجری اور وفات ۱۸۳ ہجری۔

۸- الرضا؛ علی بن موسیٰ بن جعفرؒ، آپ کی کنیت ابوالحسن اور لقب ''الرضا'' ہے، پیدائش ۱۴۸ ہجری اور وفات ۲۰۳ ہجری۔

۹- الجواد؛ محمد بن علی بن موسیٰ، آپ کی کنیت ابوجعفر اور لقب ''الجواد'' ہے، پیدائش ۱۹۵ ہجری اور وفات ۲۲۰ ہجری۔

۱۰- الہادی؛ علی بن محمد بن علی بن موسیٰؒ ، آپ کی کنیت ابوالحسن اور لقب ''الہادی'' ہے، پیدائش ۲۱۲ ہجری اور وفات ۲۵۴ ہجری۔

۱۱- العسکری؛ حسن بن علی بن محمدؒ، آپ کی کنیت ابو محمد اور لقب ''العسکری'' ہے، پیدائش ۲۳۲ ہجری اور وفات ۲۶۰ ہجری۔

۱۲-المہدی؛ محمد بن حسن بن علیؒ، شیعوں کے نزدیک ان کی کنیت ابوالقاسم اور لقب ''المہدی'' ہے، پیدائش ۲۵۵ یا ۲۵۶ ہجری اور تاحال زندہ ہیں، جو امام مہدی کی بن کر ظاہر ہوں گے۔

شیعہ اپنے آخری امام کو امام غائب، امام موعود، امام منتظر بھی کہتے ہیں، جبکہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک حضرت حسن بن علی العسکریؒ کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔

توجہ طلب

یہ بات قابل غور ہے کہ شیعوں کے جتنے بھی امام ہوئے سب کا تعلق شہید کربلا حضرت حسینؓ کی اولاد سے ہے، شیعوں کے کسی بھی امام کا تعلق حضرت حسنؓ کی اولاد سے نہیں ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حضرت حسنؓ نے حضرت امیر معاویہؓ سے صلح کر لی تھی تاکہ مسلمانوں کا خون ضائع نہ ہو، ان کی یہ صلح شیعوں کی مرضی کے بالکل خلاف تھی، اس کا بدلہ انھوں نے اس طرح لیا کہ ان کی اولاد کو اپنی امامت سے محروم کر دیا، اور اعتراض سے بچنے کے لیے یہ شوشہ چھوڑا کہ ان کی کوئی اولاد نرینہ ہی نہ تھی، جس طرح امیر المؤمنین حضرت عثمان ذی النورین کی فضیلت اور دیگر بہت سے اعتراضات سے بچنے کے لیے حضرت فاطمہؓ کے علاوہ آنحضرت (ﷺ) کی دیگر تین صاحبزادیوں کو اہل سنت والجماعت کا ذہنی اختراع ثابت کیا، اسی طرح حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے رشتہ کی مضبوطی کو بے بنیاد ثابت کرنے کے لیے حضرت عمر کی بیوی حضرت ام کلثوم بنت امیر المؤمنین حضرت علی کا صاف انکار کر دیا۔

عہد سفارت

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ جب ان کے گیارہویں امام ۲۶۰ھ میں وفات پا گئے تو ان کا ایک پانچ سالہ بیٹا تھا جس کا نام محمد تھا، ان کی پیدائش ۱۵/ شعبان ۲۵۶ھ کو ہوئی تھی، وہ اپنے والد کے انتقال سے تقریباً دس دن قبل لوگوں کی نگاہوں سے روپوش ہو

گئے، اب وہی ''مہدی موعود'' کی شکل میں دوبارہ ظاہر ہوں گے، اس دوران جتنے بھی فرقے رونما ہوئے سب نے اپنے عقائد ونظریات کی دعوت وتشہیر میں سعی پیہم کی، اور اس کے لیے ہر ممکن طریقہ کو اختیار کیا، جسے بھی کچھ رسوخ حاصل ہوتا یا دعوت وتبلیغ میں جو زیادہ سرگرم ہوتا وہ دعویٰ کرتا کہ وہ امام اور عوام کے درمیان ایک سفیر کی حیثیت سے ہے، امام غائب سے اس کی ملاقات ہوتی ہے، وہ اس سے ہدایات لیتا ہے اور اس کے فرامین عوام تک پہنچاتا ہے، ہر سفیر مرنے سے قبل اپنا ایک جانشین بھی متعین کر دیتا اور سفارت کی ذمہ داری اس کے سپرد کر دیتا، لیکن عقیدۂ امامت کی طرح سفارت کا یہ نظریہ بھی زیادہ لمبے عرصہ تک نہ چل سکا، اور ۳۱۶ھ میں یہ سلسلہ ''خاتم السفراء'' علی بن محمد السمیر ی پر ختم ہو گیا، ان سے قبل عثمان بن سعید العمری، ان کے بیٹے محمد بن عثمان اور حسین بن روح اس منصب پر فائز تھے، اور یہ چاروں ''النواب الخواص'' یعنی خاصے نمائندے کے لقب سے مشہور ہوئے۔

عہد غیبوبت

یہ سفارتی کاروبار جو انتہائی رازداری کے ساتھ چل رہا تھا اس وقت ختم ہوا جب حکام کو اس کی اطلاع ملی اور ان کی طرف سے تحقیق وتفتیش شروع ہوئی کہ یہ کون لوگ ہیں جو اس طرح کا فریب دے کر رعایا اور سادہ لوح عوام کو لوٹ رہے ہیں، حکومت کے حرکت میں آنے سے نظام سفارت میں ایک ہلچل مچ گئی اور حکومتی گرفت سے بچنے کے لیے امام کی غیبوبت کا اعلان کر دیا، اس مدت کو ''غیبت صغریٰ'' کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ۳۲۹ھ میں علی بن محمد السمیر ی نے اپنی وفات سے چند ماہ قبل امام غائب کی دستخط کے ساتھ ایک تحریر پیش کی جس میں لکھا تھا:

"لقد وقعت الغيبة الكبرىٰ فلا ظهور الا بعد أن يأذن الله فمن ادّعى رؤيتي فهو كذاب مفتر" (۱)

---

(۱) اصلاح شیعہ (مترجم) از ڈاکٹر موسیٰ موسویؒ: ۱۱۲۔ شیعہ سنی اختلافات اور صراط مستقیم: ۲۴۷

(غیبت کبریٰ واقع ہوگئی ہے، اب اللہ تعالیٰ کے حکم کے بعد ہی ظہور ہوگا، لہٰذا جو شخص میری رؤیت کا دعویٰ کرے تو وہ جھوٹا اور فریبی ہے۔)

اس تحریر کے بعد سے ''غیبت کبریٰ'' کا دور شروع ہوا اور شیعوں کا اپنے امام سے بالواسطہ یا بلا واسطہ سبھی سلسلہ منقطع ہوگیا، اب اگر کوئی امام غائب کی رؤیت کا دعویٰ کرے تو شیعوں کے نزدیک وہ پکا جھوٹا ہے۔ فی الحال شیعہ حضرات اپنے مزعومہ ''امام موعود'' کی ''غیبتِ کبریٰ'' کے دور میں ہیں، اور پوری شدت سے اس کی آمد کے منتظر ہیں اور اس کے نام کے ساتھ "عجلہ اللّٰہ" (اللہ اسے جلد ظاہر کرے) کا دعائیہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔

الکافی کی تصنیف

شیعوں کے تمام علوم مثلاً عقائد، تفسیر، کلام وغیرہ ان سب کی بنیاد احادیث پر ہے، اور ان احادیث کا پورا ذخیرہ چار کتابوں (۱- الکافی ۲- تهذیب الأحكام ۳- الاستبصار ٤ -من لا يحضره الفقيه) میں تقسیم ہے، یہ چار کتابیں شیعوں کے نزدیک نہایت ہی معتبر اور مستند مانی گئی ہیں جنھیں وہ ''أصح الکتب'' اور ''اصول اربعہ'' بھی کہتے ہیں، ان چار کتابوں میں سب سے اونچا مقام ''الکافی'' کو حاصل ہے۔

الکافی کے مصنف محمد بن یعقوب کلینی ہے جنھیں شیعہ ''ثقة الاسلام'' کا خطاب دیتے ہیں، کلین بروزن اَمیر ایک جگہ کا نام ہے جو مقام رَی (ایران) کے قریب ہے، یہ صاحب وہیں کے رہنے والے تھے، اس لیے ان کو ''کلینی'' کہتے ہیں۔ کلینی شاگرد ہیں علی بن ابراہیم قمی کے اور وہ شیعوں کے گیارہویں امام حضرت حسن عسکریؒ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

شیعوں کا کہنا ہے کہ کلینی نے امام غائب کی ''غیبت صغریٰ'' کا زمانہ پایا ہے، یعنی وہ دور جب امام اور شیعوں کے مابین سلام وکلام کا سلسلہ قائم تھا اور امام کے سفیر شیعوں کے پاس آتے جاتے تھے، محمد بن یعقوب کلینی نے اپنی کتاب اسی آخری سفیر

کے ذریعہ ''سر من رائی'' غار میں روپوش امام کے پاس بھیجی، اور یہ پیغام بھی بھیجا کہ حضور میں نے اس کتاب میں آپ کے آبائے کرام کی احادیث جمع کی ہیں، اگر کوئی روایت اس میں صحیح نہ ہوتو حضور اصلاح فرمادیں۔امام موصوف نے اس کتاب کو اول سے آخر تک دیکھا اور فرمایا:"هٰذا كَافٍ لِشِيُعَتِنَا" یعنی یہ کتاب ہمارے شیعوں کے لیے کافی ہے۔بس اسی وجہ سے اس کتاب کا نام ''الکافی'' رکھا گیا۔اور اسی وجہ سے شیعوں کی چاروں مستند کتابوں میں الکافی کا رتبہ سب سے اونچا ہے۔

الکافی کی پانچ جلدیں ہیں، پہلی جلد کا نام ''اصول الکافی'' ہے،اس میں خاص کر عقائد واخلاق کا بیان ہے، بقیہ تین جلدوں کا نام ''فروع الکافی'' ہےاور آخری جلد کا نام ''روضۃ الکافی'' ہے۔

امام غائب کے ''کارنامے''

شیعوں کو اپنے نجات دہندہ امام آخرالزماں کا شدت سے انتظار ہے ان کا دعویٰ ہے کہ امام مہدی ظاہر ہونے کے بعد پوری دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے اور ایک ایمانی ومثالی حکومت قائم کریں گے،اگر بات یہیں تک محدود ہوتی تو اس پر سنیوں کو کسی بھی طرح کا اعتراض نہ ہوتا، لیکن امام مہدی کے مبینہ کارناموں کو سن کر ہر صاحب عقل وفراست یہی دعا کرے گا کہ خدارا ایسے امام کو ہمیشہ کے لیے غائب ہی کردے اور پوری انسانیت کو ایسے ظالم سے محفوظ فرما۔کیونکہ انہیں شیعوں کو دعویٰ ہے:
''خدا نے حضرت محمد (ﷺ) کو رحمت کے طور پر بھیجا ہے اور ہمارے مہدی کو بدلہ لینے اور عذاب دینے کے لیے بھیجا ہے۔''(۱)

۱-قتل عام

مجلسی لکھتے ہیں:

عربوں سے دور رہو، ان کے لیے بری خبر ہے، ان میں سے کوئی بھی امام

(۱) حیات القلوب:۲/۶۱

قائم سے نہیں بچ سکے گا۔"(۱)

"ہمارے اور عربوں کے درمیان صرف خوں ریزی بچی ہے۔"(۲)

"جب ہمارا مہدی غار سے ظاہر ہوگا تو سب سے پہلے سنیوں کا اور ان کے علماء کا قتل عام کرے گا۔"(۳)

"جب قائم ظہور پذیر ہوگا تو قاتلین حسینؓ کی اولاد کو ان کے آباء واجداد کے اعمال کی وجہ سے قتل کریں گے۔"(۴)

امام مہدی علیہ السلام کافروں سے پہلے سنیوں سے اور ان کے علماء سے کارروائی شروع کریں گے، اور ان سب کو قتل کردیں گے۔(۵)

معاملہ صرف یہیں تک محدود نہیں ہوگا بلکہ یہ کارروائی بھی ہوگی:

حضرت عائشہ کو زندہ کریں گے اور زندہ کر کے ان پر حد لگائیں گے، اور ان سے ہماری فاطمہ کا انتقام لیں گے۔(معاذ اللہ)(٦)

اس کے علاوہ علامہ مفید حضرت جعفر کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

جب قائم آل محمد (ﷺ) میں سے ظہور پذیر ہوں گے تو قریش کے پانچ سو آدمیوں کو زندہ کریں گے اور ان کی گردن ماردیں گے، پھر پانچ سو آدمیوں کو زندہ کریں گے اور ان کی گردن ماردیں گے، اس طرح یہ عمل چھ دفعہ کریں گے۔(۷)

۲-حرمین شریفین کی مسماری

مجلسی کی روایت ملاحظہ ہو:

ان القائم يهدم المسجد الحرام حتىٰ يرده الى أساسه والمسجد

(۱)بحارالانوار:۵۲/۳۳۳ (۲)ایضاً:۵۲/۳۴۹ (۳)حق الیقین:۵۲۷

(۴)تفسیر الصافی، سورہ بقرہ، جلد ۱ صفحہ ۱۷۲ (۵)حق الیقین:۵۲۷

(٦)ایضاً:۱۳۹ (۷)الارشاد للمفید:۳٦۴

النبوی الی أساسه۔"(۱)

(امام قائم مسجد نبوی کو مسمار کریں گے اور اس کو بنیاد تک لوٹا دیں گے، اور اسی طرح مسجد نبوی کو بھی اس کی بنیاد تک پہنچا دیں گے)

''امام قائم پہلا کام یہ کریں گے کہ قبروں سے ان دونوں یعنی ابوبکر وعمر کی لاش کو بالکل تازہ حالت میں نکالیں گے، پھر دونوں کو ہوا میں اڑا دیں گے اور مسجد نبوی کو ڈھا دیں گے۔''(۲)

کیا شیعوں سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخر امام مہدی مسجد نبوی اور خانہ کعبہ کو کیوں مسمار کر دیں گے، بلاشبہ شیعوں کے نزدیک خانۂ کعبہ اور مسجد نبوی سے کہیں زیادہ اہمیت کربلا کو حاصل ہے، اور کربلا کا یہ ٹکڑا پوری روئے زمین پر سب سے زیادہ بابرکت اور افضل ترین ہے، ان کی کتابیں شاہد ہیں کہ امام غائب اپنی آمد کے بعد کربلا کو ہی قبلہ قرار دیں گے اور حجر اسود بھی یہیں لا کر نصب کر دیں گے۔

۳-آل داؤد کی حکومت کا قیام

بنی اسرائیل کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے بعد یہودی دینی ودنیوی قیادت سے محروم کر دیے گئے، اور حالات ناگفتہ بہ ہوتے چلے گئے، بعد میں آنے والے انبیاء نے انھیں ایک مسیح کی بعثت کی یقین دہانی کرائی جو ان کو اس زبوں حالی سے نجات دلائے گا، لیکن جونہی حضرت عیسیٰ مسیح بن مریم کا ظہور ہوا یہودیوں نے انھیں ماننے سے انکار کر دیا کیوں کہ وہ حضرت داؤد وسلیمان کی طرح سیاسی اقتدار کے حامل بادشاہ نہ تھے، آخر کار یہودیوں نے ان کے خلاف سازشیں رچیں اور اپنی دانست میں سولی پر چڑھا دیا، وہ دن ہے اور آج کا دن یہودی قوم اپنے اس مسیح موعود کا انتظار کر رہی ہے جو عظیم طاقتور حکمراں ہوگا، اور اس کی قیادت میں دریائے نیل وفرات کے درمیان پھیلے ہوئے وسیع علاقہ پر ان کا قبضہ ہوگا

(۱) بحار لانوار: ۵۲/ ۳۳۸، الغیبۃ للطوسی: ۲۸۲ (۲) بحار الانوار: ۵۲/ ۳۳۸

جہاں سے پوری دنیا پر حکومت کی جا سکے گی۔

شیعوں کے امام آخر الزماں کا عقیدہ بھی یہودیوں کے مذکورہ عقیدہ سے ماخوذ ہے، اسی لیے ان کے جملہ ائمہ اور خاص کر آخری امام یہودی انبیاء کی تبرکات کا امین اور تورات وانجیل کے علوم میں ماہر ہے، اور امام غائب کی حکومت کا نظام بھی داؤد وسلیمان کی حکومت کی طرح ہی ہوگا۔ چند روایتیں ملاحظہ ہوں:

''امام کی تحویل میں حضرت سلیمان کی انگشتری اور حضرت موسیٰ کا عصا ہے۔''(۱)

حضرت یوسف کی قمیص جو ان کے خاندان بنی اسرائیل میں رہی تھی وہ منتقل ہو کر آخر کار آل محمد کے ورثہ میں پہنچی۔''(۲)

''بارہویں امام دوبارہ ظاہر ہو کر دنیا پر آل داؤد کی سی عقل وفراست اور طور طریق کے ساتھ حکومت کریں گے۔''(۳)

نوٹ

شیعوں کے عقیدۂ امامت کی اصل بنیاد ''امام غائب'' پر ہے، اسی لیے جب بھی کسی امام کا انتقال ہوتا تو اس کے متبعین اسے ''امام غائب'' کا درجہ دیتے اور اس کے دوبارہ ظہور کا اعتقاد رکھتے، ان کے عقیدہ کے مطابق جب امام غائب کا ظہور ہوگا تو سارے اختیارات اور عالمی اقتدار انہیں کے ہاتھ میں ہوگا، وہ دنیا کے سارے اہل سنت والجماعت اور سارے عربوں کا قتل عام کریں گے، یہاں تک جو مر کھپ چکے ہیں انھیں بھی قبروں سے نکال کر پھانسی پر چڑھا دیں گے۔

کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ اہل سنت والجماعت اور عربوں سے اس حد تک نفرت یہودیوں اور مجوسیوں کے علاوہ کسی اور کو بھی ہو سکتی ہے! اور کیا ان روایتوں کو گڑھنے والے یہودیوں اور مجوسیوں کے علاوہ بھی کوئی اور ہو سکتے ہیں؟!

---

(۱) الکافی، کتاب الحجہ، باب ۳۶ (۲) ایضاً: باب ۳۷ (۳) ایضاً: باب ۹۸

شیعوں کا طریقۂ دعوت وتبلیغ

شیعوں نے ابتدا ہی سے اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کی بھر پور کوششیں کیں، اپنا جان ومال اس راہ میں صرف کیا، اور اسے ایک مشن کے طور پر اختیار کیا، یہی وجہ ہے ان کا دعوتی سسٹم خاصی حد تک مرتب ہے، اور اس کے افراد اپنے حدود میں رہتے ہوئے دعوتی کوششوں میں سرگرم ہیں، چنانچہ شیعیت کے عوام وخواص مختلف سات مراتب میں تقسیم ہیں، اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے فکر مند ہیں، تفصیلات حسب ذیل ہیں:

۱- امام؛ جسے پردۂ غیب سے علم حاصل ہوتا ہے، خدا اور بندوں کے بیچ یہی مضبوط رابطہ ہے، سارے طبقے اسی کے دامن سے وابستہ ہیں۔

۲- حجت؛ یعنی وہ ذات جو مخاطب کی رعایت کرتے ہوئے دلائل وبراہین کے ذریعہ امام کے علم کو ثابت کرے۔

۳- ذومصہ؛ مصّ کے معنی ہیں چوسنے کے، اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو علم کو حجت فراہم کرتے ہیں۔

۴- باب؛ یعنی امام اور عوام کے درمیان ربط واتصال پیدا کرنے والے، ان کے لیے دعاۃ کا لفظ بھی مستعمل ہے۔

۵- داعی ماذون؛ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو عہد وپیمان لے کر شیعیت میں شامل کرتے ہیں۔

۶- مکلب یا کلاب؛ یہ وہ لوگ ہیں جن کا بذات خود مقام بہت اونچا ہے لیکن یہ دعوت کے مجاز نہیں ہیں، ان کا کام صرف دلائل یا چرب زبانی کے ذریعہ لوگوں کو داعی کی صحبت میں پہنچانا ہے، ٹھیک اس شکاری کتے کی طرح جو شکار کو ہانک کر لاتا ہے۔

۷- مؤمن؛ یعنی وہ لوگ جو کلب اور داعی کی کوششوں سے امام کی تصدیق کرنے والے اور دل میں امام کی متابعت کا عزم بالجزم رکھنے والے ہیں۔

شیعوں کے ہتھکنڈے

شیعہ اپنے مخاطب کو ورغلانے اور ان کو رام کر کے شیعیت کی طرف مائل کرنے کے بہت سے ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں، اس کی تفصیلات خاصی لمبی ہے کیونکہ اس کا تعلق مخاطب کی نفسیات اور اس کے اردگرد کے ماحول سے ہوتا ہے، تاہم کچھ واضح اور مجرب طریقے ہیں جن کو شیعہ دعاۃ اختیار کرتے رہے ہیں، چند نمونے ملاحظہ ہوں:

☆ عقل وفہم کے ذریعہ مخاطب کی جانچ پرکھ کرنا کہ وہ دعوت کے قابل ہے یا نہیں، اس کے پشت پر سنی عالم کا ہاتھ ہے یا نہیں، ان کے بقول بنجر زمین پہ تخم ریزی نہیں کرنی چاہیے۔

☆ مدعو کو خود سے مانوس کرنا اور اس کے مذاق کے مطابق دلجوئی کرنا، مثلا اگر ایک شخص زہد وطاعت کی طرف مائل ہے تو اس کے سامنے خود کو زاہد ومتقی ثابت کرنا، یا اگر کوئی شخص مال ودولت کا حریص ہے تو اس کے سامنے اس کے فضائل بیان کر کے خود سے مانوس کرنا۔

☆ تشکیک کا طریقہ اختیار کرنا یعنی ایسے موضوعات کو زیر بحث لانا جس کے ظاہر میں اختلافات کی گنجائش ہو، اور عام ذہن حقیقت حال تک نہ پہنچ سکتا ہو، جیسے حضرت علیؓ کے فضائل بیان کر کے خلافت کے موضوع پر بحث کرنا یا فدک کا مسئلہ چھیڑنا یا اہل سنت کے مابین فروعی اختلاف کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا جیسے رفع یدین، قرأت خلف الامام وغیرہ۔

☆ قرآن وحدیث کی من مانی تفسیر کرنا اور اہل سنت کی کتابوں کے حوالے پس منظر سے کاٹ کر پیش کرنا جیسے حضرت علیؓ کی ولایت کی روایت جس کا ایک

خاص پس منظر ہے۔

☆ تدلیس یعنی اہل سنت والجماعت کے ثقہ علماء کے ایسے اقوال یا عبارتیں بیان کرنا جن کے ظاہری مفہوم میں شیعوں کی تائید ہوتی ہو یا ایسی باتیں ان کی جانب منسوب کر کے انھیں شیعہ ثابت کرنا اور پھر شیعیت کی حقانیت کو پیش کرنا مثال کے طور پر زمخشری صاحب کشاف جو کہ تفضیلی و معتزلی ہیں، اخطب خوارزم جو کہ زیدی ہے، ابن الحدید شارح نہج البلاغہ جس نے تشیع اور اعتزال کو جمع کیا، مسعودی صاحب مروج الذہب اور ابوالفرج اصفہانی صاحب کتاب الاغانی یا اس جیسے دوسرے اشخاص کو شیعہ پہلے اہل سنت میں شامل کرتے ہیں پھر ان کے اقوال کے ذریعہ اہل سنت کو ملزم ٹھہراتے ہیں۔

☆ اہل سنت کے علماء و رجال میں سے جس کا نام ولقب ان کے رجال سے ملتا ہے، اپنے رجال کی مرویات، اقوال و اسناد کو ان کی جانب منسوب کرنا، چونکہ دونوں کا نام یا لقب یکساں ہوتا ہے اس لیے سادہ لوح اہل سنت تفریق نہیں کر پاتے، مثال کے طور پر ''سدی'' کے نام سے دو راوی ہیں ایک اہل سنت والجماعت سے اور ایک کٹر شیعہ۔ اسی طرح ''ابن قتیبہ'' کے نام سے بھی دو راوی ہیں، ایک عبداللہ ابن قتیبہ جو اہل سنت میں سے ہیں، اور ''المعارف'' نام سے ان کی کتاب ہے اور دوسرے ابراہیم بن قتیبہ ہے، جو کہ شیعہ ہے اور اس نے بھی ''المعارف'' نام سے کتاب تصنیف کی ہے، اس کے علاوہ محمد بن جریر طبری نام سے بھی دو اشخاص ہیں، ایک محمد ابن جریر بن رستم آملی ہیں جو کہ ''الایضاح والمسترشد در بیان امامت'' کے مصنف ہیں، اور شیعہ ہیں اور دوسرے ابوجعفر محمد بن جریر بن غالب طبریؒ ہیں جو کہ سنی ہیں، اور ''تفسیر ابن جریر'' اور ''تاریخ کبیر'' کے مصنف ہیں۔

☆ معروف و مشہور شعراء کے کلام میں ملاوٹ اور جعل سازی بھی ان کے فریب کا ایک ذریعہ ہے، اس قسم کی حرکت اکثر و بیشتر اہل سنت کے مشہور و مقبول

شعرائے کرام کے کلام میں کرتے ہیں مثلاً شیخ فریدالدین عطار، شمس تبریز، حکیم سنائی، مولانا روم، حافظ شیرازی وغیرہ۔ان کے علاوہ امام شافعیؒ کے ساتھ بھی انھوں نے ایسا ہی سلوک کیا، ان کے اشعار میں ہم وزن وہم قافیہ اشعار کا اضافہ کر کے ان کی جانب منسوب کر دیا، جیسے کہ یہ اشعار:

قف ثم ناد باننی لمحمد　　ووصیه وبنیه لست بباغض

أخبرهم أنی من النفر الذی　　لولاء أهل البیت لیس بناقض

وقل ابن ادریس بتقدیم الذی　　قدمتموه علی علي مارضی

(اس کے بعد یہ بھی پکار کہ میں محمد (ﷺ) ان کے وصی اور وصی کے بیٹوں سے بغض نہیں رکھتا۔اس کے بعد یہ بھی بتادے کہ میں ان میں سے نہیں ہوں جو اہل بیت سے رشتہ توڑنے والے ہیں۔اور یہ بھی کہہ دے کہ ابن ادریس اسے پسند نہیں کرتا کہ علیؓ پر کسی کو ترجیح دے)(۱)

(۱) تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: تحفۂ اثنا عشریہ، از: شاہ عبدالعزیزؒ

تقیہ اور کتمان

تقیہ کا مطلب ہے واقعہ اور حقیقت کے خلاف قول وعمل کو اختیار کرنا، اور اپنے مسلک کے نام پر دوسروں کو دھوکہ وفریب دینا۔ چونکہ شیعہ مذہب کی بنیاد جھوٹی اور گڑھی ہوئی روایتوں پر ہے، اس لیے ان روایتوں میں تضاد واختلاف کا پایا جانا ناگزیر تھا، جس کے نتیجہ میں بہت سے لوگ شیعیت سے متنفر اور تائب ہونے لگے، یہ صورتحال شیعہ علماء کے لیے نہایت سنگین اور باعث تشویش تھی بالآخر انھوں نے تقیہ کی شکل میں اس کا حل نکالا، اور اپنے ائمہ کے حوالہ سے جہاں بھی تضاد بیانی نظر آئی اسے تقیہ پر محمول کردیا، اس طرح شیعیت میں تقیہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہوگئی۔

فریب دہی اور دروغ گوئی دنیا کے ہر مذہب میں ناپسندیدہ عمل ہے، اور ایسا شخص معاشرہ میں کبھی بھی عزت کا حقدار نہیں ہوتا، اسلام میں جھوٹ اور فریب کو کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا ہے، لیکن مذہب شیعہ میں دھوکہ دینا اور جھوٹ بولنا اعلی ترین عبادت ہے، اور اسے دین کا اہم ترین رکن باور کرایا گیا ہے حتی کہ فریب نہ دینے والے اور جھوٹ نہ بولنے والے کو ''بے دین'' سمجھا گیا ہے، اور ہر شیعہ کے لیے یہ اس وقت تک ضروری ہے جب تک ''امام مہدی'' ظاہر نہیں ہوتے اور عالمی قیادت ان کے قدموں میں نہیں آتی۔

معروف شیعی عالم مجلسی نے اپنی کتاب "بحار الأنوار" میں "باب التقية والمداراة" کے عنوان سے ۱۰۹ روایتیں جمع کی ہیں۔ اس کے علاوہ رافضی امام کلینی نے اپنی کتاب "الکافی" میں "باب التقية" کے عنوان سے ایک مستقل باب قائم کیا

ہےاوراس کےتحت ۲۳ روایات درج کی ہیں،اوراس کے بعد "باب الکتمان" قائم کیاہےاور کےضمن میں ۱۶ روایتیں بیان کی ہیں،ان دونوں بابوں میں شیعوں کواپنے دین اورعقیدےکوچھپانےاوردھوکہ وفریب دینے کی ہدایات موجود ہیں۔

تقیہ کیا ہے؟

معروف شیعہ قائد خمینی اپنی کتاب "کشف الأسرار" میں تقیہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"هی أی یقول الانسان قولا مغایرا للواقع أو یأتی بعمل مناقض لموازین الشریعة ، وذلك حفاظا لدمه أو عرضه أو ماله۔"

(تقیہ یہ ہے کہ کوئی شخص ایسی بات کہے جو حقیقت کے خلاف ہو یا ایسا عمل کرے جو شرعی معیار کے منافی ہو،اور یہ صرف اس لیے کہ اس کی جان و مال اوراس کی عزت محفوظ ہوجائے)

مذکورہ تعریف کے مطابق تقیہ صرف اس وقت جائز ہوگا جب جان و مال یا عزت وآبرو کی حفاظت کا مسئلہ ہو،لیکن کلینی حضرت باقرؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

"التقیة فی کل ضرورة وصاحبها أعلم بها حین تنزل به"(١)

"تقیہ ہرضرورت میں ہے،اورضرورت مندخوداس کوبہتر طور پر سمجھ سکتا ہے کہ اسے کب تقیہ کرنا ہے۔"

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شیعہ مذہب میں تقیہ صرف جائز و مباح ہی نہیں بلکہ ضروری اوردین وایمان کا اہم ترین جزء ہے،جیسا کہ امام جعفرؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

"لو قلت ان تارك التقیة كتارك الصلاة لكنت صادقاً، وقال علیه السلام لا دین لمن لا تقیه له "(٢)

---

(١)أصول الكافی:٤٨٤ (٢)من لا یحضره الفقیه، كتاب الصوم:٢/٣١٣

(اگر میں کہوں کہ تقیہ کو ترک کرنے والا ایسے ہی ہے جیسے نماز کو ترک کرنے والا تو میری بات سچ ہوگی، اور آپ نے یہ بھی فرمایا: اس کے دین کا کوئی اعتبار نہیں جو تقیہ نہیں کرتا۔)

تقیہ کی اہمیت

شیعوں کے نزدیک تقیہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ملاحظہ ہو ذیل کی روایتیں:

شیعہ عالم دین نعمۃ اللہ جزائری کے الفاظ ہیں:

”والتقية باب فتحه الله سبحانه للعباد وأمرهم بارتكابه وألزمهم به كما أوجب عليهم الصلاة والصيام حتى انه ورد عن الأئمة الطاهرين عليهم السلام :لا دين لمن لا تقية له۔“ (۱)

(تقیہ کا اللہ نے اپنے بندوں کے لیے ایک دروازہ کھولا ہے، اسے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، اور نماز روزے کی طرح اسے فرض قرار دیا ہے، حتی کہ ائمہ طاہرین سے ثابت ہے کہ جس نے تقیہ نہیں کیا اس کا کوئی دین نہیں)

شیعہ محدث شیخ صدوق اپنی کتاب ”الاعتقادات“ میں لکھتے ہیں:

”تقیہ کرنا فرض ہے، جس نے اسے ترک کیا اس نے گویا نماز کو ترک کیا۔“ (۲)

آگے لکھتے ہیں:

”تقیہ کرنا اس وقت تک فرض ہے جب تک آخری امام غار سے باہر نہیں نکل آتے، اس سے پہلے جو تقیہ ترک کردے گا وہ اللہ کے دین سے اور شیعہ کے دین سے خارج ہوجائے گا، اور اللہ اور اس کے رسول اور اس کے اماموں کی مخالفت کا مرتکب ہوگا۔ امام صادقؒ سے ارشاد خداوندی ﴿ان أكرمكم عند الله أتقاكم﴾ کا مطلب پوچھا گیا تو آپ نے

(۱) الأنوار النعيمية: ۱/۸۲ (۲) الاعتقادات فصل التقية: ۱۱٤

فرمایا: "أعملكم بالتقية" یعنی اللہ کے نزدیک جو جتنا زیادہ تقیہ کرنے والا ہوگا وہ اتنا ہی معزز ہوگا۔"(۱)

تقیہ کے فضائل

شیعوں نے تقیہ کو اس مضبوطی سے پکڑا ہے کہ اس کی فضیلت میں مختلف روایتیں گڑھ گڑھ کر نبی اکرم (ﷺ) اور اپنے جلیل القدر اماموں کی جانب منسوب کر دی ہیں، ملاحظہ ہو:

اللہ کے رسول (ﷺ) پر افتراء کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"وہ مؤمن جو تقیہ نہیں کرتا اس جسم کی مانند ہے جس کا سر کاٹ دیا گیا ہو"(۲)

امیر المؤمنین حضرت علی کی جانب نسبت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"تقیہ کرنا سب سے افضل عمل ہے"۔(۳)

حضرت حسینؓ حوالہ سے بیان کیا گیا:

اگر تقیہ نہ ہوتا تو ہمارے دوست اور دشمن کی تمیز نہ ہو سکتی"۔(۴)

حضرت علی ابن حسین زین العابدینؒ کے نام سے بیان کیا گیا:

"اللہ مؤمن کا ہر گناہ معاف کر دے گا سوائے دو گناہوں کے: ایک تقیہ کو ترک کرنا اور دوسرے حقوق العباد کو ادا نہ کرنا۔"(۵)

حضرت باقرؒ حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

"تقیہ سے زیادہ میری آنکھ کی ٹھنڈک اور کون سی چیز ہو سکتی ہے! تقیہ مومن کی ڈھال ہے۔"(٦)

---

(۱)الاعتقادات فصل التقية:۱۱۵ (۲،۳،۴)تفسیر العسکری صفحہ ۱۶۲

(۵)ایضاً:۱۶۴ (٦) أصول الكافی ،باب التقية

مزید یہ نسبت بھی کی گئی کہ آپ نے فرمایا:

"التقية من ديني ودين آبائي ولا ايمان لمن لا تقية له" (١)

(تقیہ میرا اور میرے آباء واجداد کا دین ہے، جو تقیہ نہ کرے اس کا کوئی دین وایمان نہیں)

جعفر صادقؑ حوالہ سے بیان کیا گیا

"ان تسعة أعشار الدين في التقية ، ولا دين لمن لا تقيه له۔" (٢)

(دین کے دس حصوں میں سے نو حصہ تقیہ میں ہے، اور جو تقیہ نہ کرے اس کا کوئی دین نہیں)

مزید یہ قول بھی منسوب کیا گیا:

''میرے نزدیک روئے زمین پر تقیہ سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں ہے، جو شخص تقیہ کرتا ہے اللہ اسے بلند مقام عطا کرتا ہے اور جو تقیہ نہیں کرتا ہے اللہ اسے ذلیل کر دیتا ہے۔''(۳)

حضرت موسیٰ کاظمؒ سے منسوب ہے کہ انھوں نے اپنے مرید سے فرمایا:

''اے علی ابن سوید! اگر تمیں ہماری طرف منسوب کوئی بات پہنچے تو اس کی تردید نہ کرو اگر چہ وہ خلاف حق ہی کیوں نہ ہو، تم نہیں جانتے کہ جس وقت ہم نے وہ بات کہی تھی اس وقت ہم کس صورت حال سے دوچار تھے، اور اس سے ہماری مراد کیا تھی، جو میں تمھیں لکھ رہا ہوں اس پر عمل کرو، اور کسی کو مت بتانا۔''(۴)

حضرت علی ابن موسیٰؒ سے منسوب روایت میں ہے:

''تقیہ کے بغیر امام کی کوئی حیثیت نہیں، پوچھا گیا کہ اے نواسۂ رسول کب

(٣،٢،١)أصول الكافي ، باب التقية (٤) رجال الكشي، ترجمة علي ابن سويد

تک؟ فرمایا: جب تک ہمارے قائم (امام غائب) ظاہر نہیں ہوں گے، جس نے ہمارے قائم کے نکلنے سے پہلے تقیہ ترک کیا وہ ہم میں سے نہیں'' (١)

اہل سنت کے ساتھ تقیہ

شیعوں کا عقیدۂ تقیہ ہی اہل سنت کی مخالفت کے وجوب کا عقیدہ ہے، ان کی کتابوں میں صراحت ہے کہ اگر ان کے ائمہ نے کوئی بات اہل سنت کی موافقت میں کہی ہے تو وہ تقیہ کے طور پر ہے، اس کے علاوہ ان کے نزدیک حق پہچان ہی اہل سنت کی مخالفت ہی ہے، چنانچہ حضرت جعفرؒ کی نسبت سے یہ بات کہی گئی ہے:

''جب تمہارے پاس دو مختلف روایات پہنچیں تو تم اہل سنت کی مخالف روایات پر عمل کرنا۔'' (٢)

اسی طرح شیعہ حضرات اہل سنت کی آبادیوں کو "دارالتقية" بھی کہتے ہیں، اور ان آبادیوں میں تقیہ اختیار کرنے کو لازم قرار دیتے ہیں، شیعی امام مجلسی کی کتاب ''بحار الانوار'' میں اس کی صراحت ان الفاظ کے ساتھ ہے:

"والتقية فی دارالتقية واجبة" (اور "دارالتقية" میں تقیہ کرنا واجب ہے) (٣)

سنیوں کی آبادیوں کے لیے "دارالتقية" کے علاوہ "دولة الباطل" (یعنی جھوٹ کا شہر) کا لفظ بھی ان کے یہاں مستعمل ہے، چنانچہ مجلسی کی بحار الانوار میں لکھا ہے:

"من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلايتكلم فی دولة الباطل الا بالتقية" (٤)

(جو بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ ''دولة الباطل'' میں جب بھی بات کرے تو تقیہ کرے)

اسی طرح شیعوں کے نزدیک شیعہ سنی کی مخلوط آبادی میں بھی تقیہ کو ضروری قرار

(١) كشف الغمة، از:- اردبیلی صفحہ ٣٤١ (٢) وسائل الشيعة: ١١٨/٢٧، حديث: ٣١ و بحار الأنوار: ٢٣٣/٢ (٣) بحار الانوار: ٤١١/٧٥ (٤) بحار الانوار: ٤١١٢/٧٥

دیا گیا ہے،اس سلسلہ میں شیعوں کے عالم الحر العاملی نے اپنی کتاب وسائل الشیعة میں ایک باب قائم کیا ہے،جس کا عنوان ہے:"وجوب عشرة العامة بالتقية" (عامیوں یعنی اہل سنت کے ساتھ مخلوط آبادی میں تقیہ واجب ہے)

مجلسی کے الفاظ ہیں:

"من صلی خلف المنافقين بتقية كان كمن صلى خلف الامام" (۱)

(جس نے منافقوں یعنی اہل سنت والجماعت کے پیچھے تقیہ کے طور پر نماز پڑھی وہ (اجروثواب میں)اس شخص کی طرح ہے جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی)

اہل سنت کو اس کا بارہا تجربہ اور اس امر کا مشاہدہ ہے کہ شیعوں کے بہت سے لوگ ایک لمبی مدت تک جو بسا اوقات سالوں پر محیط ہوتی ہے بعض سنی افراد کے ساتھ رہ رہ کر گذار دیتے ہیں، مگر اس مدت میں یہ شیعہ کبھی بھی اپنے گھنونے عقائد کا اظہار تک نہیں کرتے، اور موقع ملنے پر اپنا نشتر چلا دیتے ہیں۔ یہ سب اسی عقیدۂ تقیہ کے تحت ہوتا ہے جسے وہ اپنے دین کا اساس تسلیم کرتے ہیں۔

تقیہ کی مثال

بدبخت شیعوں نے اپنے اماموں کو بھی نہیں بخشا ، اوران کی جانب تقیہ کی جو روایتیں منسوب کی ہیں ان سے ان اماموں کی نہ صرف وقعت گھٹتی ہے بلکہ معاشرہ میں سب سے زیادہ ناقابل اعتماد وہی ٹھہرتے ہیں، کیونکہ ایک طرف شیعوں کا عقیدہ ہے کہ امام کو علم غیب بھی ہے، اور وہ قادر مطلق بھی ہیں اور دوسری طرف تقیہ کی بنیاد پر ان کی باتوں میں کھلا ہوا تضاد بھی دکھاتے ہیں، ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ امام کی اطاعت کی جائے اور ان کے کسی حکم کو حتمی سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے؟ کیونکہ ان کی زبان پر کچھ اور ہوتا ہے اور دلوں میں کچھ اور:

---

(۱)المفصل فی أحكام الهجرة: ٤/٥

شیعہ راوی موسیٰ بن اشیم کا کہنا ہے:

''میں امام جعفر صادق کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص آیا اور اس نے آپ سے ایک آیت کا مفہوم پوچھا، امام صادق نے اس آیت کا مفہوم بتا دیا اور وہ شخص چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے بھی اسی آیت کا مفہوم پوچھا، اس بار امام صادق نے اسے پہلے جواب کے برعکس جواب دیا۔ میں حیران ہوا کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں، میرے دل میں مختلف شکوک وشبہات جنم لینے لگے، ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور شخص آیا اور اس نے بھی اسی آیت کا مفہوم دریافت کیا، آپ نے اسے جو جواب دیا وہ پہلے دونوں جوابوں سے بالکل مختلف تھا، بس اسی کے ساتھ میرے دل سے شکوک وشبہات دور ہو گئے اور میں سمجھ گیا کہ یہ سب کچھ ''تقیہ'' کی وجہ سے ہو رہا ہے۔''(۱)

سوال کرنے والا اور مجلس میں حاضر سب شیعہ ہی تھے، نہ جان ومال کا خطرہ نہ عزت وآبرو کی حفاظت کا مسئلہ پھر بھی امام صاحب تقیہ فرما رہے ہیں!

مشہور شیعہ راوی زرارہ بن اعین شیعہ کے تین اماموں حضرت باقر، حضرت جعفر اور حضرت موسیٰ کاظم کے اصحاب میں سے تھا، لیکن شیعوں کے امام جن پر ''اللہ کی وحی'' ہوتی ہے اور جو ''کائنات کے ذرہ ذرہ سے واقف'' ہیں وہ کبھی اسے جنتی قرار دیتے ہیں اور کبھی جہنمی۔ ملاحظہ ہو:

رجال الکشی میں لکھا ہے:

''امام جعفرؒ نے فرمایا: اے زرارہ تیرا نام جنتیوں میں لکھا ہوا ہے۔''(۲)

مزید فرمایا:

''اللہ زرارہ پر رحم کرے، اگر زرارہ نہ ہوتا تو امام باقر کی احادیث کا نام

---

(۱)أصول الكافي: ۱/۱٦۳ (۲)رجال الكشي: ۱۲۲، مطبوعة كربلا، عراق

ونشان تک مٹ جاتا۔“(۱)

ایک طرف زرارہ کی اتنی فضیلتیں اور اس کا اتنا اونچا مقام ہے، لیکن دوسری طرف یہ فرمان بھی ہیں:

”امام جعفر صادق نے فرمایا: اللہ زرارہ پر لعنت نازل فرمائے۔ یہ بات آپ نے تین بار فرمائی۔“(۲)

شیعہ راوی لیث مرادی بیان کرتا ہے:

”میں نے امام جعفر صادق کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ زرارہ گمراہ ہوکر مرے گا۔“(۳)

حضرت جعفر صادق ہی سے روایت ہے کہ انھوں نے کسی مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

”ان ذا من مسائل آل اعين، ليس من ديني ولا دين آبائی۔“ (٤)

(یہ مسئلہ اعین یعنی زرارہ بن اعین کا گھڑھا ہوا ہے اس کا میرے اور میرے پرکھوں کے دین سے کوئی واسطہ نہیں۔)

یہ ایک امام کے اقوال ہیں اس زرارہ کے بارے میں جو شیعہ قوم کا ستون ہے اور جس کو ان کے تین اماموں کی ”صحابیت“ کا ”شرف“ حاصل ہے، اور جس کی بیان کردہ احادیث وروایات پر شیعہ قوم کی بنیاد ہے۔

تقیہ اور شیعوں کے ائمہ کرام

گذشتہ صفحات میں تقیہ سے متعلق شیعوں کے عقائد اور اس کی اہمیت وفضیلت کا تذکرہ ہو چکا ہے، اس ضمن میں شیعوں نے اپنے ائمہ کی جانب بہت سی روایات بھی منسوب کی ہیں، جبکہ سچائی یہ ہے ان کے ائمہ حقیقت میں دینِ حق کا پرتو اور شریعت

(۱،۲) رجال الکشی: ۱۲۳، مطبوعة کربلا، عراق

(۳) رجال الکشی: ۱۲۱ (٤) رجال الکشی: ۱۳۵

محمدی (ﷺ) کے پابند تھے، وہ مسلمانوں کے دینی پیشوا اور اسوۂ نبوی کی عملی تصویر تھے، شیعیت اور شیعوں کے عقائد سے وہ پورے طور پر بری بلکہ اس سے متنفر تھے، لیکن شیعوں نے اپنے مفادات کی خاطر ان کی جانب بہت سی روایتیں منسوب کر دیں، اور آج اسی کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں حالانکہ ان عقائد کے خلاف تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔ اگر تقیہ کی کوئی دینی یا شرعی اہمیت ہوتی تو ان ائمہ کرام کی زندگیوں میں اس کے نمونے ضرور ملتے، لیکن انھوں نے اپنی جان و مال کی پرواہ کیے بغیر ہمیشہ حق کی بات کہی اور ہر طرح کی قربانیاں پیش کیں۔

تقیہ اور حضرت حسنؓ

شیعوں کے دوسرے امام حضرت حسنؓ نے حضرت امیر معاویہؓ سے صلح کی، اور ان کے حق میں دستبردار ہو گئے، ان کا یہ ایک انقلابی اقدام تھا اور اس وقت ان کے حامیوں کی رائے عامہ کے بالکل خلاف تھا۔ صلح کے مخالفین متشدد اور طاقتور تھے، جنھوں نے حضرت حسنؓ کو بہت کچھ کڑوی کسیلی بھی سنائی حتی کہ ایک دن سلیمان ابن صرو نے (جو کہ حضرت علیؓ کے کٹر حامیوں میں شمار کیا جاتا تھا) حضرت حسنؓ کو مخاطب کر کے کہا:

السلام عليك يا مذل المؤمنين! (اے مومنو کو رسوا کرنے والے السلام علیک)

اس موقع پر حضرت حسنؓ چاہتے تو تقیہ کر سکتے تھے، اور اپنے حامیوں سے کہتے کہ میری یہ صلح تو بطور تقیہ ہے، لیکن انھوں نے ہر طرح کی مخالفت کا سامنا کیا اور اپنے موقف پر قائم رہے۔

تقیہ اور حضرت حسینؓ

ان کے بعد دور آتا ہے شیعوں کے دوسرے امام حضرت حسینؓ کا، وہ یزید ابن معاویہؓ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، حسینی تحریک کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ انھوں نے مدینہ میں رہنے کے مشورے کو بھی قبول نہیں کیا اور یزید کی مخالفت کرتے

ہوئے عراق کی جانب سفر کیا، اور شہادت سے قبل ہی ان کو اپنی، اپنے اولاد اور اصحاب کی شہادت کا یقین ہو گیا تھا، چنانچہ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو ایک رات قبل ہی کہہ دیا تھا کہ کل جنگ ہونے والی ہے، اور ممکن ہے کہ میں شہید ہو جاؤں، تم میں سے جو بھی جانا چاہے جا سکتا ہے، اس پوری حسینی تحریک میں کہیں بھی حضرت حسین نے تقیہ نہیں اختیار کیا، اور یہ ایک دینی فریضہ ہوتا تو آپ یزید کے خلاف علم نہ بلند کرتے بلکہ بطور تقیہ اس کی خلافت کو قبول کر لیتے اور اپنی اور اپنے عیال کی جانوں کو محفوظ کر لیتے۔

تقیہ اور علی ابن حسینؓ

پھر تیسرے حضرت علی ابن حسینؓ کا دور آتا ہے جن کا لقب سجاد ہے، یہ وہی ہیں جنھوں نے کربلا کی خونریزی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی، لیکن اپنی سخت بیماری کی وجہ سے اس معرکہ میں شریک نہیں ہو سکے، جنگ کے بعد انھیں بھی گرفتار کیا گیا اور دوسرے قیدیوں کی طرح ان کے ساتھ بھی ناروا سلوک کیا گیا، کربلا کا اندوہناک منظر، ان کے گھر والوں کے ساتھ ذلت آمیز سلوک، اور حضرت حسین کی مظلومانہ شہادت سے ان کا دل پارہ پارہ تھا، سارا منظر ان کی نگاہوں میں ہمیشہ تازہ رہتا، جس کی وجہ سے ان کے آنسو جاری رہتے۔

حضرت علی ابن حسینؓ کے پاس اتنی طاقت نہ تھی جو اموی حکومت کا مقابلہ کرتی لیکن ان کے پاس زبان کی طاقت تھی جس کا وہ پوری طرح استعمال کرتے، اور اموی حکومت کی ناانصافیوں پر کھل کر تنقید کرتے، ایک ساتھ اتنی ساری شہادتیں دیکھنے کے باوجود انھوں نے تقیہ کی راہ نہیں اختیار کی بلکہ کھل کر لسانی معرکہ قائم رکھا اور اپنی علانیہ دعاؤں میں بھی اپنے دل کا حال، حضرت حسینؓ اور ان کے اصحاب کی مظلومیت اور حکومت کی سفاکی کو بیان کیا ہے، ان کی دعاؤں کا مجموعہ ”صحیفۂ سجادیہ“ کے نام سے جانا جاتا ہے جس میں ۵۴ دعائیں درج ہیں، یہ دعائیں اس عظیم ہستی کی ہیں جس نے اس تحریک کا مشاہدہ کیا جو حجم کے اعتبار سے سب سے بڑی، وقت کے

اعتبار سے سب سے مختصر اور اپنی اثر آفرینی کے اعتبار سے صدیوں پر محیط ہے۔

تقیہ اور امام باقر اور امام صادقؒ

پھر امام باقر اور ان کے بیٹے امام صادق کا دور آتا ہے، شیعوں کے نزدیک انھوں نے فقہی مکتب فکر کی بنیاد رکھی جو ''فقہ جعفری'' کے نام سے موسوم ہے، ہر دو امام مسجد نبوی میں درس دیتے تھے اور مسلک اہل بیت کی اشاعت کرتے تھے، حضرت باقر نے اموی خلافت کا زمانہ پایا اور حضرت صادق نے اموی خلافت کا آخری اور عباسی خلافت کا ابتدائی دور دیکھا، خلافت امویہ اور خلافت عباسیہ ان دونوں حضرات سے اختلاف رکھتی تھی، اور ان کے فقہی مکتب فکر کو ناپسند کرتی تھی، لیکن یہ دونوں حضرات بلاخوف وخطر اپنا پیغام پہنچاتے رہے اور بہت سے علماء وفقہاء نے ان سے علم حاصل کیا۔

عجیب بات ہے کہ شیعوں نے حضرت جعفر صادق کی طرف تقیہ کے واجب ہونے کی روایات درج کی ہیں، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ مسجد نبوی میں درس دینے والا جہاں طالب علموں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوتی، اور کسی کی نظر بھر کی بھی دیکھنے کی ہمت نہ ہوتی وہ تقیہ سے کام لے گا، اور کیا اتنا عظیم الشان مدرسہ تقیہ کی بنیاد پر قائم رہ سکتا تھا، اور کیا تقیہ کے ساتھ ان کا ''تفقہ فی الدین'' قابل استناد گردانا جاسکتا ہے؟!

تقیہ اور امام موسیٰ ابن جعفرؒ

امام موسی ابن جعفر جو کہ خلیفہ ہارون رشید کے قریبی رشتہ دار بھی تھے، لیکن وہ ہارون رشید کے حامی نہ تھے، جس کے نتیجہ میں انھیں کئی سال تک جیل میں بھی رہنا پڑا، اگر وہ چاہتے تو تقیہ سے کام لے کر ہارون رشید کی مخالفت ترک کردیتے، اور اس کو خوش کرنے والی باتیں بیان کرتے، اس طرح جیل کی صعوبتیں اٹھانے کے بجائے خلیفہ کے انعامات میں نہال رہتے، لیکن تقیہ ان کے خیال میں بھی نہیں گذرا، اور وہ اعلان حق کرتے رہے اور مصیبتوں پر پوری طرح جمے رہے۔

تقیہ اور امام علی ابن موسیٰ اور امام محمد الجوادؒ

جب خلافت مامون تک پہنچی تو اس نے امام علی ابن موسی کو(جن کا لقب ''الرضا'' تھا) اپنا ولیعہد مقرر کیا، علی رضا شیعوں کے آٹھویں امام ہیں، آپ کی زندگی نے زیادہ مہلت نہ دی اور آپ مامون کے عہد میں ہی انتقال کر گئے۔

امام رضا کے انتقال کے بعد مامون نے اپنی بیٹی ام الفضل کا نکاح امام رضا کے بیٹے محمد الجواد کے ساتھ کر دیا، تاکہ خلیفۂ عباسی اور خانوادۂ علیؓ کے مابین تعلقات استوار رہیں، یہ دونوں امام (امام رضا اور امام محمد الجواد) سیاسی اعتبار سے بڑی مضبوط شخصیتیں تھیں، ایک خلیفہ کے ولی عہد تھے تو دوسرے داماد تھے، اب کوئی انصاف پسند بتائے کیا ان اماموں کو بھی تقیہ کی ضرورت تھی جیسا کہ شیعوں کا دعوی ہے، اور وہ کس سے تقیہ کرنے کی تعلیم دیتے ؟!

امام علیؒ اور امام حسن عسکریؒ

اب امام علی اور ان کے بیٹے امام حسن عسکری کا دور آتا ہے جو کہ شیعوں کے دسویں اور گیارہویں امام ہیں، یہ دونوں امام عباسی خلافت کے پایہ تخت بغداد میں سکونت پذیر تھے، دونوں نے خلیفہ متوکل اور اس کے بیٹے معتصم کا زمانہ پایا تھا، ان کی عمومی مجلسیں ہوا کرتی تھیں، مسلمانوں کی دینی رہنمائی اور مسلک اہل بیت کی اشاعت ہوا کرتی تھی، حکومت کی بے راہ روی پر کھل کر تنقید بھی ہوا کرتی تھی، یہی وجہ ہے کہ حکومت کے جاسوس ان پر پوری نظر رکھتے تھے، لیکن ان دونوں اماموں نے اس کی کبھی پرواہ نہیں کی اور کسی قسم کا تقیہ برتنے کے بجائے اشاعت حق کا فریضہ ادا کرتے رہے۔

ائمہ شیعہ کی حیات کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شیعوں کے نزدیک جس تقیہ کی وجوبی اہمیت ہے اس سے ان ائمہ کا کوئی تعلق نہیں تھا، اور شیعیت کی بنیادوں میں تقیہ کی یہ اینٹ ان کے بارہویں امام کے غائب ہو جانے کے بعد رکھی گئی، جس کا اہم مقصد شیعیت کی بنیادوں کو مضبوط کرنا، اور سنیوں میں شامل ہو کر فتنہ سامانی کرنا تھا

اور اس کے لیے انھوں نے اپنے اماموں کا بھی پوری طرح سے استعمال کیا۔

تقیہ اور نفاق

اگر غور کیا جائے تو تقیہ اور نفاق ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں، شیعہ حضرات اہل سنت کے ساتھ جو شیوہ اپناتے ہیں وہ بالکل منافقین کا شیوہ تھا جس کی طرف اشارہ اس آیت میں ہے:

﴿وَإِذَا لَقُواْ الَّذِينَ آمَنُواْ قَالُواْ آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْاْ إِلَى شَيَاطِينِهِمْ قَالُواْ إِنَّا مَعَكْمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ﴾ (البقرة:١٤)

(اور جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ تنہائی میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ ہیں (ان ایمان والوں سے) تو ہم ہنسی کرتے ہیں)

انسان کے لیے باہری دشمن کے مقابلہ میں اندرونی دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ہے، یہودی اور مجوسی اسلام کے کھلے ہوئے دشمن تھے، اس لیے جب ان کا بس نہ چل سکا تو انھوں نے مسلمانوں کے اندر ہی اپنے ہمنوا پیدا کیے جنھوں نے تقیہ کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں کو اندر سے ہی کمزور کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

آج ہمارے اور شیعوں کے درمیان اتحاد واتفاق میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی تقیہ ہے، یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جو شیعہ قوم کو نفاق کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ اس کو ایک دینی فریضہ گردانتا ہے، وہ اس کے ذریعہ اپنے عقائد کو چھپا کر ہر طرح کے اتحاد کی بات کرتے ہیں، جس سے عام مسلمان دھوکے میں آکر انھیں مخلص سمجھ بیٹھتے ہیں، اور بعض سنی قائدین ''شیعہ سنی اتحاد'' کا نعرہ بلند کرنے لگتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اس اتحاد کا مطلب عقیدۂ ختم نبوت اور عقیدۂ قرآن سے دست بردار ہونا اور عظمت صحابہؓ سے سمجھوتا کرنا ہے، جس کے بعد ایمان کے بقا کی کوئی ضمانت نہیں، اس لیے ایسے ''مخلص شیعوں'' سے ہمیشہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

کتمان کیا ہے؟

کتمان کہتے ہیں اپنے عقیدہ اور مسلک کو دوسروں سے چھپانا اور کسی بھی حال میں اس کو ظاہر نہ کرنا، ہر شیعہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے مذہب اور اپنے عقائد کو دوسروں سے اس وقت تک چھپائے رکھے جب تک ''امام غائب'' کو ظہور نہیں ہو جاتا۔

امام جعفر صادق کے حوالہ سے بیان کیا گیا ہے:

"یا سلیمان! انکم علی دین من کتمه أعزه الله ومن أذاعه أذله الله۔" (۱)

(اے سلیمان! تم ایک ایسے دین پر ہو کہ جو شخص اس کو چھپائے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو عزت عطا ہوگی، اور جو ظاہر و عام کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل و رسوا کرے گا)

امام جعفر صادق کے والد امام باقر کا قول ہے:

"إن أحب أصحابي الي أورعهم وأفقههم وأكتمهم لحديثنا۔"(۲)

(مجھے اپنے اصحاب میں وہ شخص زیادہ پسند ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو، جو دین کو زیادہ سمجھنے والا ہو، اور جو ہماری باتوں کو زیادہ سے زیادہ چھپانے والا ہو)

یعنی جو جتنا بڑا افریبی ہوگا، جتنا بڑا جھوٹا ہوگا اور دین کی باتوں کو جتنا زیادہ دوسروں سے چھپائے گا وہ اتنا بڑا دیندار، مذہب پرست اور اللہ کے نزدیک مقرب ہوگا! کیا عجب تماشا ہے کہ دینداری کا معیار جھوٹ اور فریب ہو!؟ (نعوذ باللّٰہ)

کتمان اور اسلام

اللہ کے رسول (ﷺ) نے فرمایا:

''یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے بات کرو، وہ تمھیں سچا سمجھ رہا ہو مگر تم اس سے جھوٹ بول رہے ہو۔'' (۳)

---

(۱) أصول الكافي، باب الكتمان: ۲/۲۲۲ (۲) أيضاً: ۲/۲۲۳ (۳) أبو داؤد: ٤٩٧٣

اسلام کی نظر میں کتمان یعنی سچ کو چھپانا انتہائی مکروہ، فعل مذموم اور گناہ کبیرہ ہے، ایسا کرنے والا اللہ تعالی کے نزدیک مجرم اور مرتکب حرام ہے، البتہ جب جان و مال کا خطرہ ہو تو اس وقت جھوٹ بولنے کی اجازت ضرور دی گئی ہے، لیکن ایسی صورت میں بھی تاکید کی گئی ہے کہ صریح جھوٹ نہ بولا جائے بلکہ کچھ امالہ سے کام لیا جائے، تاہم ایسے موقعوں پر بھی جھوٹ بولنے کو مناسب نہیں سمجھا گیا ہے بلکہ افضل یہی ہے کہ ایسی صورت میں بھی سچائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، یہی وجہ ہے کہ جو شخص اپنی جان و مال یا عزت وآبرو کی حفاظت میں ہلاک ہوتا ہے اسے شہید کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔

اشاعت حق

شیعوں کے نزدیک مذہب کو چھپانا اور کذب بیانی سے کام لینا ایک مذہبی فریضہ ہے، جبکہ اسلام میں ہر ہر موقع پر حق بات دوسروں تک پہنچانے کی تعلیم دی گئی ہے، اللہ کے رسول (ﷺ) کو اس وقت اعلان حق کا حکم دیا گیا تھا جب مکہ مکرمہ میں حالات نہایت ناگفتہ بہ تھے، مشرکین مکہ زور آور تھے، اور اسلام اپنی کسمپرسی کی حالت میں تھا، اس کے ماننے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ تھی، ایسے حالات میں کہا گیا: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾ (پس جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے آپ اس کا اعلان کر دیں اور مشرکوں کی بالکل پرواہ نہ کریں)

اللہ کے رسول (ﷺ) اپنے چچا ابوطالب سے وضاحت کے ساتھ کہتے ہیں:

"واللّٰه لو وضعوا الشمس في يميني والقمر في شمالي على أن أترك هذا الأمر ماتركته"۔(۱)

(خدا کی قسم اگر اہل مکہ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند لاکر رکھ دیں کہ میں اس فریضہ کو چھوڑ دوں تب بھی میں اس فریضہ کو

---

(۱) دلائل النبوة: ۴۹۱

نہیں چھوڑ سکتا)

ایک دوسرے موقع پر یوں حکم ہوتا ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾ (المائدة: ٦٧)

(اے رسول جو آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اسے دوسروں تک پہنچایئے، اور اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو گویا آپ نے اپنے رب کی رسالت کا حق ادا نہیں کیا)

خود آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا:

"بلغوا عنی ولو آية"(۱)

(میری باتیں دوسروں تک پہنچاؤ گرچہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو)

اور ایسے شخص کو بشارت دیتے ہوئے فرمایا:

"نضّر الله امرأ سمع مقالتی فحفظها ووعاها وأداها كما سمعها"(۲)

(اللہ تعالیٰ اس شخص کو ہشاش بشاش رکھے جس نے میری باتیں سنیں اور پھر اسے دوسروں تک اسی طرح پہنچا دیں)

حجۃ الوداع کے موقع پر اللہ کے رسول (ﷺ) نے صحابہ کرام کو اور ان کے واسطہ سے پوری امت محمدیہ کو یہ ذمہ داری سونپی کہ دین کی باتیں دوسروں تک پہنچائی جائیں، کسی بھی موقع پر آپ نے تقیہ اختیار کرنے یا کسی قسم کی مداہنت برتنے کی کوئی تعلیم نہیں دی، اور اگر صحابہ نے تقیہ سے کام لیا ہوتا اور وہ اپنے دین کو چھپائے رکھتے تو آج دنیا بھر میں اسلام کی جو چلت پھرت ہے وہ نظر نہ آتی، اور پوری دنیا اسلام کی سدا بہار تعلیمات سے، اور دنیا و آخرت کی کامیابی سے ہمکنار نہ ہوتی۔

---

(۱)صحيح البخاری: ۳٤٦١ (۲)سنن ابن ماجة: ۲۳۵

جو لوگ اس دین کو سیکھتے ہیں اور دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں دنیا کے کسی خوف کی پرواہ نہیں کرتے ان کی شان میں فرمان الٰہی ہے:

﴿الَّـذِيْـنَ يُبَـلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَداً إِلَّا اللَّهَ وَكَفَى بِاللَّهِ حَسِيْباً﴾ (الاحزاب:۳۹)

(جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہیں رکھتے اور کفایت کرنے کے لیے اللہ ہی کافی ہے)

کتمان اور یہود

یہودیوں کے جو سنگین امراض تھے ان میں عمومی مرض ''کتمان حق'' بھی تھا، ان کی اس عادت پر اللہ کی جانب سے سخت ناراضگی اور لعنت کا اظہار ہوا ہے، اور یہ صفت شیعوں نے بھی اختیار کی جس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ شیعیت حقیقت میں یہودیت ہی کا ایک بدلا ہوا روپ ہے جس کا مقصد اسلام کو بدنام کرنے کے سوا کچھ نہیں:

﴿إِنَّ الَّـذِيْـنَ يَـكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى مِن بَعْدِ مَا بَيَّـنَّـاهُ لِـلـنَّـاسِ فِيْ الْكِتَـابِ أُولَـــئِكَ يَـلعَنُهُمُ اللّـهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ﴾ (البقرة: ۱۵۹)

(یقیناً وہ لوگ جو ہماری اتاری ہوئی کھلی نشانیوں کو اور ہدایت کو چھپاتے ہیں باوجود یہ کہ ہم نے اس کو لوگوں کے لیے کتاب میں صاف صاف بیان کر دیا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں)

بلا شبہ شیعیت ایک ایسا مذہب ہے جس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں، کیونکہ اسلام تو سراپا اعلان کے لیے ہے، اور خود اللہ تعالیٰ نے اس کے اظہار کا وعدہ فرمایا ہے: ﴿لِيُظْهِـرَه عَـلـى الدِّيْنِ كُلِّه﴾ اس کے برعکس شیعہ مذہب میں اللہ کی جانب سے اظہار کی ممانعت ہے بلکہ اظہار کرنے والے پر خدا کی لعنت ہے۔

شیعہ اور قرآن

ختم نبوت کی بنیادی شرطوں میں سے ہے کہ آخری نبی (ﷺ) کو جو کتاب دی جائے وہ سابقہ کتابوں کی طرح تحریفات وترمیمات کا شکار نہ ہو، اس کے حروف ومعانی قیامت تک محفوظ اور ہر طرح کی کتر و برید سے پاک ہوں، اور ہمیشہ ایک جماعت ایسی ہو جو اس کی تعلیمات کی محافظ اور اس پر عمل پیرا ہو، اگر یہ بنیادی شرط فوت ہوگی تو ختم نبوت کا عقیدہ بھی قائم نہیں رہ سکتا، کیونکہ اس طرح کی تحریفات کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات ابھی نامکمل ہیں اور سلسلۂ نبوت کی تکمیل ابھی باقی ہے، پھر اس اعتراف کے بعد یہ بھی قبول کرنا ہوگا کہ اسلام کا تا قیامت انسانیت کی رہنمائی کا دعویٰ کھوکھلا ہے، اور محمد (ﷺ) کی بعثت نامکمل ونا تمام ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر کچھ دن پر ایک نیا نبی دنیا کے سامنے ظاہر ہوگا، اور اسلامی تعلیمات کے نام پر ہر نئے دن ایک نیا فلسفہ پیش کیا جائے گا، اور مذہب اسلام بازیچۂ اطفال کے سوا کچھ نہ رہے گا۔

شیعوں کا عقیدہ

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ موجودہ قرآن وہ نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہے، بلکہ اس میں تحریفات کردی گئیں اور ایک بڑا حصہ اس میں سے حذف کردیا گیا ہے۔ یہ عقیدہ شیعوں کا اسی طرح کا لازمی عقیدہ ہے جس طرح امامت کا عقیدہ ہے۔

اگرچہ ظاہری طور پر بہت سے شیعہ علماء اس بات کا انکار کرتے ہیں لیکن ان کی کتابوں میں اس کے شواہد موجود ہیں، اس کے علاوہ جو قرآن موجود ہے اس کی من

گھڑت تفسیریں بھی کرتے ہیں، آیات کے مفہوم اور اس کے مدلولات کو یکسر بدل کر پیش کرتے ہیں۔

تیرہویں صدی ہجری کے آخر میں شیعہ مجتہد حسین بن محمد تقی نوری ایرانی نے اثبات تحریف قرآن پر تقریباً ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب مرتب کی جس کا نام ہے "فصل الخطاب فی تحریف کتاب رب الأرباب" اس کتاب میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید میں تحریفات کی گئیں ہیں اور اس کے ثبوت کی روایات دو ہزار سے بھی زیادہ ہیں، انھوں نے عقلی ونقلی دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ قرآن تحریف شدہ ہے، اور وضاحت سے لکھا ہے کہ ہمارے ائمہ معصومین کی دو ہزار سے زائد روایتیں ہیں جو اس بات پر شاہد ہیں کہ موجودہ قرآن میں تحریف ہوئی ہے اور یہی عقیدہ ہمارے علمائے متقدمین کا بھی رہا ہے۔

شیخ طبرسی کے الفاظ ہیں:

"وهی کثیرة جدا حتی قال نعمت الله الجزائری ان أخبار الدالة علی ذلك تزید علی ألفي حدیث وادعی استفاضتها جماعة كالمفيد والمحقق الداماد والعلامة المجلسی وغیرهم بل الشيخ أيضا صرح فی البيان بكثرتها بل ادعی تواترها جماعة۔"(۱)

(تحریف قرآن کی (شیعہ) روایات بہت کثرت سے ہیں، حتی کہ نعمت اللہ جزائری کہتے ہیں کہ تحریف قرآن پر دلالت کرنے والی حدیثیں دو ہزار سے زائد ہیں، علامہ مفید، محقق داماد اور علامہ مجلسی وغیرہ نے ان احادیث کے مستفیض (حد تواتر سے تھوڑا کم) ہونے کا دعوی کیا ہے، خود شیخ طوسی نے تبیان میں اس کی صراحت کی ہے بلکہ ایک جماعت نے ان احادیث کے تواتر تک کی بات کہی ہے)

---

(۱) فصل الخطاب: ۲۲۷

اس سلسلہ میں ملا باقر علی مجلسی لکھتے ہیں:

''مخفی نہ رہے کہ یہ حدیث اور کثیر تعداد میں احادیث صحیحہ قرآن میں نقص اور اس میں تحریف کے سلسلہ میں صریح ہیں، اور میرے نزدیک تحریف قرآن کی روایتیں متواتر المعنی ہیں، اور تمام روایتوں کو ترک کرنے سے فن حدیث سے اعتماد اٹھ جائے گا، بلکہ میرے خیال میں تحریف قرآن کی روایتیں مسئلۂ امامت کی روایتوں سے کم نہیں، اگر تحریف کی روایتوں کا اعتبار نہ کیا جائے تو روایتوں سے امامت کا مسئلہ کیسے ثابت ہوگا؟''(۱)

تحریف قرآن کا پہلا قائل

ہشام بن حکم جہمی وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ دعوی کیا کہ موجودہ قرآن مجید حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں وضع کیا گیا ہے، اور حقیقی قرآن آنحضرت (ﷺ) کے انتقال کے بعد جب سارے صحابہ مرتد ہوگئے تھے آسمان پر اٹھا لیا گیا، یہ شخص عقیدہ تجسیم (یعنی اللہ رب العزت بھی ہماری طرح مجسم ہے) کا بھی قائل تھا۔

ہشام بن حکم کے بعد شیعوں کے معروف شیخ سلیم بن قیس ہلالی نے اپنی کتاب ''کتاب سلیم بن قیس'' میں قرآن مجید کے محرف ہونے اور اس میں کمی بیشی کا دعویٰ کیا، حجاج بن یوسف ثقفی نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا تو وہ فرار ہوکر ابان بن ابی عیاش کے پاس پناہ گزیں ہوا، جب وہ فوت ہونے لگا تو اس نے اپنی کتاب ابان کے حوالہ کردی، لہٰذا اس کتاب کا اکیلا ابان ہی راوی ہے، شیعوں کی یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو منظر عام پر آئی۔(۲)

یہ کتاب بلا اختلاف شیعوں کی اصل بنیاد ہے، امام صادق ابوعبداللہ نے فرمایا:

(۱) مرآۃ العقول شرح اصول کافی ج ۲ ص ۵۳۶- کشف الحقائق: ۱۵۳

(۲) الفہرست لابن ندیم: ۲۷۵

''ہمارے محبین اور ہمارے شیعہ میں سے جس کے پاس سلیم بن قیس ہلالی کی کتاب موجود نہ ہو اس کے پاس ہماری کوئی علمی دستاویز نہیں ہے، یہ کتاب شیعہ کی حروف تہجی ہے، اور آل محمد (ﷺ) کے راز داروں میں سے ایک راز ہے۔''(۱)

متقدمین ومتأخرین علمائے شیعہ

بعض متأخرین علمائے شیعہ نے اہل سنت کی تائید اوران کے عقیدہ کی موافقت کی ہے کہ قرآن مجید تحریف سے پاک اور بالکل محفوظ ہے، لیکن ان کا یہ دعویٰ محض تقیہ کی بنیاد پر اوران کے اغراض پر ہے، ورنہ متقدمین ومتأخرین شیعہ علماء ومحدثین قرآن مجید میں تحریف وتبدیلی اور کتر وبرید کے قائل ہیں، انہیں متقدمین ومتأخرین علماء ومحدثین میں سے چند کے اسماء اوران کی کتابیں حسب ذیل ہے:

الکافی .... از:– محمد بن یعقوب الکلینی

ارشاد العوام ....از :–الکرمانی

ھدیة الطالبین ....از :–الکاشانی

تفسیر قمی ....از:–علی بن ابراھیم القمی

الأنوار النعیمیة .... از :–نعمة اللّٰہالجزائری

تفسیر الصافی ....از:– فیض الکاشانی

الاحتجاج ....از :–ابو منصور طبرسی

بحار الأنوار – مرآة العقول ....از :–محمد باقر مجلسی

أوائل المقالات ....از :–محمد بن النعمان المفید

مشارق الشموس الدریة .... از:– عدنان البحرانی

فصل الخطاب .... از:–نوری طبرسی

(۱)الذریعة الی تصانیف الشیعة: ۱۵۲/۲–نمبر ۵۹۰

منهاج البراعة فی نهج البلاغة....... از :-مرزا حبيب الخوئی

تفسير العياشی ....از :-محمد العياشی

بصائر الدرجات ....از:- ابو جعفر الصفار

حديقة الشيعة ....از :-الاردبيلی

قرآن ناقص وتحریف شدہ ہے

شیعوں کو دعویٰ ہے کہ موجودہ قرآن مجید ناقص ہے، تقریباً تین سو چونتیس (۳۳۴) آیتیں اس میں شامل نہیں ہیں، حضرت جعفر صادق کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے:

ان القـرآن الـذی جاء به جبرئيل عليه السلام الی محمد (ﷺ) سبعة عشر ألف آية۔(۱)

(وہ قرآن جو جبرئیلؑ محمد (ﷺ) پر لے کر نازل ہوئے تھے اس میں سترہ ہزار آیتیں تھیں۔)

اس روایت کے مطابق قرآن مجید کا تقریباً دوتہائی حصہ غائب کر دیا گیا، کیونکہ موجودہ قرآن میں تقریباً چھ ہزار چھ سو چھانچھٹ (٦٦٦٦) آیتیں ہی ہیں۔

مشہور شیعہ مفسر محسن الکاشی اپنی تفسیر ''الصافی'' میں بیان کرتے ہیں:

''تحریف قرآن پر دلالت کرنے والی تمام احادیث اہل بیت سے منقول ہیں، ان تمام روایات سے واضح ہوتا ہے کہ موجودہ قرآن مکمل نہیں ہے جس طرح محمد (ﷺ) پر نازل ہوا تھا، بلکہ آپ (ﷺ) پر نازل ہونے والے قرآن میں تبدیلی کردی گئی، اس قرآن کا کچھ حصہ اصلی قرآن کے مخالف ہے، کچھ تبدیل شدہ ہے، اور بہت سی آیات ویسے ہی نکال دی گئی ہیں، نیز موجودہ قرآن کی آیات کی ترتیب اصلی قرآن کے مطابق نہیں ہے۔''(۲)

ان روایات کا لازمی مفہوم یہی ہے کہ شیعہ قوم موجودہ قرآن مجید کو مکمل نہیں مانتی،

(۱) أصول الكافی كتاب فضل القرآن باب النوادر (۲) تفسیر الصافی، مقدمۂ سادس

اوراس بات کا اعتراف نہ کرنے والا درحقیت تقیہ کا پابند ہے۔ کیونکہ تحریف وتنقیص کی روایت جس کتاب سے ماخوذ ہے وہ ان کے ''امام غائب'' کی تصدیق شدہ کتاب ہے، اور شیعی مذہب کا کوئی فرد امام غائب کی تائید کے خلاف نہیں جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ شیعوں میں قرآن مجید کے حفظ کا رواج نہیں ہے۔

حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ پر الزام

شیعوں کا دعویٰ ہے کہ آنحضرت (ﷺ) کی وفات کے بعد حضرت علیؓ نے مکمل قرآن مجید پیش کیا جسے حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ نے تسلیم کرنے سے انکار کردیا، کیونکہ اس نسخہ میں ان حضرات کے خلاف آیتیں بھی درج تھیں، چنانچہ انھوں نے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل اور اپنے اقتدار کو قوت بخشنے کے لیے قرآن مجید کے اصلی نسخہ کو ہی غائب کرادیا، اور اپنی اس سازش میں انھوں سارے صحابہ کو شریک بھی کیا، اور اس قرآن کی جگہ اپنی مرضی کا ایک نیا قرآن تالیف کروایا، جس میں وہ تمام آیات نکال دی گئیں جن میں ان کے عیوب وکرتوت اور اہل بیت کے مناقب وفضائل کا ذکر تھا، البتہ حضرت علیؓ نے اپنے نسخہ کو محفوظ رکھا جو کہ اصلی قرآن ہے اور امام غائب کے پاس محفوظ ہے، جسے لے کر وہ آخری دور میں ظاہر ہوں گے۔(۱)

حضرت عثمان پر الزام

نہج البلاغۃ کا شارح کمال الدین ہیثم البحرانی لکھتا ہے:

''عثمان کا ایک جرم یہ بھی تھا کہ اس نے لوگوں کو زید بن ثابت کی قرأت پر جمع کیا اور بقیہ نسخوں کو جلا دیا، اسی طرح عثمان نے بہت سی ایسی آیات ختم کردیں جو بلاشک وشبہ قرآن کا حصہ تھیں۔''(۲)

(۱) یہ تمام تفصیلات شیعہ محدث طبرسی نے اپنی کتاب ''الاحتجاج'' میں بیان کی ہیں۔
(۲) شرح نہج البلاغہ ج ۲ ص ۱۱۵

اصلی قرآن کے جامع

امام باقر کے حوالہ سے کلینی روایت کرتے ہیں:

"ماجمعه وماحفظه كما أنزل الا على بن أبى طالب والأئمة بعده۔"(۱)

(قرآن مجید کو حضرت علیؓ اور ان کے بعد ائمہ کے علاوہ نہ کسی نے جمع کیا اور نہ حفظ کیا)

اس بنیاد پر شیعہ قوم کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ کا جمع کردہ قرآن مکمل ہے تو وہ کذاب ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ وہ پورے قرآن کا حافظ ہے تو وہ بھی جھوٹا ہے، یہی وجہ ہے شیعہ قوم میں آج تک کوئی حافظ قرآن نہیں پیدا ہوا۔

ادعائے حق تلفی

معروف شیعہ مفسر الکاشی حضرت باقر کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

امام باقر نے فرمایا:

"لولا أنه زيد فى كتاب الله ونقص ماخفي حقنا على ذى حجى ولوقد قام قائمنا فانطق صدقه القرآن۔"(۲)

''اگر قرآن مجید میں کمی وزیادتی نہ ہوئی ہوتی تو ہمارے حقوق کسی سے مخفی نہ رہتے، اور جب ہمارے امام قائم (بارہویں افسانوی امام) نمودار ہو کر کوئی کلام کرتے تو یہ تو قرآن مجید اس کی تصدیق کرتا۔''

"عن أبى عبدالله عليه السلام لوقرأ القرآن كما أنزل لالفيتنا فيه مسمين۔" (۳)

---

(۱)أصول کافی، كتاب الحجة، باب انه لم يجمع القرآن كله الا الأمة: ج۱/۲۲۸

(۲)تفسير الصافى، المقدمة السادسة:۲۵ (۳) ايضاً

(امام جعفر نے فرمایا اگر وہ قرآن پڑھا جاتا جو اللہ نے نازل کیا ہے تو ہمیں نام بنام پاتا)

اس پر الکافی کے مترجم سید ظفر حسن امروہی اپنے رسالہ "عقائد الشعیۃ" میں لکھتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ آیات کی ترتیب میں بھی فرق ہے، بعض سورتوں سے آیات بھی نکال دی گئی ہیں۔

یعنی قرآن مجید چونکہ تحریف کردی گئی اس لیے آج لوگ نہ شیعوں کے حقوق سے واقف ہیں اور نہ ان کے اماموں کے اسماء سے اور نہ ہی بارہویں امام کی صداقت اور ان کے مقام سے۔ یاد رہے کہ ان کے بارہویں امام (جس پر شیعوں کی بنیاد ہے) کا قرآن وحدیث میں کہیں ذکر نہیں ہے، اور شیعہ اس کی وجہ بتاتے ہیں کہ قرآن میں تحریف کردی گئی۔

تحریف قرآن کی قسمیں

شیعوں کا دعوی ہے کہ قرآن مجید میں کئی طرح کی تحریفات کی گئی ہیں، تفصیلات حسب ذیل ہیں:

(۱) سورتوں کا مکمل حذف

شیعوں نے اپنی گڑھی ہوئی کچھ خرافات کے متعلق دعوی کیا ہے کہ یہ حقیقت میں قرآن کی سورتیں تھیں، حضور (ﷺ) کے بعد قرآن جمع کرنے والوں نے ان سورتوں کو حذف کردیا مثال کے طور پر سورۃ النورین جس کی شروعات اس طرح ہے:

یـا أیها الذین آمنوا آمنوا بالنورین الذی أنزلنا هما یتلوان علیکم آیـاتـی ویـحـذرانکم عذاب یوم عظیم، نوران بعضها من بعض وأنا السمیع العلیم۔ (۱)

---

(۱) تذکرة الائمة: ۱۹

اس کے علاوہ سورة الولاية، سورة الخلع، سورة الحفد بھی ہیں نیز ان کا دعوی ہے کہ سورة الفجر کا اصلی نام سورة الحسین تھا۔

(۲) کلمات کا حذف

شیعوں کا دعوی ہے کہ قرآن مجید سے بعض الفاظ بھی حذف کر دیے گئے ہیں، اور یہ حذف ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) کے اشارے پر ہوا ہے، اور عام طور پر جو الفاظ حذف ہوئے ہیں وہاں حضرت علی کا تذکرہ تھا یا پھر اہل بیت کے فضائل کا بیان۔ ایسے مقامات تو بیشمار ہیں، بطور مثال ملاحظہ ہوں:

﴿وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُواْ بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ﴾ (البقرة:۲۳) (اور اگر تم شک میں اس کے بارے میں ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے تو تم اس کی طرح ایک ہی سورہ بنالاؤ)

اس آیت کے متعلق شیعوں کا کہنا ہے کہ یہ آیت حقیقت میں یوں تھی:

"وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا–في علي– فَأْتُواْ بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ۔"(۱)

ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُواْ الْكِتَابَ آمِنُواْ بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقاً لِّمَا مَعَكُم مِّن قَبْلِ أَن نَّطْمِسَ وُجُوهاً فَنَرُدَّهَا عَلَى أَدْبَارِهَا﴾(النساء:٤٧) (اے وہ لوگو جنھیں کتاب مل چکی ہے، ایمان لاؤ اس (کتاب) پر جو ہم نے نازل کی ہے جو کہ تصدیق کرنے والی ہے اس (کتاب) کی جو تمہارے پاس ہے، اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو مٹا ڈالیں یا ان کو پیچھے کی جانب الٹا ڈالیں۔)

---

(۱) أصول الكافي: كتاب الحجة باب فيه نكت و نتف من التنزيل في الولاية

اس آیت کے متعلق شیعوں کا دعوی ہے کہ یہ آیت پہلے اس طرح سے تھی:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُواْ الْكِتَابَ آمِنُواْ بِمَا [نَزَّلْنَا] -انزلت على علي- مُصَدِّقاً لِّمَا مَعَكُم مِّن قَبْلِ أَن نَّطْمِسَ وُجُوهاً فَنَرُدَّهَا عَلَى أَدْبَارِهَا﴾(۱)

یعنی نَزَّلْنَا کی جگہ پر -انزلت على علي- تھا۔

قرآن مجید میں ایسے بہت سے مقامات ہیں جن کے متعلق شیعوں کا دعویٰ ہے کہ علی ابن ابی طالبؓ کے نام کو حذف کیا گیا ہے، صرف اصول کافی میں ۹۲ آیات ذکر کی گئی ہیں، یہ چند مثالیں بطور نمونہ کے پیش کی گئیں، جس سے اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ شیعہ حضرات قرآن مجید جیسے لافانی معجزہ کو بھی قابل اعتبار نہیں سمجھتے ہیں۔

قرآن مجید کی شکایت

شیعہ عالم ابن بابویہ جسے شیعہ قوم صدوق کے لقب سے بھی یاد کرتی ہے اپنی کتاب ''الخصال'' میں لکھتے ہیں:

''قیامت کے دن قرآن مجید، مسجد اور عترت (اہل بیت) اللہ کے حضور اپنی شکایتیں لے کر آئیں گے، ان میں سے قرآن کہے گا: اے اللہ انھوں نے مجھے بدل ڈالا اور میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔''(۲)

اصلی قرآن کہاں ہے؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مروجہ قرآن نامکمل ہے اور تحریف شدہ ہے تو وہ اصلی اور مکمل قرآن کہاں ہے جسے حضرت علی نے جمع کیا تھا؟

اس سوال کا جواب خود شیعی عالم ابوالحسن العاملی نے دیا ہے وہ اپنی معروف تفسیر

---

(۱)أصول الكافی: كتاب الحجة باب فيه نكت و نتف من التنزيل فی الولاية

(۲)الخصال: ۱۷۵

"مرآة الأنوار ومشكاة الأسرار" کے تیسرے مقدمہ میں اس طرح لکھتے ہیں:

"ان القرآن المحفوظ عما ذكر الموافق لما أنزل الله تعالى ماجمعه علي عليه السلام وحفظه الى أن وصل الى ابنه الحسن عليه السلام وهكذا الى أن وصل الى القائم عليه السلام المهدى وهو اليوم عنده صلوات الله عليه۔"

(جو قرآن مذکورہ عیوب سے پاک اور تنزیل الٰہی کے موافق ہے وہ علیؑ کا جمع کردہ ہے، جو ان کے پاس محفوظ شکل میں تھا، ان کے پاس ان کے بیٹے حسن تک پھر درجہ بدرجہ القائم المہدی تک پہنچا اور اب یہ قرآن ان کے پاس محفوظ ہے۔ صلوات اللہ علیہ)

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ اصلی قرآن ان کے ائمہ کے پاس موجود ہے، اس سلسلہ میں کلینی اپنی کتاب ''الکافی'' میں احمد بن ابی نصر سے روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوالحسن رضا نے مجھے اصلی مصحف یعنی قرآن مجید دیا اور ہدایت کی کہ میں اسے کھول کر نہ دیکھوں، لیکن جب میں نے اسے کھولا تو میری نظر سورہ "لم يكن الذين كفروا" پر پڑی، مجھے اس سورہ میں ستر کے قریب نام نظر آئے جن کا تعلق قریش سے تھا، میں نے قرآن مجید بند کر دیا، تھوڑی دیر بعد امام رضا نے پیغام بھیجا اور وہ قرآن مجھ سے لے لیا۔''(۱)

''ایک مرتبہ ایک شخص نے امام جعفر صادق کی موجودگی میں کچھ ایسی آیات تلاوت کیں جو موجودہ قرآن میں نہ تھیں تو آپ نے فرمایا: اقرأ كما يقرأ الناس حتى يقوم القائم یعنی جس طرح عام لوگ قرآن پڑھتے ہیں تم بھی اسی طرح پڑھا کرو حتی کہ امام قائم کا ظہور ہو جائے۔''(۲)

شیعہ محدث نعمۃ اللہ الجزائری لکھتے ہیں:

(۱-۲)الكافى فى الاصول، كتاب فضل القرآن

''احادیث سے ثابت ہے کہ ائمہ معصومین نے اپنے شیعوں کو اسی قرآن کو پڑھنے کا حکم دیا ہے تاوقتیکہ مولانا صاحب الزمان (امام مہدی) ظاہر ہو جائیں، ان کے ظاہر ہونے کے بعد موجودہ قرآن آسمان پر اٹھالیا جائے گا، اور امیر المؤمنین کا جمع کردہ اصلی قرآن اس کی جگہ پر ظاہر ہوگا۔'' (۱)

خلاصۂ بحث

علامہ کاشانی شیعوں کے عقائد کو چند سطروں میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ اہل بیت کے طریقے وسند سے ان تمام احادیث و روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ:

۱- ہمارے سامنے جو قرآن موجود ہے وہ نہیں جو رسول اللہ (ﷺ) پر اتارا گیا۔

۲- اس کا کچھ حصہ خدا کی تنزیل کے برخلاف ہے۔

۳- کچھ حصہ تبدیل شدہ اور محرف ہے۔

۴- بہت سی آیتیں نکال دی گئی ہیں جن میں بہت سے مقامات پر حضرت علی کا نام تھا۔

۵- یہ خدا اور رسول کی پسندیدہ ترتیب پر نہیں ہے۔

یہی مفسر صافی' طبرسی کے حوالہ سے کہتے ہیں:

''اگر میں وہ سب کچھ تیرے سامنے کھول دوں جو قرآن سے نکالا گیا ہے، اور جو کچھ اس میں تحریف وتبدیل کیا گیا ہے تو بات بہت لمبی ہو جائے گی، اس کے اظہار سے تقیہ ہمیں روکتا ہے''۔ (۲)

غور کیجیے کہ شیعوں نے قرآن مجید کو بے اعتبار کرنے اور مسلمانوں کو اس سے دور کرنے کے لیے کیسی کیسی سازشیں رچیں، کبھی اصلی قرآن ہی غائب کر رہے ہیں، کبھی

(۱) الأنوار النعيمية جلد ۲ صفحہ ۲۶۳ (۲) مقدمۂ صافی: ۴۶

قرآن میں تحریف کی بات کر رہے ہیں، کبھی قرآن کے جامع خلفائے ثلاثہ اور دیگر حفاظ صحابہ کرام کو جھوٹا اور کذاب بتلا رہے ہیں، اور پھر کہتے ہیں کہ اصلی قرآن حضرت علیؓ کے پاس محفوظ تھا پھر ائمہ کے پاس پہنچا اور اب امام غائب کے پاس ہے جو کسی غار میں روپوش ہیں، اور قیامت سے قبل اس کو دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔

کس قدر افسوس کی بات ہے قرآن مجید جو پوری انسانیت کی رہنمائی کے لیے نازل ہوا آج پوری انسانیت اس سے ناواقف ہے، سنیوں کے علاوہ خود شیعہ اس قرآن کی ہدایات اور اس کی تعلیمات سے بے بہرہ اور محروم ہیں۔ اور اس قرآن کا ظہور اس وقت ہوگا جب تک نسلوں پہ نسلیں بغیر ہدایت اور بغیر قرآنی تعلیمات کے فوت ہو چکی ہوں گی، کیا اس سے بڑھ کر کوئی سازش ہو سکتی ہے اسلام کو بے حیثیت اور اس کی تعلیمات کو مشکوک کرنے کی، کیا اس کے بعد یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام ہی پوری انسانیت کی بھلائی کا ضامن ہے اور کیا یہ اعلان کیا جا سکتا ہے کہ ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ یعنی اللہ کے نزدیک قابل اعتبار دین تو صرف اسلام ہی ہے؟!

حضرت علیؓ کا فرمان

شیعہ عالم محمد بن ابراہیم حضرت علیؓ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

> ''یہ قرآن ویسا نہیں ہے جیسا نازل کیا گیا تھا، اس میں سے قریش کے ستر آباء واجداد کے نام حذف کر دیے گئے ہیں، اور رسول اللہ (ﷺ) کی توہین کے لیے صرف ابولہب کا نام باقی رکھا گیا ہے کیونکہ وہ آپ کے چچا تھے۔''(۱)

شیعوں کی کذب بیانی اور افترا پردازی کو سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علیؓ جو کہ بعض شیعوں کے نزدیک پروردگار اور معبود حقیقی ہیں، اور کچھ کے نزدیک نبی ناطق اور تمام شیعوں کے نزدیک نبی معصوم ہیں، وہ پانچ سال نو ماہ تک فرمانروا رہے، اور پوری طاقت وشوکت کے ساتھ خلافت کی ذمہ داری ادا کرتے

(۱) الغيبة: ۱۸، باب: ۲۱، حديث: ۵

رہے، اس دوران ان کی سلطنت کی ہر مسجد میں یہی قرآن پڑھا جاتا تھا، اور خود اسی قرآن کے مطابق وہ نمازیں پڑھاتے اور فیصلے کرتے تھے، اگر وہ اس تحریف کے قائل ہوتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ اپنی طویل المدت خلافت میں ان تحریفات کو باقی رہنے دیتے؟ مطلق العنان حاکم ہونے کے بعد ان کو کس بات کا خدشہ تھا جب کہ وہ خدائی صفات کے حامل بھی تھے، اور شیعوں کے بقول انھیں جن خلفائے ثلاثہ کا خوف رہتا تھا وہ بھی بقید حیات نہ تھے۔ پھر حضرت علیؓ کے بعد ان کے صاحبزادہ حضرت حسنؓ بھی خلیفہ ہوئے اور شیعوں کے نزدیک وہ بھی اپنے والد حضرت علیؓ کی طرح محیر العقول صفات وکمالات کے حامل تھے، لیکن اس سلسلہ میں انھوں نے بھی کوئی اقدام کیوں نہ کیا! یقیناً ان حضرات پر شیعوں کی طرف سے یہ اتنا بڑا بہتان ہے کہ اس سے ان کی اصلی تصویر ہی مسخ ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کا عقیدہ

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید پوری انسانیت کے لیے ہدایت ورہنمائی کا ذریعہ ہے، امت محمدیہ (ﷺ) کے پاس جو قرآن مجید ہے وہ مکمل ہے، زمانہ وحی سے لے کر آج تک نہ اس میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی اور نہ کسی حرف کی تحریف ہوئی ہے، یہ وہی قرآن ہے جو آنحضرت (ﷺ) پر نازل ہوا، اور آپ (ﷺ) ہی کی ہدایت کے مطابق اس کی ترتیب ہوئی ہے، اس کے ہر ہر حرف حتی کہ حرکات وسکنات پر مسلمان پورے یقین کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن مجید جس طرح نازل ہوا ہے قیامت تک اسی حال میں رہے گا، اس میں کسی بھی طرح کی لفظی یا معنوی تبدیلی ناممکن ہے۔

عقیدۂ تحریف کے نقصانات

بالفرض اگر شیعوں کے عقیدۂ قرآن کو تسلیم کر لیا جائے، اور ایک لمحہ کے لیے یہ گوارہ کر لیا جائے کہ قرآن مجید میں تحریفات کر دی گئی ہیں تو اللہ رب العزت کے ان فرامین کا کیا مطلب نکلے گا جن میں خود اللہ نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، اور ان احکام

کا کیا محل ہوگا جن میں اللہ نے قرآن مجید میں غور وفکر کرنے کی ہدایات دی ہیں اور قرآن مجید کو پوری انسانیت کی فلاح و بہبود کا ضامن قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

﴿یَا أَیُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَیْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾ (المائدہ:٦٧)

(اے رسول جو آپ پر اترا ہے اسے آپ پہنچا دیجیے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو اس کا پیغام آپ نے نہ پہنچایا)

اس آیت میں اللہ کے رسول (ﷺ) کو ہدایت دی جارہی ہے کہ جو بھی آپ پر اتارا گیا ہے آپ اسے دوسروں تک پہنچا دیجیے، گویا نبی کریم (ﷺ) کی بعثت کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی تھا کہ اللہ کے احکام یعنی قرآن مجید کو لوگوں تک پہنچائیں، چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر ایک لاکھ سے زائد اصحاب کو مخاطب کر کے آپ (ﷺ) نے علی الاعلان فرمایا تھا: الآ! هل بلغت؟ (بتاؤ! کیا میں نے پیغام خداوندی پہنچا دیا؟!) اور پھر فرمایا تھا: اللهم اشهد (اے اللہ! تو گواہ رہنا) پھر لوگوں سے فرمایا: فليبلغ الشاهد الغائب (جو موجود ہیں وہ ان لوگوں تک پہنچا دیں جو موجود نہیں)

اب اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ موجودہ قرآن تحریف شدہ ہے اور حقیقی قرآن انسانی دسترس سے پرے ہے، تو یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ آپ (ﷺ) کی یہ پکار صدا بصحرا تھی اور آپ (ﷺ) کی ساری تگ ودو، ساری مشقتیں اور راہ خدا میں آپ (ﷺ) کے اصحاب وخاندان کی قربانیاں بے اثر اور رائیگاں تھیں، پھر ان تسلیمات کے بعد یہ اعلان بھی کرنا ہوگا کہ اب کوئی بھی شخص صاحب ایمان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا!

ایک موقع پر ارشاد الٰہی ہے:

﴿أَفَلَا یَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾ (محمد: ٢٤)

(تو کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں)

آخر اللہ رب العزت کی جانب سے کس قرآن میں غور کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے؟ اگر اصلی قرآن موجود نہیں ہے تو خدا کا یہ فرمان باطل و نا قابل التفات ٹھہرے گا، تو کیا ہے کسی میں ہمت جو یہ کہہ سکے کہ نعوذ باللہ خدا کا یہ حکم بے معنی ہے؟!

خدا کے ان فرامین کو غور سے پڑھیے:

﴿ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾

(یہ وہ کتاب ہے جس میں شک کا کوئی گذر نہیں)

﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِن بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾ (حم السجدة: ٤٢)

(اس (قرآن مجید) میں باطل اثر انداز ہو ہی نہیں سکتا، نہ اس کے سامنے سے اور نہ اس کے پیچھے سے، یہ نازل کردہ ہے اس کی جانب سے جو حکمت والا ہے، تعریفات والا ہے)

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (الحجر: ۹)

(ہم نے ہی ذکر (قرآن مجید) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)

﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾

(القيامة: ۱۷-۱۹)

(بے شک ہمارے ہی ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کی قرأت، پس جب ہم اس کی تلاوت کریں تو آپ بھی دہراتے جائیں، پھر اس کی تفسیر بھی ہمارے ہی ذمہ ہے)

قران مجید میں اس بات کی صراحت کر دی گئی ہے کہ اس میں شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں، اس میں باطل کا کسی بھی شکل میں گذر نہیں، حاسدین کا حسد اور معاندین کا عناد اس میں کچھ اثر انداز نہیں ہو سکتا، اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود

اللہ رب العزت نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے، اب یہ کتنی احمقانہ بات ہوگی کہ کہا جائے کہ خود اللہ العزیز اپنی ذمہ داری نہیں نبھا سکا، اور قرآن مجید میں اس کی مرضی کے خلاف من چاہی تبدیلیاں کردی گئیں اور پھر اس کی حفاظت کا ذمہ ان ائمہ کے سپرد ہوا جنھوں نے پوری انسانیت کو اور خاص کر اپنے شیعوں کو اس کے فیض سے محروم رکھا اور پھر وہ ایک ایسے ''بے نام ونشاں امام'' کی پناہ میں پہنچا جس کا ٹھکانہ بھی کسی کو پتہ نہیں، کیا یہ خدائے بزرگ وبرتر پر اس سے بڑھ کر کوئی بہتان ہوسکتا ہے؟!

اگر عقل ودانش کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو عدل وانصاف کی عدالت میں شیعوں کا عقیدۂ قرآن ایک ایسا مقدمہ ہے جس کی بنیاد موہوم مفروضہ پر قائم ہے، اس پر طرفہ یہ کہ اس پر ایسے دعوے ہیں جن کے دلائل اس امام کے پاس ہیں جس کا وجود ایک افسانوی کردار کے سوا کچھ نہیں!

متعہ کا عقیدہ

مذہبِ شیعہ میں متعہ ایک ایسا نکاح ہے جو مرد اور عورت کی مرضی اور کچھ لین دین سے ایک مقررہ وقت کے لیے منعقد ہوتا ہے، اس میں گواہوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے، (اور زنا کسے کہتے ہیں اس کی تعریف سے ہر قاری واقف ہے) لیکن اس متعہ کے بدلے جو بے حساب ثواب اور جو بے نظیر واعلیٰ مقام نصیب ہوتا ہے وہ دن بھر کی ریاضتوں اور رات بھر کی عبادتوں سے بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔

حقیقت میں متعہ ایرانی تہذیب کا ایک خنجر ہے جو اسلامی قالب میں گھونپنے کی کوشش کی گئی ہے، عرب کے عہد جاہلیت میں بھی اس کا رواج تھا جسے نبی کریم (ﷺ) نے ختم کر دیا، لیکن ایران میں یہ ہمیشہ برگ و بار لاتا رہا، اور چونکہ شیعیت کا بیج ایران کی سرزمین میں ہی ڈالا گیا تھا اس لیے اس کی جڑوں میں اس کے اثرات شروع سے ہی موجود رہے۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ شیعوں کے نزدیک کسی کافرہ سے متعہ کرنا جائز نہیں لیکن ایک مجوسی عورت سے نکاح متعہ کیا جاسکتا ہے۔

شیعہ داعیوں کا واسطہ جب ایران کے نومسلموں سے پڑا اور انھیں ایرانی تہذیب کے اس بنیادی عنصر کا علم ہوا تو انھوں نے موقع کو غنیمت سمجھا، اور چند من گھڑت حدیثوں کی آڑ میں متعہ کے جواز بلکہ ثواب اور ثواب عظیم کی خوشخبریوں سے انھیں شادکام کر دیا، بس پھر کیا تھا ہر طرف متعہ کی گرم بازاری شروع ہوگئی، اور مسلم معاشرہ میں یہ ایک کینسر کی طرح پھیل گیا۔

شیعیت کے فروغ میں یہ حربہ خوب کامیاب ثابت ہوا، ہر سڑک چھاپ جسے شریف معاشرہ سے سوائے لعنت ودھتکار کے کچھ نہ ملا، فوراً شیعہ ہوکر دادِ عیش دینے لگا، آج ایران میں پوری فراخدلی کے ساتھ اس پر عمل ہے، حتیٰ کہ اس ''فریضہ'' کی ادائیگی کے لیے ''متعہ سینٹر'' بھی قائم ہیں، ہندوستان میں اس ''کارِ خیر'' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے اودھ کے نواب رہے ہیں، جنھوں نے پچھلے سارے رکارڈ توڑ دیے تھے۔

شیعوں کے نزدیک متعہ کے فضائل

وقتی نکاح کا یہ نظریہ خاص کر نوجوانوں کو جاذبِ نظر بنانے کے لیے وضع کیا گیا ہے کیونکہ دین کے نام پر جنسی لالچ ایک ایسا عمل ہے جو ہر جگہ اور ہر وقت نوجوانوں اور کمزور طبع لوگوں کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے۔ اسی لیے شیعوں نے متعہ کو ایک مؤثر آلہ کے طور پر استعمال کیا، اور بڑی چالاکی سے اسے مذہب کا اہم جزء قرار دیا، پھر اس کی ضرورت اور اس کی اہمیت وافادیت کو ثابت کرنے کے لیے مختلف روایتیں گڑھ کر پیش کر دیں، اور اسے مذہب کا ایک مہتم بالشان فریضہ اور اہم ترین عبادات کے زمرہ میں شامل کر دیا، حالانکہ اس کے پس پردہ صرف شہوانی جذبات کی تسکین مطلوب ہے۔

مطلوب ہے سیم تنوں سے وصال ہو
مذہب وہ چاہیے کہ زنا بھی حلال ہو

متعہ دین کا حصہ ہے

شیعوں نے اپنے مزاج اور اختراعی ذہن سے جو روایتیں وضع کی ہیں ان کی نسبت نہ صرف اپنے ائمہ کی جانب کی ہے بلکہ آنحضور (ﷺ) کی ذاتِ اقدس کے حوالہ سے بھی ایسی باتیں بیان کی ہیں جو کھلا ہوا بہتان ہے۔

(ہم ان کفریہ روایتوں کو نقل کرتے ہوئے اللہ سے معافی کے طلبگار ہیں)

شیخ صدوق نے امام صادق کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

''متعہ میرا دین ہے، میرے پرکھوں کا دین ہے، جس نے اس پر عمل کیا اس نے ہمارے دین پر عمل کیا، اور جس نے اس کا انکار کیا اس نے ہمارے دین کا انکار کیا، اور وہ کسی اور دین پر ایمان لانے والا ہوا۔''(۱)

دوزخ سے آزادی کا پروانہ

شیعی ملا فتح اللہ کاشانی لکھتے ہیں کہ اللہ کے رسول (ﷺ) نے فرمایا:

''جس نے ایک بار متعہ کیا اس کا ایک تہائی حصہ دوزخ سے آزاد ہو گیا، جس نے دو دفعہ متعہ کیا اس کا دو تہائی حصہ دوزخ سے آزاد ہو گیا، اور جس نے تین بار متعہ کیا وہ دوزخ سے پورا آزاد ہو گیا۔'' (۲)

کس قدر دلآوری اور جرأت کی بات ہے کہ یہ شیعہ اُس رسول امین (ﷺ) پر بھی جھوٹ بولنے سے نہیں ڈرتے جو نبی ساری عمر برائیوں سے روکتا اور برائیوں سے دامن کش رہا، جو عفت و پاکدامنی کا اعلیٰ مثال تھا، جس نے علی الاعلان کہا تھا کہ '' انما بعثت لأتمم مكارم الأخلاق'' (میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں) کیا وہ ایسی گھٹیا، اخلاق باختہ اور فحاشی کی تعلیم دے سکتا ہے؟ العیاذ باللہ!

جنت میں رسول خدا (ﷺ) کا ساتھ

اسی پر بس نہیں بلکہ توہین و گستاخی کے سارے حدود پھاندتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہر کہ یکبار متعہ کند ہمہ او از آتش ایمن شود، ہر کہ دو دفعہ متعہ کند محشور شود با نیکو کاراں و ہر کہ سہ بار متعہ کند ہم نشینی و مقاربت کند با من در روضۂ جناں۔''(۳)

(ایک بار متعہ کرنے والا آتش دوزخ سے بے خوف ہو جاتا ہے، دو دفعہ متعہ کرنے والا نیک بندوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا، تین دفعہ متعہ کرنے

(۱) من لا يحضره الفقيه: ۳۶۶/۳ (۲-۳) تفسیر منہج الصادقین: ۴۹۳/۲

والا رسول خدا (ﷺ) کے ساتھ جنت کے باغوں میں رہے گا)

متعہ کرنے والے کا مقام

ذرا دیکھئے کہ ان شیعوں نے کتنی بری تعبیر استعمال کی ہے اور کس قدر گھناؤنا جھوٹ یہ اللہ کے طاہر و مطہر نبی کے سر تھوپ رہے ہیں:

اللہ کے رسول (ﷺ) نے فرمایا:

”من تمتع مرة درجته كدرجة الحسن، ومن تمتع مرتين درجته كدرجة الحسين، ومن تمتع ثلاث مرات درجته كدرجة على ومن تمتع أربع مرات درجته كدرجتي“۔ (۱)

(جس نے ایک دفعہ متعہ کیا وہ حسین کے درجہ کو پہنچ گیا، جس نے دو دفعہ متعہ کیا وہ حسن کے درجہ کو پہنچ گیا، جس نے تین دفعہ متعہ کیا وہ علی کے درجہ کو پہنچ گیا اور جس نے چار دفعہ متعہ کیا وہ میرے (محمدؐ) درجہ کو پہنچ گیا)۔

عورتوں کے لیے معراجی تحفہ

بات صرف یہیں تک محدود نہیں ہے، بلکہ ان شیعوں نے اپنے ائمہ کو بھی نہیں بخشا، ان کے نام لے لے کر ان کو کچوکے لگائے ہیں، اپنی سیاہ مستیوں اور شہوت رانیوں کے تیر و تفنگ سے ان پاکیزہ روحوں کو بھی گھائل و مجروح کیا ہے۔

حضرت ابو جعفر فرماتے ہیں:

”ان النبی ﷺ لما أسرى به الى السماء قال لحقنى جبرئيل فقال يا محمد! ان الله تبارك وتعالىٰ يقول انى قد غفرت للمتمتعين من أمتك من النساء“۔ (۲)

(نبی کریم (ﷺ) نے فرمایا: جب میں شب معراج آسمان کی طرف جا رہا

---

(۱) تفسیر منہج الصادقین: ۲/۴۹۳ (۲) من لا يحضره الفقيه: ۲/۱۵۱

تھا تو پیچھے سے جبرئیل نے آ کر کہا، اے محمد! اللہ تعالی فرماتا ہے کہ میں نے تیری امت کی متعہ کرنے والی عورتوں کو بخش دیا)

شراب کا نعم البدل

ابوعبداللہ فرماتے ہیں:

"ان اللّٰہ تبارك و تعالیٰ حرم علی شعتنا المسکر من کل شراب، و عوضھم من ذلك المتعة" (۱)

(اللہ تعالیٰ نے ہمارے شیعوں پر نشہ والی ہر چیز حرام کردی ہے، اور اس کے بدلہ میں انھیں متعہ کی نعمت دی ہے)

غسل متعہ سے فرشتوں کی پیدائش

حضرت امام صادق فرماتے ہیں:

"مامن رجل تمتع ثم اغتسل خلق اللّٰہ من کل قطرة تقطرمنه سبعین ملکا یستغفرون الی یوم القیامة۔" (۲)

(جو شخص متعہ کرے، پھر غسل جنابت کرے، تو اللہ تعالی اس کے بدن سے گرنے والے ہر ہر قطرہ سے ستر ستر فرشتے پیدا کرتا ہے جو قیامت تک اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں)۔

متعہ نہ کرنے پر وعید

شیعوں نے متعہ کے فضائل کے ساتھ ساتھ اسے ترک کرنے والوں کے لیے سخت وعیدیں بھی ذکر کی ہیں، ان کا مقصد یہی کہ کوئی شیعہ مرد یا عورت پاکدامن نہ رہے بلکہ اس گناہ میں ملوث ہو کر وہ بھی شیعیت کا ہمنوا اور اس کا فدائی بن جائے۔

---

(۱)من لا یحضرہ الفقیه:۲/۱۵۱ (۲)برھان المتعة للسید أبو القاسم

''ایک شخص حضرت امام جعفر صادق کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میں نے قسم کھائی کہ میں متعہ نہیں کروں گا، اب میں پریشان ہوں، میں کیا کروں؟ آپ ناراض ہوکر فرمانے لگے: تو نے حکم الٰہی سے روگردانی کی قسم کھائی ہے، جو شخص اللہ کے حکم سے روگردانی کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہوتا ہے۔''

مصنف اس روایت کو نقل کرنے کے بعد تشریحی نوٹ چڑھاتے ہیں:

''بنابریں روایت ہر کہ متعہ نہ کند دشمن خدا باشد۔ یعنی اس روایت سے ثابت ہوا کہ جو متعہ نہیں کرتا وہ اللہ کا دشمن ہے۔''(۱)

ایک دوسری روایت ہے:

"فمن خرج من الدنيا ولم يتمتع جاء يوم القيامة وهو أجدع" (۲)

(جو شخص متعہ کیے بغیر اس دنیا سے چلا گیا وہ قیامت کے دن اس حال میں حاضر ہوگا کہ اس کی ناک کٹی ہوگی)

متعہ کا طریقہ اور اس کی شرائط

چونکہ شیعہ علماء نے نکاحِ متعہ کو ایک دینی اور مذہبی فریضہ کے طور پر پیش کیا ہے، اس لیے ظاہری طور پر انھوں نے اس کی کچھ شرطیں بھی رکھیں ہیں اور اس کے احکام بھی بیان کیے ہیں، جس کا بنیادی مقصد معترضین کو خاموش کرنا اور سادہ لوح عوام کی عزتوں کو پامال کرنا ہے کیونکہ جتنے بھی احکام ان کی کتابوں میں مذکور ہیں ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ انسانی مزاج اور انسانی فطرت کے بھی خلاف ہیں، اور ان کے بہت سے علماء اور عوام اس سے کڑھتے بھی ہیں لیکن مذہب کا لیبل لگنے کی وجہ سے اکثریت نے چپّی سادھ رکھی ہے، تفصیلات ملاحظہ ہوں:

(۱)منهج الصادقين: ۲۹۱ (۲)تنبيه المنكرين: ۲۵٤

گواہ کی ضرورت نہیں

اسلام میں گواہ کے بغیر نکاح کا تصور ہی نہیں ہے، لیکن متعہ کے لیے نہ کسی گواہ کی ضرورت ہے، اور نہ ہی ولی کی رضامندی ضروری ہے، صرف مرد وعورت کا راضی ہونا کافی ہے۔ شیعی عالم طوسی نے "النهاية" میں لکھا ہے:

"يجوز أن يتمتع بها من غير اذن أبيهاو بلا شهود و لا اعلان" (۱)

(عورت کے ساتھ اس کے باپ کی اجازت، گواہوں کی موجودگی، اور اعلان کیے بغیر متعہ جائز ہے)

متعہ کے الفاظ

جب مرد وعورت تنہا ہوں تو اس وقت متعہ کے الفاظ کہنا ضروری ہے، گویا کہ یہ الفاظ ادا کرنے کے بعد وہ عورت جس کی طرف شہوت سے نگاہ اٹھانا بھی حرام تھا اس سے ہر طرح کی لطف اندوزی نہ صرف جائز بلکہ بہت بڑی نیکی کا ذریعہ بن جائے گی۔

کسی نے حضرت جعفر صادق سے پوچھا کہ میں جب متعہ کی نیت سے لڑکی کے پاس جاؤں تو کیا کہوں؟ اس پر انھوں نے جواب دیا:

" تقول؛ أتزوجك متعة على كتاب الله و سنة نبيه، لا وارثة و لا موروثة كذا و كذا، و ان شئت كذا و كذا سنة، بكذا و كذا درهما و تسمى من الأجر ما تراضيتما عليه قليلا كان أم كثيرا"(۲)

(تو یوں کہے گا: میں تجھ سے کتاب اللہ اور سنت نبوی کے مطابق نکاح متعہ کرتا ہوں، نہ تو وراث ہوگی اور نہ میں، اتنے دنوں تک کے لیے، اور اگر چاہے تو کہے کہ اتنے سالوں کے لیے، اتنے اتنے درہم کے عوض میں، تم دونوں قلیل یا کثیر، مال کی جس مقدار پر بھی راضی ہو جاؤ اس کا تعین کرلو۔"

(۱) بحوالہ اثنا عشریہ- عقائد ونظریات کا جائزہ اور گھناؤنی سازشیں، صفحہ ۱۱۹، از: پروفیسر ممدوح حربی مدینہ یونیورسٹی

(۲) الفروع من الكافي: ۵/۴۵۵

متعہ کا مہر

شیعوں نے نکاح متعہ کے ذریعہ عورت سے لطف اندوز ہونے کے لیے تمام سہولیات یکجا کرلی ہیں، مہر متعہ کے نام پر جو مقدار طے کی گئی ہے اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ عورت محض تسکین نفس کا سامان ہے۔

معروف شیعی عالم کلینی فروع الکافی میں روایت کرتے ہیں:

”عن أبی جعفر أنه سئل عن متعة النساء؟ قال:حلال وانه یجزی فیه درهم فما فوقه“(۱)

(ابوجعفر سے عورتوں کے ساتھ متعہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا: یہ حلال ہے، اوراس کے لیے ایک درہم اوراس سے زائد کفایت کرسکتا ہے)

بات ایک درہم یا دو درہم تک ہی نہیں رکی، بلکہ ان شیعوں کی ہوس پرست طبیعتوں نے عورت کے جسم کی قیمت اس سے بھی کم تر کردی، اور متعہ کی سرگرمیوں کا عوض محض مٹھی بھر ستو، یا کھجور یا کھانے کی کسی چیز کو طے کردیا۔

عن أبی بصیر قال؛ سألت أبا عبد اللّٰه علیه السلام عن أدنی المهر المتعة ما هو؟ قال: کف من طعام دقیق أو سویق تمر (۲)

(ابوبصیر کا کہنا ہے کہ میں نے ابوعبداللہؑ سے پوچھا کی مہر متعہ کی کم سے کم مقدار کتنی ہوگی؟ تو انھوں نے جواب دیا: مٹھی بھر کھانا، آٹا، ستو یا کھجور)

متعہ کی مدت

متعہ کی مدت کی کوئی تحدید نہیں، حسب ضرورت یہ مدت طے کی جاسکتی ہے جو کہ چند منٹوں سے لے کر کئی سالوں تک محیط ہے۔

حضرت ابوالحسنؑ سے نکاح متعہ کی مدت کے بارے میں دریافت کیا گیا:

(۱ - ۲) بحوالہ اثنا عشریہ-عقائد ونظریات کا جائزہ اور گھناؤنی سازشیں، صفحہ ۱۲۳

''کیا کسی شخص کے لیے جائز ہے کہ ایک مرتبہ ہم بستری کی شرط پر متعہ کرے؟ انھوں نے جواب دیا: ہاں ایسا جائز ہے۔'' (۱)

متعہ کے وقت لڑکی کی عمر

نکاح متعہ کے لیے لڑکی کی عمر کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے، ہر عمر کی لڑکی کے ساتھ متعہ کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ لڑکی کمسن اور نا سمجھ ہی کیوں نہ ہو۔

ابوعبداللہؒ سے مروی ہے:

''اس میں کوئی حرج نہیں کہ باکرہ اپنے سرپرست کی مرضی کے بغیر نکاح متعہ کر لے۔'' (۲)

معروف شیعہ قائد خمینی اپنے مجموع فتاوی میں لکھتے ہیں:

''باپ دادا محرم ہونے کے لیے اپنے نابالغ لڑکے کا متعہ کسی عورت سے کر سکتے ہیں، نیز اپنی نابالغ لڑکی کا متعہ محرم بنانے کے واسطے کسی مرد سے کر سکتے ہیں۔'' (۳)

یہی خمینی صاحب لکھتے ہیں:

''نکاح خواہ دائمی ہو یا وقتی، ہر دو صورت میں نو سال سے کم لڑکی سے ہم بستری جائز نہیں ہے، البتہ شہوت کے ساتھ چھو کر، اسے گلے سے چمٹا کر یا ران سے رگڑ کر جنسی ضرورت پوری کرنا جائز ہے، اگرچہ وہ شیر خوار بچی ہی کیوں نہ ہو۔'' (۴)

کن عورتوں سے متعہ جائز ہے؟

مذہب شیعیت میں ہر طرح کی عورت سے متعہ جائز ہے، چاہے وہ عورت ہاشمی

---

(۱) الکافی: ۵/۴۶ (۲) مستدرک الوسائل: ۱۴/۴۵۹

(۳) توضیح المسائل: ۳۹۳ (۴) تحریر الوسیلۃ: ۲/۲۴۱

گھرانہ کی ہو، مجوسی ہو یا زانیہ وفاجرہ ہو۔

حضرت ابوعبداللہ سے روایت ہے:

''ہاشمی عورت سے متعہ کرنا جائز ہے۔'' (۱)

حضرت ابوعبداللہ نے فرمایا:

''مجوسی عورت سے متعہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔''(۲)

''ایک شخص نے امام جعفر سے پوچھا کہ کوفہ میں ایک عورت ہے جو بدکاری میں مشہور ہے، کیا میں اس سے متعہ کرسکتا ہوں؟ امام نے فرمایا: ہاں کرسکتے ہو۔''(۳)

یہ کیسا مذہب ہے جس میں شریف ورذیل عورتوں میں بھی فرق نہیں!

کتنی عورتوں سے متعہ جائز ہے؟

متعہ کے لیے تعداد کی کوئی قید نہیں، جتنی عورتوں کے ساتھ رضامندی ممکن ہو ان کے ساتھ متعہ کیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس میں متعین اجرت کے علاوہ مرد کے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی، یہ معاملہ تو عورت کی اجرت کا ہے، اور جتنی عورتوں کی اجرت دی جاسکے ان سے متعہ جائز ہے۔

حضرت ابوعبداللہؒ کی روایت ہے:

''تو ایک ہزار عورتوں سے بھی متعہ کرسکتا ہے کیونکہ متعہ میں ان کی حیثیت اجرت پر حاصل کی گئی چیز کی سی ہے۔''(۴)

متعہ کے بعد ایک ساتھ سفر کا حکم

شیعہ مذہب میں جس عورت کے ساتھ متعہ کیا جاتا ہے اسے اپنے ساتھ سفر پر

(۱) تهذيب الأحكام :۱/ ۲۷۰ (۲)التهذيب:۷/۲۵٦، الوسائل:۲۱/ ۳۸
(۳)التهذيب:۷/ ۲۷۰، الوسائل: ۲۱/ ۷۳ (٤) الاستبصار:۳/ ۱٤۷

بھی لے جانے کی ممانعت ہے، ظاہر سی بات ہے کہ وہ بیوی کے حکم میں نہیں، بلکہ استعمال کی ایک چیز ہے جسے استعمال کرنے کے بعد پھینک دیا جاتا ہے یعنی Use and Throw کی پالیسی پرعمل کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ضرورت پوری ہونے کے بعد مرد کے ذمہ صرف اجرت کی ادائیگی ہے، اور کچھ نہیں۔

معمر ابن خلاد فرماتے ہیں:

''میں نے امام رضا سے دریافت کیا کہ آدمی عورت کو اپنے ساتھ لے کر دوسرے ملک سفر کرسکتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: نکاح متعہ کے علاوہ دوسرے نکاح کے ذریعہ کرسکتا ہے، نکاح متعہ میں اس کی اجازت نہیں ہے۔''(۱)

شادی شدہ عورت سے متعہ

'' ابان ابن تغلب نے کہا کہ میں نے ابوعبداللہ سے بیان کیا: میں کسی راستہ میں تھا، میں نے ایک خوبصورت عورت دیکھی، کیا معلوم وہ شوہر والی تھی یا زنا کار تھی؟ اس پر آپ نے فرمایا: یہ تحقیق کرنا تمہارا کام نہیں، تجھ پر تو بس یہ ضروری ہے کہ تو اسے اس کے نفس کی قیمت دے دے۔''(۲)

شرمگاہ کو مستعار دینا

شیعوں کے نزدیک عورت کی شرمگاہ کو مستعار دینا اور دوستوں کو بطور تحفہ پیش کرنا بھی مباح ہے۔

طوسی نے ابوالحسن الطاری سے روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے کہا:

میں نے ابوعبداللہ علیہ السلام سے پوچھا کہ عارضی استعمال کے لیے شرمگاہ لینا کیسا ہے؟ آپ نے جواب دیا: اس میں کوئی حرج نہیں۔(۳)

---

(۱)الوسائل:۲۱/۷۷ (۲)الفروع من الکافی:۴۶۲/۵ (۳)الاستبصار:۱۴۱/۲

طوسی نے آپ کے والد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ زرارہ نے ابوجعفرؒ سے پوچھا:

''کیا کوئی آدمی اپنی لونڈی اپنے بھائی کے لیے حلال کرسکتا ہے؟ آپ نے کہا: کوئی حرج نہیں۔''(۱)

عورت کے ساتھ بدفعلی

بات یہیں تک محدود نہیں، ان شیعوں نے عورتوں کے ساتھ لواطت کو بھی جائز قرار دیا ہے، اور اسے خاوند کا حق شمار کیا ہے، اس سلسلہ میں ان کے چوٹی کے عالم کلینی نے الفروع میں اور طوسی نے الاستبصار میں یہ روایت نقل کی ہے:

"عن الرضا أنه سأله صفوان بن يحي: أن رجلا من مواليك أمرني أن أسألك۔ قال: وماهى؟قلت: الرجل يأتى امرأته فى دبرها؟ قال ذلك له۔ قال قلت:فأنت تفعل؟قال أنا لا نفعل ذلك۔" (۲)

(رضا سے مروی ہے کہ ان سے صفوان بن یحیٰ نے کہا: آپ کے ایک غلام نے مجھے آپ سے ایک مسئلہ دریافت کرنے کو کہا ہے۔آپ نے کہا: کیا مسئلہ ہے؟ میں نے کہا: کیا آدمی اپنی عورت کے دبر میں اپنی خواہش پوری کرسکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: اس کے لیے اجازت ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: تو کیا آپ بھی ایسا کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہم ایسا نہیں کرتے)

عبداللہ بن یعفور کہتے ہیں:

"سألت أبا عبدالله عليه السلام عن الرجل يأتى المرأة فى دبرها؟ قال: لابأس إذا رضيت۔"(۳)

---

(۱)الاستبصار:۱۳۹/۳ (۲)الفروع:۲/۲۰۰-الاستبصار:۱۳٦/۳

(۳)الاستبصار:۳/ ۲٤۳

(میں نے ابوعبداللہ علیہ السلام سے ایسے شخص کا مسئلہ دریافت کیا جو عورت کی پچھلی شرمگاہ میں جماع کرتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اگر عورت راضی ہوتو اس میں کوئی حرج نہیں)

نوٹ

اپنی نفس نوازیوں اور لذت پرستیوں کی خاطر یہ شیعہ ہر طرح کی دینی واخلاقی حدود وقیود پھلانگ چکے ہیں، اور متعہ کے نام پر زنا کو جائز ومباح قرار دے رکھا ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ وہ متعہ جو ایک مرد کئی درجن عورتوں سے اور ایک عورت کئی کئی مردوں سے کرسکتی ہے وہ فسق وفجور اور گناہ کے سوا کیا ہے؟! اس پر طرفہ تماشا یہ کہ اپنے اس گھناونے عمل کو ایک دینی وشرعی حکم سے تعبیر کیا، اور اس کے دلائل میں ان پاکیزہ نفوس کو ملوث کرنے کی کوشش کی جو عفت و پاکدامنی میں ہمالیائی وزن رکھتی تھیں، اور انھوں نے اپنی پوری زندگی عفت و پاکدامنی کے ساتھ گذاری اور اپنے متبعین کو اسی کی تلقین کی، لیکن ان کی جانب ایسی حیا سوز اور اخلاق سوز باتوں کی نسبت کس قدر افسوسناک اور کیسا سنگین جرم ہے!!

حقیقت میں یہ متعہ اللہ کے رسول (ﷺ) پر، اور اہل بیت پر سراسر الزام وتہمت اور بہتان عظیم ہے، یہ عظیم ہستیاں ہر طرح کی بد اخلاقی سے کوسوں دور تھیں، حیا و پاکدامنی کی لا فانی مثال تھیں، برے اعمال اور بری نیتوں کو جڑ سے ختم کرنے والی تھیں، ان کے بلند کردار اور اعلیٰ اخلاق کی قسمیں کھائی جاسکتی ہیں، اور اس بات کا واضح ثبوت خود شیعوں کی کتابیں ہیں، ان کتابوں میں کسی بھی ایسی عورت کا ذکر نہیں جس سے ان کے بارہ اماموں میں سے کسی ایک امام نے بھی متعہ کیا ہو، یا ان کا کوئی امام متعہ کے ذریعہ متولد ہوا ہو، جبکہ ان کے پہلے امام حضرت علیؓ سے لے کر آخری امام حسن عسکری بشمول امام غائب تک تمام ائمہ کی سیرت وسوانح اور ان کی عورتوں تک کا ذکر موجود ہے۔ خدا کی قسم یہ دنیا کی عظیم ترین ہستیوں پر عظیم ترین بہتان ہے!!

متعہ کی تباہ کاری

متعہ کو اگر جائز مان لیا گیا تو آوارہ منش، بدکردار اور اوباش جوانوں کو لڑکیوں کی عزتوں سے کھیلنے کا ایک سرٹیفکٹ مل جائے گا، اور پھر کسی محلّہ کی بہن بیٹیوں کی عزت کی کوئی ضمانت نہیں لی جاسکے گی۔

مردوں کو اپنی بیویوں پر سے اعتبار اٹھ جائے گا اور وہ ہمیشہ اسی تناؤ میں رہیں گے کہ ان کی پیٹھ پیچھے ان کی بیویاں پاکدامن ہیں یا کسی مرد کے ساتھ جسمانی رشتہ میں ملوث ہیں، کیونکہ اس کے لیے نہ کسی گواہ کی ضرورت ہے اور نہ کسی شرعی ضابطہ کی، بس مرد وعورت کی رضامندی کافی ہے۔

والدین کسی بھی صورت اپنی جوان بیٹیوں سے مطمئن نہیں رہ سکیں گے، کیونکہ اس کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی کہ ان کی بیٹیاں کب کسی پرائے مرد کی آغوش میں جاکر اپنی عزت کا سودا کرلیں، اور والدین کو اس وقت علم ہو جب ان کی کنواری بیٹیاں حاملہ ہوچکی ہوں۔

معاشرہ میں یا تو ناجائز اولاد کی کثرت ہوجائے گی یا حمل کے ضائع کرانے کا سلسلہ بڑھتا جائے گا، کیونکہ متعہ کے بعد مقررہ قیمت کی ادائیگی کے سوا مرد کی کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہتی، اولاد کا ہونا، اس کی پرورش کرنا، یا اس کو ضائع کردینا سب عورت کے اختیار کی چیز ہے، اور لازمی طور پر کوئی عورت ایسے بچہ کو پالنا نہیں چاہے گی جس کے باپ کی خبر ہی نہ ہو۔

بالفرض اگر کوئی شناسا مرد متعہ کے ذریعہ پیدا ہونے والے بچہ کو اپنانا چاہے تو بھی کوئی گارنٹی نہیں کہ وہ بچہ اسی مرد کا ہے، کیونکہ عورت کو اختیار ہے کہ چاہے جتنے مرد سے متعہ کے نام پر رشتہ قائم کرے، تو پھر کیا دلیل ہوگی کہ بچہ کس مرد کا ہے؟

واقعات ایسے بھی ہوئے ہیں کہ کسی پردیسی نے ایک عورت سے رشتہ قائم کیا، اپنی ضرورت پوری کی اور پھر اپنے راستہ پر چل دیا، عورت حاملہ ہوئی اور ایک لڑکی کو جنم دیا، لڑکی سیانی ہوئی تو متعہ کے گڑھے ہوئے فضائل نے اسے بھی ''عصمت فروشی''

کے بازار میں پہنچا دیا، اتفاق سے اس مرد کا پھر کبھی اس علاقہ میں آنا ہوا، اور اس بار متعہ کے لیے اس کے پہلو میں وہی لڑکی تھی جو حقیقت میں اس کا اپنا ہی نطفہ ہے!

اللہ نے شادی کا مقدس رشتہ اسی لیے بنایا کہ رشتوں کی پاکیزگی برقرار رہے، نسل کی حفاظت ہو سکے اور معاشرہ ہوس سے پاک ہو کر انسانی تقدس کا پاسباں بن سکے، لیکن متعہ کے نام پر جس قدر عزتوں کی پامالی اور رشتوں کی آبروریزی ہوتی ہے اس کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ متعہ' زنا پرستی اور جسم فروشی کو مذہبی عنوان کے ذریعہ خوشنما بنانے کی ایک کوشش ہے بس!

زنا اور متعہ کے یکساں مفاسد

زنا کے مفاسد	متعہ کے مفاسد
زنا کے لیے گواہ کی ضرورت نہیں	متعہ کے لیے گواہ کی ضرورت نہیں
زنا سے پہلے اجرت طے کی جاتی ہے	متعہ سے پہلے اجرت طے کی جاتی ہے
حسب تقاضا وقت متعین ہوتا ہے	حسب تقاضا وقت متعین ہوتا ہے
زنا میں تنہائی اور پوشیدگی ضروری ہے	متعہ میں تنہائی اور پوشیدگی ضروری ہے
چاہے جتنی عورت سے زنا کرے	چاہے جتنی عورت سے متعہ کرے
وراثت کا نظام جاری نہیں ہوگا	وراثت کا نظام جاری نہیں ہوگا
زنا میں مرد بیک وقت کئی عورت سے لطف اندوز ہو سکتا ہے	متعہ میں مرد بیک وقت کئی عورت سے لطف اندوز ہو سکتا ہے
زنا کا مقصد شہوت کی آگ بجھانا ہے	متعہ کا مقصد شہوت کی آگ بجھانا ہے
زنا میں ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد مرد عورت کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے	متعہ میں ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد مرد عورت کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے
زنا میں مرد کے ذمہ عورت کا نان نفقہ نہیں	متعہ میں مرد کے ذمہ عورت کا نان نفقہ نہیں

نکاح اسلام اور متعہِ شیعہ کا بنیادی فرق

اسلامی نکاح	شیعی متعہ
نکاح کا مقصد صالح خاندان کی داغ بیل ڈالنا ہے۔	متعہ کا مقصد شہوت کی آگ بجھانا اور جنسی خواہش کی تکمیل کرنا ہے
شادی شدہ عورت سے نکاح نہیں ہوسکتا۔	شادی شدہ عورت سے متعہ ہوسکتا ہے۔
عورت کا مسلمان یا کتابیہ ہونا ضروری ہے	مجوسی عورت سے بھی متعہ کیا جاسکتا ہے۔
دو گواہ کی موجودگی ضروری ہے۔	کسی گواہ کی ضرورت نہیں ہے۔
نکاح علی الاعلان کیا جائے گا۔	اعلان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔
خلوت صحیحہ کے بعد پورے مہر کی ادائیگی ضروری ہے۔	متعین دن میں اگر ایک دن بھی غائب رہی تو اجرت وضع کر لی جائیگی۔
بیوی کا نان ونفقہ شوہر کے ذمہ لازمی ہے۔	اخراجات کے متعلق شوہر بااختیار ہے۔
شوہر اپنی بیوی کو اپنے ساتھ سفر پر لے جاسکتا ہے۔	متعہ کے بعد عورت کو اپنے ساتھ سفر پر نہیں لے جاسکتا۔
شوہر کو طلاق کا حق حاصل ہوتا ہے۔	صرف مدت کی تکمیل ضروری ہے۔
عدل کی شرط کے ساتھ چار بیویوں تک کی اجازت ہے۔	لاتعداد بیویاں بغیر کسی شرط کے رکھنے کی اجازت ہے۔
وراثت کا نظام جاری ہوگا۔	ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔
کنواری کے لیے ولی کی اجازت شرط ہے۔	صرف لڑکی کی مرضی کافی ہے۔
عورت کی شرم گاہ کو عاریۃً دینا حرام ہے	عورت کی شرم گاہ کو عاریۃً دینا جائز ہے
نکاح کی مدت تاحیات ہے۔	متعہ کی مدت منٹوں سے لے کر سالوں تک

متعہ کے جواز میں شیعوں کی دلیل

شیعوں کا کہنا ہے کہ اسلام میں متعہ جائز ہے، اوراس کا ثبوت خود قرآن مجید میں موجود ہے، عہد نبوی (ﷺ) کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے متعہ کو حرام قرار دیا اور جو چیز اسلام میں پہلے سے حلال و جائز تھی اس کو حرام اور ناجائز ٹھہرانے کا حق کسی کو بھی نہیں۔

شیعہ اپنی دلیل میں یہ آیت پیش کرتے ہیں:

﴿ فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً ﴾(النساء: ۲٤)

(پس جو بھی ان عورتوں سے تمتع کرے ان کی اجرت انھیں بطور فریضہ دیدے)

اس آیت میں " اسْتَمْتَعْتُم " کا لفظ آیا ہے جس کا مفہوم ہے متعہ کرنا، اس کے بعد ہے فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُن" یعنی ان عورتوں کو ان کی طے شدہ رقم دیدو، اور متعہ کا یہی طریقہ ہے کہ پہلے سے اجرت طے کی جائے اور متعہ کرنے کے بعد اجرت دیدی جائے۔ لہٰذا اس آیت سے ثابت ہوا کہ متعہ جائز ہے۔

لیکن اگر تھوڑا سا غور کیا جائے اور ہوس پرستی کا عینک اتار کر اس آیت کو دیکھیں تو یہ آیت کھلی طور پر نکاح کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہے، اس آیت سے قبل ان عورتوں کی فہرست بیان کی گئی ہے جن سے دائمی طور پر نکاح حرام ہے، جیسے ماں، بیٹی، حقیقی بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی، بھانجی، رضاعی ماں، رضاعی بہن وغیرہ وغیرہ۔ اس طویل فہرست کے بعد ان عورتوں کا ذکر ہے جن سے نکاح کرنا جائز ہے، اور اسی ضمن میں آیت کا یہ ٹکڑا ہے: ﴿ فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً ﴾ یعنی نکاح کے ذریعہ جب ان سے فائدہ اٹھالو تو ان کو ان کا متعین حق مہر ادا کردو۔

اس ٹکڑے کی شروعات حرف ''فَ'' سے ہے جو پچھلی آیت سے جوڑنے کے لیے استعمال ہوا ہے، اسی طرح ''اسْتَمْتَعْتُم '' یعنی تم متعہ کرو کو آگے لفظ ''بِہٖ'' سے جوڑ دیا گیا کہ نکاح کے ذریعہ جن سے تم فائدہ اٹھاؤ، اسی طرح بعد میں لفظ ہے ''فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُن '' یعنی ان کو ان کا مہر دو، اس کی وضاحت اس کے بعد والی آیت میں موجود

ہے کہ: فَانكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ یعنی ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرنے کے بعد ان کو ان کی اجرت یعنی مہر دیدو، اس میں کوئی کلام نہیں کہ نکاح کے بعد اجرت کے نام پر جو دیا جاتا ہے اسے ''سروس چارج'' نہیں بلکہ مہر کہا جاتا ہے۔ اور قرآن مجید میں جہاں بھی نکاح کے بعد مہر کی ادائیگی کا ذکر ہوا ہے وہاں یہی لفظ استعمال ہوا ہے، یہ قرآن کی اپنی تعبیر ہے جسے اردو کے محاورہ میں سمجھنے کی کوشش کرنا حماقت ہے۔

اس کے علاوہ اس آیت سے متصل ''مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ'' (یعنی پاکدامنی اختیار کرتے ہوئے نہ کہ بدکاری کرتے ہوئے) کی شرط رکھی گئی ہے، اور یہ شرط متعہ کی صورت میں فوت ہو جائے گی۔ خود شیعہ مفسرین ومترجمین قرآن نے لکھا ہے کہ ''محصن'' اس شخص کو کہتے ہیں جو نکاح اور پاکدامنی کے قلعہ میں محفوظ ہو (۱) اور اس سے کسے انکار کہ متعہ کرنے والے کو ہر دن نئی عورت کی چاہ ہوتی ہے، اور عورت ہر رات نئے نئے پہلو میں بکھرتی ہے، اور ایسے مرد وعورت کو خود شیعہ بھی پاکدامن اور محصن نہیں کہتے۔ ملاحظہ ہو یہ روایتیں:

''راوی عبداللہ بن سنان کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ علیہ السلام سے متعہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا: اپنی عزت وآبرو کو اس گندگی میں آلودہ مت کرو۔'' (۲)

''علی بن یقطین سے روایت ہے کہ میں نے موسیٰ کاظم سے متعہ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیا: تم کو متعہ سے کیا لینا دینا، اللہ نے تم کو اس سے بے نیاز فرمایا ہے۔'' (۳)

اس کے بعد رہا شیعوں کا یہ اعتراض حضرت عمر فاروقؓ نے متعہ کو حرام قرار دیا تھا

---

(۱) ملاحظہ ہو: ترجمہ وتفسیر از: علامہ السید ذیشان حیدر جوادی: ۱۹۶

(۲) مستدرك الوسائل: ۱٤/ ٤٥٥

(۳) خلاصة الايجاز في المتعة للمفيد: ٥٧-الكافي: ٥/ ٤٥٢

تو یہ محض بغض وحسد اور عناد کا نتیجہ ہے، ورنہ قرآن مجید میں متعہ کے حرام ہونے کی صراحت موجود ہے جو کہ پیچھے بیان ہوئی، اور حدیث کی کتابوں میں وضاحت سے موجود ہے کہ خود آنحضرت (ﷺ) نے اپنی زندگی میں متعہ کو حرام قرار دیا تھا، البتہ حضور کے اس فرمان کا علم سب کو نہیں ہوسکا تھا جس کی وجہ سے بعض کوتاہیاں سامنے آنے لگیں تو حضرت عمرؓ نے سرکاری طور پر سختی سے اس کا نفاذ کیا۔

متعہ کی حرمت کے سلسلہ میں ملاحظہ ہوں ذیل کی یہ روایتیں:

حضرت علیؓ ابن ابی طالب فرماتے ہیں:

"اللہ کے رسول (ﷺ) نے خیبر کے موقع پر پالتو گدھے کا گوشت اور متعہ کو حرام قرار دیا۔"(۱)

حضرت سلمہ بن اکوع کہتے ہیں:

"غزوۂ اوطاس میں آپ (ﷺ) نے تین دن کے لیے ہمیں متعہ کی اجازت مرحمت فرمائی تھی، اس کے بعد آپ (ﷺ) نے اسے ممنوع قرار دیدیا۔"(۲)

حضرت ربیع بن ثمرہ سے مروی ہے:

"رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: میں نے تم کو عورتوں سے متعہ کی اجازت دی تھی تو خوب دھیان سے سن لو! اللہ تعالیٰ نے اب اسے قیامت تک کے لیے حرام قرار دیدیا ہے۔"(۳)

حضرت جعفر صادق سے متعہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

"متعہ بعینہ زنا ہے۔"(۴)

ابن ماجہ میں صحیح سند کے ساتھ یہ الفاظ منقول ہیں:

---

(۱) کلینی:۵/۴۵۷، التهذيب:۲/۱۸۶،الاستبصار: ۳/۱۴۲

(۲)مسلم:۳۴۸۴ (۳) مسلم:۳۴۹۶ (٤)بيهقى :۷/۲۰۷

''حضرت عمر فاروقؓ نے ایک دن خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: نبی پاک (ﷺ) نے تین دن کے لیے متعہ کو مباح کیا تھا، پھر اس کے بعد آپ (ﷺ) نے ہی اسے حرام قرار دیدیا تھا، خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہوا کہ کسی نے شادی شدہ ہونے کے باوجود متعہ کیا ہے تو میں اسے پتھروں سے رجم کردوں گا۔''(۱)

حضرت عمر فاروقؓ نے صراحت سے فرمادیا کہ آنحضرت (ﷺ) نے خود متعہ کو حرام قرار دیا تھا، انھوں نے تو بس سختی سے اس کا نفاذ کیا۔

امام بیہقی نے ''سنن'' میں حضرت سالم بن عبداللہ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے:

''حضرت عمر فاروق منبر پر تشریف فرما ہوئے، حمد وثنا کے بعد فرمایا: لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ متعہ کرتے ہیں جبکہ رسول اللہ (ﷺ) نے اس سے منع فرمایا ہے؟! آگاہ ہوجاؤ، اگر مجھے کسی کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس نے کسی عورت سے متعہ کیا ہے تو میں اسے سنگسار کردوں گا۔''(۲)

مذکورہ تفصیلات کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ متعہ کی حرمت خود قرآن مجید سے ثابت ہے، اور اللہ کے رسول (ﷺ) نے بھی اس سے منع فرمایا ہے، اب اگر کوئی فرمان الٰہی اور فرمان نبوی کو نظر انداز کر کے حضرت عمر کے قول کو سیاق وسباق سے کاٹ کر بنیاد بناتا ہے اور ایک شرعی حکم کے نفاذ پر ان کے سرکاری فرمان کو ان کی ذاتی رائے سمجھتا ہے تو یہ عناد وہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں۔

شیعوں کی تاریخ گواہ ہے کہ انھیں ہر اس دینی وشرعی عمل سے نفرت و چڑھ ہے جس میں بالواسطہ یا بلاواسطہ حضرت عمر فاروقؓ شامل ہیں، خواہ اس کا تعلق خلافت کے امور سے ہو یا متعہ وتراویح یا دیگر مذہبی معاملات سے ہو!

(۱)ابن ماجة:۲۰۳۹ (۲) سنن الکبریٰ:۲۰٦/۷

متعہ اور اسلام

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَن لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنكُمْ طَوْلاً أَن يَنكِحَ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ فَمِن مِّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُم مِّن فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ وَاللّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِكُمْ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ فَانكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ مُحْصَنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ وَلاَ مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانٍ فَإِذَا أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ وَأَن تَصْبِرُواْ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاللّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾

(النساء:۲۵)

(اورتم میں جوآزاد ایمان والی عورتوں سے نکاح پر قدرت نہ رکھتا ہوتو وہ ان ایمان والی باندیوں سے نکاح کرلے جوتمہاری ملکیت میں ہوں اور اللہ تمہارے ایمان سے خوب واقف ہے، تم آپس میں ایک ہی ہوتو ان کے مالکوں کی اجازت سے تم ان سے نکاح کرلو اور دستور کے مطابق ان کوان کے مہر دے دو، اس طور پر کہ وہ (با قاعدہ) نکاح میں لائی جائیں وہ مستی نکالنے والی نہ ہوں اور نہ چوری چھپے آشنائی کرنے والی ہوں، تو جب وہ نکاح میں لے آئی جائیں پھر وہ بدکاری کریں تو آزاد عورتوں کے لیے جو سزا ہے اس کی آدھی سزا ان کے لیے ہے، (باندیوں سے نکاح کی یہ اجازت) اس کے لیے ہے جو گناہ میں پڑ جانے کا ڈر محسوس کرے اور تم

ضبط کرلو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اللہ بہت مغفرت فرمانے والا نہایت رحم کرنے والا ہے)

مذکورہ آیت میں حکم دیا جارہا ہے کہ جو لوگ مالی تنگی میں ہیں، اور کسی آزاد خاتون سے نکاح کرنے کے بعد اس کے نان نفقہ کی ذمہ داری پوری نہیں کرسکتے تو وہ شرعی طور پر اپنی باندی سے نکاح کرلیں۔

جن کی مالی حیثیت اس سے بھی کم ہو اور ان کی ملکیت میں کوئی باندی نہ ہو تو ان کے لیے صبر کرنے، حالات کے سازگار ہونے تک انتظار کرنے اور پاکدامنی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، فرمان الٰہی ہے:

”وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحاً حَتَّى يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ“(النور:۳۳)

(اور جن کا نکاح نہ ہو پارہا ہو انھیں چاہیے کہ پاک زندگی گزاریں یہاں تک کہ اللہ ان کو اپنے فضل سے خوشحال کردے)

غور کیجیے! اگر متعہ حلال ہوتا اور وہ دین کا ایک حصہ ہوتا تو باندی سے نکاح کرنے یا حالات کے موافق ہونے تک صبر کرنے اور پاکدامنی اختیار کرنے کا حکم نہ دیا جاتا بلکہ ایسے شخص کو متعہ کرنے کا حکم دیا جاتا کہ اس کے ذریعہ نہ صرف جنسی ضرورت کی تکمیل ہوتی بلکہ بے حساب ثواب بھی ملتا اور روز محشر اہل بیت کی صحبت بھی نصیب ہوتی۔

بعض شیعوں کا کہنا ہے کہ کوئی مرد اگر شادی کرنے کی حیثیت نہیں رکھتا اور اپنی قوت شہوانی پر قابو پانا اس کے لیے مشکل ہو، اور اس کا گناہوں میں ملوث ہونے کا خطرہ ہو تو ایسے شخص کے لیے متعہ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

درحقیقت یہ نفسانی خواہشات کی تکمیل کا ایک چور دروازہ ہے، کیونکہ اسلام نے ایسے شخص کے جذبات کی بھی قدر کی ہے اور اس کو گناہوں سے بچانے کے لیے نہایت

کارآمد نسخہ بیان کیا ہے۔ اللہ کے رسول (ﷺ) نے فرمایا ہے:

"من استطاع منکم الباءۃ فلیتزوج ومن لم یستطع فعلیه بالصوم فانه له وجاء۔" (۱)

(تم میں سے جو شادی کی صلاحیت رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ وہ نکاح کرلے، اور جو نہیں کرسکتا تو اس کو چاہیے کہ روزہ رکھتا رہے کہ یہی اس کے لیے توڑ ہے)

قران مجید میں صرف دو طرح کی عورتوں سے جسمانی رشتہ قائم کرنے کی اجازت دی گئی ہے، ایک بیوی سے اور دوسرے باندی سے ﴿ إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ ﴾ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی لگادی گئی کہ ﴿فَمَنِ ابْتَغَى وَرَآءَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْعَادُونَ﴾ یعنی جو اس کے علاوہ کوئی اور راستہ ڈھونڈے گا تو ایسے لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہوں گے، اور اس سے کسے انکار کہ جس عورت سے متعہ کیا جاتا ہے وہ عورت نہ بیوی ہے اور نہ باندی ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ متعہ ایک ایسی لعنت ہے، جس سے پورا انسانی معاشرہ متعفن ہوتا ہے، اسلام کا اس سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہے، اس کے علاوہ یہ خود انسانی مزاج کے بھی خلاف ہے، شیعوں نے اپنے مذہب کی اشاعت اور اہل ایمان کی اخلاقی تباہی کے لیے اسے مذہبی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ہے اور بھولے بھالے انسانوں کو بے حیائی اور بداخلاقی کے اس دلدل میں دھکیلنے کی سازشیں رچی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس غلاظت سے محفوظ رکھے اور پاکدامنی نصیب فرمائے۔

(۱) صحیح مسلم: ٣٤٦٦

بداء کا عقیدہ

شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھول ونسیان ہوتا ہے، جس کا علم اس کو بعد میں ہوتا ہے، اس کے فیصلے بدلتے رہتے ہیں، اور اس کا علم ناقص ونامکمل ہے۔ (معاذ اللہ) خدا سے متعلق اس عقیدہ کو ''بداء'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

شیعہ محدث کلینی نے اپنی کتاب میں ''البداء'' کے عنوان سے کئی روایتیں جمع کی ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

امام رضا (آٹھویں امام) فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء نے اللہ کے لیے عقیدہ بداء کا اقرار کیا ہے۔''(۱)

"ماعظم اللّٰہ بمثل بداء "(۲)

(اللہ تعالیٰ کی تعظیم بداء سے بڑھ کر کسی چیز سے نہیں)

"ماعبداللّٰہ بشئی مثل البداء" (۳)

(اللہ کی عبادت بداء کے جیسے کسی چیز سے نہیں ہوتی)

"مابعث اللّٰہ نبیا قط الا بتحریم الخمر وان یقر للّٰہ بالبداء"(٤)

(اللہ نے ہر نبی کو بھیجا ہے شراب کو حرام قرار دینے کے لیے اور اللہ کی خاطر ''بداء'' کے اقرار کے لیے)

(۱) اصول کافی، کتاب التوحید، باب البداء: ۱/ ۱۴۸ (۲) ایضاً ۱۴۳ (۳) ایضاً: ۱۴۲ (۴) ایضاً: ۱۴۸

بداء کی مثالیں

امام مہدی کے ظہور میں بداء

جناب باقر کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے:

”اللہ تعالی نے ظہور امام مہدی کا وقت ۷۰ھ میں پہلے سے مقرر فرمایا تھا، لیکن جب امام حسین شہید ہو گئے تو زمین والوں پر اللہ سخت ناراض ہوا اور اس نے ظہور مہدی کے وقت کو ٹال کر ۱۴۰ھ متعین کر دی۔“

امام باقر آگے فرماتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے ظہور مہدی کے لیے ۱۴۰ھ مقرر کر دی تھی لیکن تم شیعوں نے اس راز کو فاش کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے ۱۴۰ھ میں بھی ظہور مہدی کو ملتوی کر دیا، اور پھر کوئی وقت ہمارے لیے مقرر نہیں کیا۔“(۱)

کتنے تعجب کی بات ہے شیعہ کے اماموں کو ما کان وما یکون کے ہر لحظہ کی خبر رہتی ہے، لیکن -نعوذ باللہ- اللہ تعالیٰ کو واقعات کی ترتیب بھی یاد نہیں رہتی، اور واقعات کا قبل از وقوع علم بھی نہیں ہوتا، اگر اسے پہلے سے معلوم ہوتا کہ حضرت حسینؓ شہید ہوں گے اور ان کی شہادت کی وجہ سے امام قائم کے ظہور کا وقت بدلنا پڑے گا یا اس کو یہ معلوم ہوتا کہ شیعہ حضرات اس راز کو ساری دنیا میں اگل دیں گے تو اللہ تعالیٰ امام قائم کے ظہور کا وقت ہی متعین نہ کرتے۔! اللہ رب العزت کی ذات میں کتنی سنگین گستاخی اور کیسا بدبختانہ نظریہ ہے یہ!!

حضرت اسماعیل ابن امام جعفر کی امامت میں بداء

شیعہ مؤرخ ابو محمد الحسن بن موسی نوبختی لکھتے ہیں:

”ان جعفربن محمد الباقر نص علی امامة اسمعیل ابنه فی حیاته

(۱) اصول کافی: ۲۳۲

ثـم ان اسمعيل مات وهو حي فقال:مابدالله في شي كما بدا له في اسمعيل۔" (۱)

(حضرت جعفر نے اپنے بعد اپنے بیٹے اسمعیل کو امامت کے لیے نامزد کر دیا تھا، لیکن ان کی زندگی میں ہی اسمعیل کا انتقال ہوگیا (اس پر لوگوں کی زبانین کھلیں تو) تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو کسی بھی مسئلہ میں ایسی بھول نہیں ہوئی جیسی بھول اسماعیل کے مسئلہ میں ہوئی ہے)

اسماعیلیوں اور شیعہ اثنا عشریہ کے مابین اختلاف یہیں سے رونما ہوا تھا، اسماعیلیوں کا موقف تھا کہ امامت باپ کے بعد بیٹے کی طرف منتقل ہوتی ہے، حضرت جعفر نے اپنے بیٹے اسماعیل کو اپنا خلیفہ نامزد کیا تھا، اور پھر اسماعیل کے بعد ان کے بیٹے محمد امامت کے حقدار ہیں، لیکن شیعوں نے اسماعیل کے انتقال کر جانے کی وجہ سے حضرت جعفر کے بعد ان کے بھائی موسیٰ کاظم کو اپنا امام تسلیم کرلیا، اور ''بداء'' کا سہارا لیتے ہوئے کہا کہ غلطی امام جعفر صادق کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی غلطی ہے۔(نعوذ باللہ)

حضرت محمد بن امام علی نقیؒ کی امامت میں بداء

"عن أبى هشام الجعفرى قال: كنت عند أبى الحسن العسكرى عـليه السلام وقت وفاة ابنه أبى جعفر، وقد كان أشار اليه ودل عـليه، وانى لأفكرفى نفسى، وأقول هذه قصة أبى ابراهيم وقصة اسـماعيل فأقبل علي أبوالحسن عليه الصلاة والسلام وقال نعم يـا أبـاهـاشم! بدا الله فى أبى جعفر وصير مكانه أبا محمد كما بـدا له فى اسماعيل بعد ما دل عليه أبو عبدالله ونصبه وهو كما حدثتك نفسك وان كره المبطلون۔"(۲)

(۱)فرق الشيعة:۸٤

(۲)بحار الانوار:۵۰/۲۱٤– أصول الكافى:۱/۳۲۷

(ابو ہاشم جعفری کہتے ہیں میں امام ابوالحسن (علی نقی) کے پاس تھا جب ان کے بیٹے ابو جعفر (محمد) کا انتقال ہوا، امام علی نقوی نے اپنے بیٹے ابو جعفر کو اپنے بعد امام بنایا تھا، اور لوگوں کو ان کی طرف رہنمائی کی تھی، لیکن ابو جعفر (کا انتقال باپ کی زندگی میں ہوگیا، میں ان کے) انتقال کے وقت امام علی نقیؒ کے پاس بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یہ تو وہی قصہ ہوا کہ پہلے اسماعیل کو امام بنایا گیا تھا، پھر ان کی جگہ موسیٰ کاظم کو امام بنایا گیا۔ امام میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ہاں ابو ہاشم! اللہ تعالی کو ابو جعفر کے سلسلہ میں بدا ہوگیا، یعنی اللہ تعالیٰ کی رائے بدل گئی اور ان کی جگہ ابو محمد کو امام بنا دیا، جیسا کہ اسماعیل کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی رائے بدل گئی تھی حالانکہ امام صادقؒ نے اسماعیل کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ بات وہی ہے جو تمہارے دل میں گزری، اگر چہ باطل پرستوں کو ناگوار ہو۔)

شیعہ اماموں نے اپنی زندگی میں اپنے وارث کو اپنا جانشین مقرر کر دیا لیکن قضا وقدر کے فیصلہ سے جانشین کا انتقال ہوگیا تو مجبوراً دوسرے بیٹے کو جانشین متعین کرنا پڑا، اب ہر عاقل انسان سمجھ سکتا ہے کہ یہ امام کی خطا ہے اور اس کے فیصلے پر خدا کی مرضی غالب ہے، وہی علام الغیوب ہے اور کسی بھی امام کو علم غیب نہیں، لیکن شیعہ حضرات کے لیے یہ قبول کرنا ان کے امام کی شان میں عظیم گستاخی ہے کیونکہ ان کے عقیدہ کے مطابق امام عالم الغیب اور معصوم ہوتا ہے، اس سے کسی بھی طرح کی غلطی یا بھول چوک کا ہونا ناممکن ہے، اس لیے انھوں نے اس کی ساری ذمہ داری خالق کائنات اللہ رب العزت پر ڈال دی اور گویا کہ اللہ رب العزت کو ہی ''مورد الزام'' ٹھہرا دیا، کتنی کور دماغی اور کیسی کج فہمی ہے کہ مخلوق سے خطا ونسیان ممکن نہیں البتہ خالق سے خطا ونسیان ممکن ہے۔ کیا عجب تماشا ہے کہ شیعہ اپنے اماموں کو تو معصوم کہتے ہیں اور اللہ رب العزت کو جھوٹ میں ملوث کرتے ہیں، اور اس کے علم کو غیر یقینی سمجھتے ہیں۔ (معاذ اللہ)

رجعت کا عقیدہ

شیعہ مذہب میں رجعت کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت علیؓ سے لے کر گیارہویں امام حسن عسکری تک سب اس دنیا میں دوبارہ آئیں گے، ان سے پہلے آخری امام اپنے غار سے ظاہر ہوں گے، اس وقت ''پنج تن پاک'' اور تمام ائمہ اور ان کے علاوہ تمام خواص شیعہ زندہ ہوں گے، سب اس امام مہدی کے ہاتھ پر بیعت کریں گے، ان میں بھی سب سے پہلے رسول خدا (ﷺ) اور امیر المؤمنین بیعت کریں گے۔

اس کے علاوہ امام مہدی اپنے اختیار سے حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ اور ان سے محبت و موالات رکھنے والے، اور شیعوں کی مخالفت کرنے والے سب کو زندہ کریں گے اور سب پر حد نافذ کریں گے۔ اس کے بعد وہ پوری دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے، اور اپنے آباء واجداد کی دوبارہ آمد اور عنان حکومت سنبھالنے کی راہ ہموار کریں گے، پھر ائمہ میں سے ہر ایک اپنی ترتیب کے اعتبار سے حکومت کرے گا، پھر وہ دوبارہ فوت ہوگا تاکہ اس کے بعد اس کا جانشین منصب حکومت پر فائز ہو سکے، اس ترتیب سے حکومت گیارہویں امام حضرت حسن عسکری تک پہنچے گی پھر ان کی وفات کے بعد قیامت آجائے گی۔ یہ سب اس لیے ہوگا کہ خلافت میں ان کا بنیادی حق تھا جو ان کی ''رجعت'' کی زندگی سے پہلے انھیں حاصل نہیں ہو سکا تھا۔(۱)

شیعی عقائد واعمال کے بیان میں ''تحفۃ العوام'' ایک قدیم ترین کتاب ہے،

(۱) تفصیلات کے لیے دیکھئے: علامہ مجلسی کی حق الیقین: ۱۴۰-۱۴۵

اس میں عقیدۂ رجعت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''اور ایمان لانا رجعت پر بھی واجب ہے، یعنی امام مہدی جب ظہور و خروج فرمائیں گے اس وقت مؤمن خاص اور کافر و منافق مخصوص زندہ ہوں گے اور ہر ایک اپنی داد و انصاف کو پہنچے گا، اور ظالم سزا و تعزیر پاوے گا''(۱)

شیعہ علماء عقیدۂ رجعت کے ثبوت میں قرآن مجید کی وہ تمام آیتیں پیش کرتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو مصائب و مشکلات میں ثابت قدم رہنے اور انعام کے طور پر زمینی حکومت کا وعدہ کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ راہ خدا میں سب سے زیادہ تکلیفیں برداشت کرنے والے، اور خدا کے نام پر مظلوم و مقہور ہونے والی ذات صرف ائمہ کرام کی ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ دوبارہ زندہ ہوکر حکومت کی باگ ڈور سنبھالیں، تبھی جا کر اللہ رب العزت کا ''استخلاف فی الارض'' کا وعدہ پورا ہوگا۔ مثال کے طور پر شیعہ علماء یہ آیت پیش کرنے کے بعد کہتے ہیں:

﴿وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ‎ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ﴾ (القصص:۵،٦)

(اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ جن لوگوں کو زمین میں کمزور بنادیا گیا ہے ان پر احسان کریں اور انہیں لوگوں کا پیشوا بنائیں اور زمین کا وارث قرار دیں، اور انہیں کو روئے زمین کا اقتدار دیں اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو ان ہی کمزوروں کے ہاتھوں سے وہ منظر دکھلائیں جس سے یہ ڈر رہے ہیں)

اس آیت سے حضرت موسیٰ اور ان کی قوم مراد نہیں لی جاسکتی کیوں کہ اس آیت میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا تعلق حال اور مستقبل سے ہے ماضی سے نہیں، اور قرآن کی یہ آیت حضرت موسیٰ کے ہزاروں برس بعد نازل ہوئی ہے، اس لیے

(۱) تحفۃ العوام از مفتی سید احمد علی: ۵ بحوالہ ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت: ۲۴۴

مستقبل کا لحاظ کرتے ہوئے اس سے ائمہ اثنا عشریہ ہی مراد ہیں کہ انہیں کو زمین میں سب سے زیادہ کمزور کیا گیا۔

بطور مثال یہ آیت بھی ملاحظہ ہو:

﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ﴾ (الانبیاء: ۱۰۵)

(اور ہم نے نصیحت کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے)

شیعوں کے نزدیک اس آیت میں "عبادي الصالحون" (میرے نیک بندے) سے مراد ائمۂ شیعہ ہیں۔(۱)

شیعہ حضرات اپنے عقیدہ کے ثبوت میں جتنی آیتیں پیش کرتے ہیں وہ حقیقت میں "تحریف فی المعنیٰ" ہیں، کیونکہ جو مفہوم وہ بیان کرتے ہیں سیاق وسباق سے کاٹ کر بیان کرتے ہیں، اور علماء ومفسرین کے علاوہ ایک عربی داں بھی قرآنی آیات کا جو مفہوم سمجھ سکتا ہے اسے زبردستی نظر انداز کر کے نئے معانی ومفاہیم کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن مجید اور احادیث رسول (ﷺ) کی روشنی میں جمہور امت مسلمہ کا عقیدہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان مؤمن وکافر، صالح وفاسق سب قیامت میں ہی دوبارہ زندہ ہوں گے، اور اسی وقت اللہ کی طرف سے جزا وسزا اور ثواب وعذاب کا فیصلہ ہوگا، لیکن شیعوں کے عقیدہ کے مطابق قیامت سے پہلے ہی ایک قیامت قائم ہوگی، اور اللہ رب العزت سے پہلے ان کے امام غائب "مالك يوم الدين" کے منصب پر فائز ہوں گے، اور لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیں گے، یہ سراسر غیر اسلامی عقیدہ ہے، اور اللہ رب العزت کی صفات میں کھلا ہوا شرک ہے۔

---

(۱) الفرقة الناجية في الاسلام: ۵۹۷، از سید علی رضوی گوپال پوری

تناسخ کا عقیدہ

شیعوں میں خاص کر نصیری فرقہ اس عقیدۂ تناسخ کا قائل ہے۔تناسخ کی تعریف یہ ہے کہ ایک روح ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہو جائے، یا ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہو جائے، جسے آواگون بھی کہتے ہیں۔اس کی چار قسمیں ہیں:

۱-پہلی قسم ہے نسخ؛ یعنی روح ایک آدمی کے جسم سے دوسرے آدمی کے جسم میں منتقل ہو جائے۔

۲- دوسری قسم ہے مسخ؛ یعنی ایک آدمی کی روح کسی حیوان کے جسم میں منتقل ہو جائے۔

۳-تیسری قسم ہے فسخ؛ یعنی آدمی کی روح اس کے جسم سے نکل کر زمین کے کیڑے مکوڑوں میں منتقل ہو جائے۔

۴-چوتھی قسم ہے رسخ؛ یعنی آدمی کی روح اس کے جسم سے نکل کر پیڑ پودے یا جمادات میں منتقل ہو جائے۔

شیعہ اثنا عشریہ اس عقیدہ کے قائل نہیں ہیں۔

مذہبی رسومات وتقریبات

حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد شیعوں نے یوم عاشوراء، سیاہ لباس، سیاہ جھنڈے، تعزیہ و ماتم اور نوحہ خوانی کو اپنا مذہبی شعار بنالیا، اور اس کو اہل بیت کی محبت کی علامت کے طور پر پیش کیا، جبکہ خود انہیں کی کتابیں شاہد ہیں کہ ان کے اماموں نے کبھی بھی ان چیزوں کو پسند نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ اس کی مخالفت کی، لیکن ان ہوا پرستوں نے ان کی بھی پرواہ نہ کی اور اپنی من مانی پر ڈٹے رہے۔

یوم عاشوراء

یوم عاشوراء یعنی دس محرم الحرام کو نواسۂ رسول (ﷺ) حضرت حسینؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تو شیعوں نے اس مہینہ کو نہایت مقدس اور قابل عظمت واحترام مہینہ قرار دیا، اور ''حب اہل بیت'' کے عنوان سے عام مسلمانوں کو بھی یہ باور کرادیا کہ اس مہینہ کی فضیلت، اس کا احترام وحرمت حضرت حسین کی شہادت کی وجہ سے ہے جو کہ صرف ایک مغالطہ اور حقیقت سے چشم پوشی ہے، کیونکہ اس مہینہ کی حرمت کا اعلان تو خود آنحضرت (ﷺ) کی زبان مبارک سے ہو چکا ہے، اور اسلام نے روز اول سے ہی چار قابل احترام وقابل عظمت مہینوں میں محرم الحرام کے مہینہ کو شامل کیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْراً فِي كِتَابِ اللّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَات وَالأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ فَلاَ تَظْلِمُواْ

فِيهِنَّ أَنفُسَكُم﴾ (التوبة: ٣٦)

(بلاشبہ مہینوں کی تعداد اللہ کے نزدیک اللہ کے نوشتہ میں جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا بارہ ہی ہے، ان میں چار حرمت والے ہیں، یہی ٹھیک ٹھیک دین ہے، پس تم ان مہینوں میں خود پر ظلم نہ کرو)

ماہ محرم کا ادب واحترام عرب کے مشرکین کو بھی تھا، چنانچہ اس مہینہ میں وہ جنگ وجدال سے پورے طور پر بچا کرتے تھے، یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے بعض لوگ مہینوں کی ترتیب میں پھیر بدل کرلیا کرتے تھے جس پر قرآن میں سخت تنبیہ وارد ہوئی ہے، تاہم اس مہینہ کی عظمت اور اس کا ادب واحترام ہمیشہ ان کے نزدیک مسلم رہا ہے۔

اس آیت میں حکم دیا جارہا ہے کہ ﴿فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُم﴾ یعنی ان مقدس وقابل احترام مہینوں میں تم اپنے اوپر ظلم نہ کرو، لیکن شیعہ حضرات اس قرآنی حکم سے سرموانحراف کرتے ہوئے اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں، خود کو چوٹ پہنچاتے ہیں، اپنے جسم کو لہولہان کرتے ہیں، چھری چاقو سے اپنا ہی بدن گودتے ہیں، جو کہ قرآنی احکام کی رو سے سراسر غلط اور حکم خداوندی کی خلاف ورزی ہے۔

یہ مہینہ سابقہ امتوں میں بھی قابل احترام تھا، چنانچہ یہودی اس مہینہ میں اہتمام سے روزہ رکھا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم وستم سے نجات دی تھی، جب آپ (ﷺ) کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ کی اتباع کے ہم زیادہ مستحق ہیں چنانچہ رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے آپ یوم عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے، وفات سے ایک سال قبل فرمایا کہ اگلے سال دس محرم کے روزہ کے ساتھ نو یا گیارہ کا روزہ بھی شامل کرلیں گے تاکہ اس سے یہودیوں کی مخالفت ہوجائے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ محرم اور یوم عاشوراء کی فضیلت اس وجہ سے ہے کہ اس میں حضرت حسین کی شہادت ہوئی صرف جہالت اور شیعوں کی اسلام دشمنی پروپیگنڈہ کا نتیجہ ہے،

البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت حسین کی عظمت اور عند اللہ ان کے مقام بلند میں یہ بھی شامل ہے کہ اللہ پاک نے آپ کو محرم الحرام کے مقدس و قابل عظمت مہینہ میں شہادت نصیب فرمائی!

محرم الحرام کے مہینہ میں حضرت حسین کے نام کا تابوت بنا کر، رونا پیٹنا، چیخنا چلانا، سینہ کوبی کرنا، زانوں اور رخساروں پر ہاتھ مارنا، اجتماع واہتمام کے ذریعہ کربلا کی داستان کو رورو کر بیان کرنا شیعیت کا امتیازی نشان ہے، وہ خاص کر محرم الحرام کے دنوں میں بڑی دھوم دھام سے ماتم کی رسم ادا کرتے ہیں اور مخالفت کرنے والوں کو اہل بیت کا مخالف سمجھتے ہیں جبکہ اسلام اور اہل اسلام کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ اللہ کے رسول (ﷺ) نے اس پر سخت وعیدیں سنائیں ہیں اور اسے جاہلی امر قرار دیا ہے۔

سیاہ لباس

سیاہ لباس کا استعمال شیعوں کے مذہبی شناخت میں داخل ہے، چونکہ محرم کے مہینہ میں حضرت حسینؓ کی شہادت ہوئی تھی اس لیے اس ماہ میں شیعہ پورے اہتمام کے ساتھ سیاہ لباس پہنتے ہیں اور شہدائے کربلا کا سوگ مناتے ہیں۔

جبکہ خود حضرت علیؓ نے سیاہ لباس استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے، جو کہ خود شیعوں کی کتابوں میں مذکور ہے، ملاحظہ ہو یہ روایت:

”میرے دشمنوں کا لباس نہ پہنا کرو، حضور (ﷺ) کے دشمنوں کا لباس سیاہ ہے۔“ (۱)

”حضرت علی نے اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ سیاہ لباس نہ پہنا کرو، کیونکہ سیاہ لباس فرعون کا لباس ہے۔“ (۲)

حضرت جعفر صادقؒ نے فرمایا:

”سیاہ لباس جہنمیوں کا لباس ہے۔“ (۳)

(۱) عیون الاخبار: ۲/۲۲ (۲) من لا یحضرہ الفقیہ: ۱/۱۶۳ (۳) أیضاً، الفروع: ۲/۴۴۹

''بے شک سیاہ کپڑا دوزخیوں کا لباس ہے۔''(۱)
''حضور(ﷺ) سیاہ لباس ناپسند فرماتے تھے۔''(۲)

ماتم ونوحہ

ماتم اور نوحہ شیعوں کے مذہبی شعار میں داخل ہے، بلکہ شاید ہی کوئی شیعہ ہو جو ماتم نہ کرتا ہو یا نوحہ کی مجلس میں شامل نہ ہوتا ہو۔لیکن اس جاہلی عمل کی اسلام میں گنجائش ہی نہیں ہے، نبی کریم (ﷺ) کا ارشاد ہے:

"لیس منا من لطم الخدود وشق الجیوب ودعا بدعویٰ الجاهلية۔" (۳)

(وہ شخص ہم میں سے نہیں جو چہروں کو پیٹے ،گریبان کو پھاڑے،اور جاہلیت کی طرح واویلا مچائے)

"النياحة من أمر الجاهلية" (نوحہ خوانی جاہلیت کا عمل ہے)(۴)

شیعوں کی تفسیر عمدۃ البیان میں نبی کریم (ﷺ) کے حوالہ سے درج ہے:

''اللہ تعالیٰ تین آوازوں کو ناپسند کرتا ہے، گدھے کی آواز، کتے کی آواز اور نوحہ کرنے والی عورت کی آواز۔''(۵)

اسی تفسیر میں مزید لکھا ہے:

رسول اللہ (ﷺ) جب عورتوں سے بیعت لیتے تھے تو دیگر شرطوں کے ساتھ یہ بھی ہوتا تھا کہ نوحہ نہ کرنا، کپڑے نہ پھاڑنا، سر کے بال نہ نوچنا، اور اپنا منہ نہ نوچنا۔''(۶)

''نوحہ کرنے والا روز قیامت کتوں کی طرح نوحہ کرے گا۔''(۷)

---

(۱)ایضاً جلد ا صفحہ ۱۶۲ (۲)ایضاً جلد ا صفحہ ۱۶۳۔تہذیب الاحکام جلد ۲ صفحہ ۲۱۳
(۳)بخاری: ۱۲۹۴ (۴)سنن ابن ماجہ: ۱۶۴۸ (۵)عمدۃ البیان: ۲۴/۱
(۶)عمدۃ البیان: ۳۹۲/۱ (۷)مجمع المعارف: ۱۶۲

حضرت حسینؓ نے میدان کربلا میں اپنی ہمشیرہ بی بی زینب کو وصیت فرمائی:

''اے بہن! میں تجھے قسم دیتا ہوں، میری قسم کی لاج رکھنا کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو مجھ پر گریبان چاک نہ کرنا، نہ اپنے چہرہ کو نوچنا اور نہ ہائے مصیبت! ہائے تباہی! کے الفاظ سے واویلا کرنا۔''(۱)

حضرت باقر کہتے ہیں کہ رسول خدا(ﷺ) نے اپنی وفات کے بارہ میں فرمایا:

''اے فاطمہ! جب میں وفات کر جاؤں تو میرے لیے چہرہ پر خراش نہ ڈالنا، بال نہ بکھیرنا، واویلا نہ کرنا، اور مجھ پر نہ نوحہ کرنا اور نہ نوحہ گروں کو بلانا۔''(۲)

حضرت جعفر صادقؒ سے روایت ہے کہ رسول اللہ(ﷺ) نے ارشاد فرمایا:

مصیبت کے وقت مسلمان کا اپنے ہاتھ رانوں پر مارنا، اس کے اجر و ثواب کو ضائع کر دیتا ہے۔''(۳)

ماتم کی تاریخ

شیعوں کی کتابیں گواہ ہیں کہ شیعیت میں ماتم کی جاہلی رسم یزید کے دربار سے شروع ہوئی اور اہل بیت کی محبت کا دم بھرنے والے ان شیعوں نے یزید کی قبیح بدعت کو اختیار کر لیا جو کہ آج یہ ان کا امتیازی نشان بن چکا ہے۔

شیعہ مجتہد ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں:

''حضرت حسین کی شہادت کی خبر جب یزید کو پہنچی تو یزید کی بیوی ہندہ روتی پیٹتی یزید کے دربار میں پہنچی، اس کی یہ حالت دیکھ کر یزید تیزی سے اٹھا اور اس کے سر پر دوپٹہ ڈالتے ہوئے کہا:

''اے ہندہ نوحہ زاری مکن بر فرزند رسول خدا و بزرگ قریش کہ ابن زیاد

---

(۱)اعلام الوریٰ: ٢٣٦، جلاء العیون: ٣٨٧ الارشاد المفید: ٢٣٢

(۲)حیات القلوب:٢/٢٥٤ (۳) فروع الکافی:٣/٢٢٤

لعین درامر وتعجیل کردو من راضی بکشتن او نبودم۔''(۱)

(اے ہندہ فرزند رسول خداؤ بزرگ قریش پر نوحہ زاری نہ کر کہ ابن زیاد لعین نے ان کے معاملہ میں جلدی کی اور میں ان کے قتل پر راضی نہ تھا)

ملا باقر مزید لکھتے ہیں:

جب حضرت حسین کا گھرانہ یزید کے محل میں پہنچا تو یزید کے گھر والوں نے زیور اتار کر ماتمی لباس پہنا، صدائے نوحہ وگریہ بلند کی، اور یزید کے گھر میں مسلسل تین دن تک ماتم جاری رہا۔(۲)

جلاء العیون ہی کے صفحہ ۲۹۳ پر یہ بھی درج ہے کہ یزید کے ہاتھ میں ایک کپڑا تھا جس سے وہ اپنے آنسو پوچھتا تھا، اس نے حضرت حسین کے گھر کی عورتوں کے متعلق کہا کہ انھیں میرے محل میں ہندہ کے پاس لے جاؤ، جب وہ ان کے پاس پہنچائی گئیں تو داخل ہوتے ہی صدائے گریہ وزاری بلند ہوئی جو باہر تک سنائی دیتی تھی۔

حضرت حسین کی شہادت پر یہ پہلا ماتم تھا جو یزید کی اجازت سے یزید کے محل میں ہوا، اس کے بعد دوسرا شخص مختار ثقفی شیعہ تھا جس نے کوفہ میں سب سے پہلے خاص عاشورہ محرم کے لیے اس رسم کی بنا ڈالی، اور اس میں مزید اضافے کیے، اس کا مقصد صرف قبولیت عامہ حاصل کرنا تھا۔

تیسرا شخص معز الدولہ شیعہ تھا جس نے ۳۵۱ھ میں اٹھارویں ذی الحجہ کو عید غدیر منانے کا حکم دیا، پھر اس کے بعد عاشورہ کے دن حکم دیا کہ غم حسینؓ میں لوگ دکانیں بند رکھیں، خرید وفروخت سے باز رہیں، سوگ کے کپڑے پہنیں، واویلا کریں، عورتیں بال کھولیں، منھ پر طمانچہ ماریں اور اپنا سینہ پیٹیں۔ایک سال بعد دوبارہ یہی حکم نافذ کیا گیا، جس کے نتیجہ میں شیعہ سنی میں بڑا فساد ہوا اور نوبت لوٹ مار تک پہنچ گئی۔

معز الدولہ کے وقت سے اس جاہلی بدعت کو خوب فروغ حاصل ہوا اور بعد کو

---

(۱) جلاء العیون: ص/۵۲۷ (۲) ایضاص/۵۲۲

شیعوں نے اس میں اپنی فنی مہارت اور اپنی اختراعی ذہانت کا ثبوت دیا۔ اور دیگر ممالک کے مقابل خاص کر ہندستان میں اسے غیر معمولی اعتناء حاصل ہوا۔(۱)

خلاصہ کلام یہ کہ ماتم کی ابتداء یزید کے دربار سے ہوئی، پھر مختار اور معز الدولہ نے اسے خوب ترقی دی، اس کے بعد شیعوں نے اس پر خوب خوب مذہبی رنگ چڑھایا، اب شیعوں کی مجلسوں اور خاص کر محرم کے مہینہ میں شیعہ کے ہر گھر میں اسی یزیدی لعنت کی جلوہ سامانی رہتی ہے۔

تُف ہے ان بد دماغ جاہلوں پر جو اس امام مرحوم کی خاطر اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں جو امام جنت اور اس کی نعمتوں میں ہیں، اور دائم خدمت گذار ان کے آس پاس آفتابے، آب خورے اور شراب ناب کے گلاس لے لے کر پھر رہے ہیں!

تعزیہ

لفظ ''تعزیہ'' تعزیت سے نکلا ہے، جس کے معنٰی ماتم پرستی یا مرنے والے پر اظہار رنج وغم کے ہوتے ہیں، اسلام نے عمومی طور پر صرف تین دن تک تعزیت کرنے کی اجازت دی ہے، اور اس کے لیے تسلی ودلاسے کی مسنون دعائیں بھی بتلائی ہیں۔

شیعوں کے نزدیک تعزیہ سے مراد وہ شبیہ ہے جو کاغذ، لکڑی اور کھپچیوں سے تیار کی جاتی ہے اور اس کی نسبت روضۂ حسین کی جانب کی جاتی ہے، پھر اس کا جلوس نکالا جاتا ہے جس میں شیعہ مختلف طریقوں سے ماتم کرتے ہیں، اور تماش بین اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں، پھر یہ جلوس کسی مخصوص جگہ جسے کربلا بھی کہتے ہیں پہنچتا ہے اور سینہ کوبی، ماتم وشیون کے ساتھ اس تعزیہ کو دفن کر دیتے ہیں۔

تعزیہ کے آغاز کے سلسلہ میں کہا جاتا ہے امیر تیمور کو حضرت حسینؓ سے بے حد عقیدت تھی اور ہر سال کربلائے معلیٰ روضہ اطہر کی زیارت کو جاتا تھا، ایک سال جنگ وجدال میں وہ اس قدر مصروف رہا کہ وہ زیارت نہ کر سکا چنانچہ اس نے روضہ اقدس

(۱) تاریخ ابن خلدون: ۳/ ۴۲۵۔ تاریخ الخلفاء للسیوطی: ۲۷۵

کی شبیہ یعنی تعزیہ بنوایا اور اس کی زیارت سے تسکین حاصل کی۔

تیموری عہد میں چونکہ بادشاہ، وزیر، بیگمات اور اہل لشکر میں غالب شیعہ تھے، ہندوستان میں مسلسل قیام ونظام سلطنت اور برابر فوجی تنظیم کے باعث ہر سال کربلائے معلیٰ نہیں جاسکتے تھے، یہ بات بادشاہ کے کانوں میں پڑی، امیر تیمور نے کربلا سے امام حسینؓ کے روضہ کی نقل حاصل کی اور اس کو تعزیہ کی صورت میں تیار کرایا تاکہ ہندوستان کے شیعہ اس نقل کے ذریعہ سے کربلائے معلیٰ کی زیارت کا ثواب حاصل کرسکیں، چنانچہ آگے چل کر اسی نے کم وبیش وہ صورت اختیار کرلی جواب رائج ہے، پھر اس میں آہستہ آہستہ بڑی ترقی ہوئی اور اس کے ساتھ دیگر لوازمات بھی شامل ہوگئے۔ تعزیہ کو رواج دینے اور اسے گھر گھر پہنچانے میں شاہان اودھ کی خصوصی دلچسپیاں بنیادی کردار کی حامل ہیں، تاہم اس سے بھی انکار نہیں کہ شیعوں کے مذہب میں یہ ایک کارخیر ہے جس کا سلسلہ امیر تیمور سے آگے نہیں بڑھتا۔

تعزیہ کی ممانعت

شیعوں کے نزدیک تعزیہ حضرت حسینؓ سے محبت کی علامت ہے، اسی لیے وہ بڑے اہتمام سے محرم الحرام میں تعزیے بناتے ہیں اور بڑے تزک واحتشام سے اس کا جلوس نکالتے ہیں، راستہ بھر نوحہ وماتم اور اس راہ میں فنکاری وکرتب بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں، اور پھر جلوس کے اختتام پر کسی ''مفروضہ کربلا'' میں اسے دفن کردیتے ہیں، اس دوران اسلام کی نہ جانے کتنی تعلیمات کی خلاف ورزیاں ہوتی ہیں اور ان ائمہ کی روحوں کو تکلیف پہنچائی جاتی ہے جن کی محبت وعقیدت کا یہ شیعہ دم بھرتے ہیں!

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص کسی قبر کو پھر سے بنائے، یا اس کی شکل وشبیہ (تعزیہ) بنائے تو وہ اسلام سے خارج ہے۔''(۱)

(۱)من لا یحضرہ الفقیہ: ۱/۱۲۰

تعزیہ کی قسمیں

جہاں تک تعزیہ اوراس کے متعلقات کی بات ہے تو اس کی آٹھ شکلیں بیان کی جاتی ہیں:(۱) تعزیہ (۲) ضریح (۳) ذوالجناح (۴) مہندی(۵) تابوت (۶) علم (۷) براق (۸) تخت

تعزیہ

یہ لکڑی کی پھچیوں اور رنگین کاغذوں کی مدد سے تیار کیا جاتا ہے، جس کی ساخت وبناوٹ حضرت حسینؓ کے روضہ کی طرح ہوتی ہے، اس میں ایسے ہی گنبد ومینار ہوتے ہیں جیسے کہ روضہ حسینؓ میں ہیں اوراس کے اندر کاغذ کی دو قبریں بنائی جاتی ہیں، اس روضہ کے سامنے سجدہ کیا جاتا ہے اور منتیں مانی جاتی ہیں، نذریں چڑھائی جاتی ہیں اور وہ سب مشرکانہ فعل کیے جاتے ہیں جن کو شیطان دل میں ڈال دے۔

ضریح

ضریح؛ روضۂ حسینؓ کے اس حصہ کا نام ہے جس پر دو قبریں بنی ہوتی ہیں، ضریح اور تعزیہ میں تھوڑا سا فرق ہے، تعزیہ پورے روضہ کی شبیہ کو کہتے ہیں اور ضریح صرف ایک حصہ کا نام ہے، ضریح میں عام طور پر گنبد ومینار ہوتے ہیں مگر تعزیہ کی طرح ضریح کا بھی ادب واحترام کیا جاتا ہے۔

ذوالجناح

گھوڑے کی اس شکل کو کہتے ہیں جس پر بیٹھ کر حضرت حسینؓ نے لڑائی کی تھی، اس میں ایک گھوڑے کو باقاعدہ فوجی گھوڑے کی شکل دے کر اسلحہ سے مسلح کیا جاتا ہے، ذوالجناح اس گھوڑے کی یادگار ہے جو حضرت حسینؓ کی شہادت کے بعد کربلا کے میدان سے تنہا واپس ہوا تھا، عقیدت منداس کو بوسہ دیتے ہیں اور آنکھوں سے لگا کر باقاعدہ اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، اوراس کے منھ کی رال کو کھانے کی چیزوں میں بطور تبرک استعمال کرتے ہیں۔

مہندی

تعزیہ کی ہی ایک شکل ہے، اس کی بناوٹ کشتی نما ہوتی ہے، اور یہ ۷/محرم الحرام کو جلوس کی شکل میں اٹھائی جاتی ہے۔

تابوت

اس پالنے کی تصویر ہے جس میں علی اصغر لیٹے تھے، یہ حضرت حسینؓ کے چھوٹے صاحبزادے تھے جو شیر خواری کی حالت میں کوفہ کے غدار تیراندازوں کے تیروں سے شہید ہوئے تھے، اس کے ساتھ شیعہ جلوس نکالتے ہیں، مرادیں مانگتے ہیں اور بہت عقیدت رکھتے ہیں۔

عَلَم

حضرت عباسؓ کی یاد میں نکالا جاتا ہے جو حضرت حسینؓ کے لشکر میں جنرل تھے اور شہید ہوگئے تھے۔ اس علم کے اوپری سرے پر ایک پنجہ لگا ہوتا ہے، جس سے شیعہ ’’پنج تن پاک‘‘ مراد لیتے ہیں۔

براق

اس کی شکل بھی گھوڑے کی طرح ہوتی ہے، اس کے جسم میں ایک انسانی چہرہ لگا دیا جاتا ہے، یہ شاید اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ حضرت حسینؓ اسی گھوڑے پر بیٹھ کر جنت تشریف لے گئے ہوں گے۔

تخت

یہ ساتویں محرم کو حضرت قاسم کی شادی کی یاد تازہ کرنے کے لیے اپنے گھروں میں رکھا جاتا ہے۔

تعزیہ کی مذکورہ شکلیں حقیقت میں شیعیت کی اشاعت، اظہار قوت اور ذریعہ آمدنی کے مختلف بہانے ہیں، ان کا کسی بھی زاویہ سے اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تبرا یعنی توہین صحابہ

صحابہ کرام یعنی وہ پاکیزہ نفوس جنھوں نے اسلام کی خاطر اپنی ہستیاں فنا کر دیں، جن پر ظلم وستم کی ساری حدیں توڑ دی گئیں، جنھیں نیزوں کی انیوں سے کچوکے دے دے کر شہید کیا گیا، نیزوں اور بھالوں سے جسموں کو بھوگا گیا، زنجیروں میں جکڑ کر سنگلاخوں پہ گھسیٹا گیا، تختۂ دار پر کھینچا گیا، ماؤں کی گود سے بچوں کو چھینا گیا، عورتوں کو خاوندوں سے الگ کیا گیا، جائدادیں چھین لی گئیں، مال واسباب لوٹ لیا گیا، تپتے صحراؤں میں تڑپایا گیا، دہکتے پتھروں پر رگڑا گیا، مگر ان تمام تعذیبی شکنجوں میں جکڑے ہونے کے باوجود ان کے عزم وثبات میں کوئی فرق نہیں آیا، ان کے سامنے کوئی مادی منفعت نہ تھی، کسی حکومت یا امارت کی حرص نہ تھی، دنیا کی نعمتیں تو ان کے قدموں میں آ آ کر ڈھیر ہو رہی تھیں، کائنات کا ذرہ ذرہ گواہ ہے کہ بیس سال سے زائد عرصہ تک یہ جیالے نت نئی مصیبتوں، اذیتوں، آفتوں اور بلاؤں کا شکار ہوتے رہے لیکن زبان سے اُف تک نہ کی، اور ہر آن و ہر لحظہ اپنے آقا، اپنے قائد، اپنے سالار، اپنے محبوب واپنے رسول کے دامن سے وابستہ رہے، یہ وہ پاکیزہ روحیں ہیں جو آگے چل کر ''صحابہ'' کے لقب سے نوازے گئے، اور یہ وہ سعادت ہے جو مقام نبوت کے بعد تمام سعادتوں کا حرف آخر اور نقطۂ انجام ہے۔ ان عظیم ہستیوں کے بارے میں ملعون شیعہ دشنام تراشی، الزام تراشی و ہرزہ سرائی سے کام لیتے ہیں، چنانچہ معروف شیعہ محدث کلینی لکھتا ہے:

''كان الناس أهل ردة بعد النبى ﷺ الا ثلاثة. قلت ومن الثلاثة؟ فقال المقداد بن الاسود وأبوذر الغفارى و سلمان الفارسى رحمة الله عليهم وبركاته۔''(۱)

(۱) فروع الکافی کتاب الروضۃ: ۳۰/۱۱۵، کتاب سلیم بن قیس العامری: ۹۲ ط دار الفنون بیروت

(نبی (ﷺ) کے بعد سارے صحابہ مرتد ہو گئے تھے سوائے تین کے۔ میں نے پوچھا کہ وہ تین کون لوگ ہیں؟ تو فرمایا: مقداد بن اسود، ابوذ غفاری اور سلمان فارسی، ان پر اللہ کی رحمتیں اوراس کی برکتیں ہوں)

صحابہ کرام کی شان میں گستاخیاں کرنا اور انھیں کافر ومرتد کہنا شیعوں کا نہ صرف وطیرہ بلکہ ان کے مذہبی مزاج کا بنیادی عنصر ہے، شیعوں کی کوئی مجلس خواہ محرم کے مہینہ کی ہو یا عام مہینوں کی اس تبرابازی سے پاک نہیں ہوتی، ان کی مجلسوں میں خدائے بزرگ وبرتر کی حمد وثنا اور سرور کائنات کی بارگاہ میں درود وسلام کا تو گذر ہی نہیں ہوتا، ابتداء سے انتہا تک حضرت علی ودیگر ائمہ کی شان میں غلو ومبالغہ بلکہ ان کی الوہیت ومعبودیت کے تذکرے اور اصحاب نبی کی شان میں تبرے اور بدتمیزیوں کے طومار کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اوران ساری مبالغہ آرائی، نوحہ گری اور دشنام تراشی وہفوات گوئی کے پہلو بہ پہلوان کا بناوٹی آہ وبکاء اور ڈرامائی سینہ کوبی وگریہ وزاری شامل ہوتی ہے۔

باقر مجلسی لکھتے ہیں:

''اور تبرا کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ان چار بتوں سے بیزاری اختیار کریں یعنی ابوبکر وعمر وعثمان اور معاویہ سے اور چار عورتوں سے بیزاری اختیار کریں یعنی عائشہ وحفصہ وہند اورام الحکم سے، اور ان کے تمام پیروکاروں سے اور یہ کہ یہ لوگ خدا کی مخلوق میں سب سے بدتر ہیں، اور خدا ورسول پر اور ائمہ پر ایمان واقرار تبھی مکمل ہوتا ہے جب ان کے دشمنوں سے بیزاری کی جائے''(۱)

ملا باقر علی مجلسی لکھتے ہیں کہ حضرت زین العابدین سے ان کے خادم نے کہا کہ میرا آپ پر حق الخدمت ہے اس کی بنا پر آپ مجھے ابوبکر وعمر کے بارے میں بتلائیے:

''حضرت فرمود ہر دو کافر بودند وہر کہ ایشاں را دوست دارد کافر است''(۲)

(۱) حق الیقین: ۵۱۹ (۲) حق الیقین: ۵۲۲

(حضرت نے فرمایا کہ وہ دونوں کافر تھے اور جو کوئی بھی ان سے دوستی رکھے وہ بھی کافر ہے)

کلینی حضرت ابوجعفر کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں:

"ان الشیخین-أبا بکر وعمر- فارقا الدنیا ولم یتوبا ولم یذکرا ماصنعا بأمیر المؤمنین فعلیهما لعنة الله والملائکة والناس أجمعین۔"(۱)

(شیخین یعنی ابوبکر وعمر دنیا سے اس حال میں گئے کہ انھوں نے امیر المؤمنین کے ساتھ جو کچھ کیا اس پر نہ توبہ کی اور نہ ندامت کا اظہار کیا، پس ان پر لعنت ہے خدا کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی)

ذوالنورین حضرت عثمان بن عفانؓ کے متعلق علی ابن یونس بیاضی کہتا ہے:

"کان عثمان ممن یلعب به وکان مخنثا۔" (۲)

(عثمان ایک مسخرہ تھے اور مخنث تھے)

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے متعلق ابن رجب برسی کے الفاظ ہیں:

"ان عائشة جمعت أربعین دیناراً من خیانة۔"(۳)

(عائشہ نے چوری سے چالیس دینار اکٹھے کر لیے تھے)

باقر مجلسی لکھتے ہیں:

''چوں قائم ما ظاہر شود عائشہ را زندہ کند تا بر او حد بزند وانتقام فاطمہ از د بکشد۔''(۴)

(جب ہمارا قائم نکلے گا تو عائشہ کو زندہ کرے گا، اس پر حد جاری کر کے فاطمہ کا بدلہ لے گا)

---

(۱) روضۃ الکافی: ۸/۲۴۶ (۲) الصراط المستقیم: ۲/۳۰

(۳) مشارق انوار الیقین: ۸۶ (۴) حق الیقین: ۳۴۷

کلینی نے اپنی کتاب ''الکافی'' میں حضرت علیؓ کے حوالہ سے یہ جھوٹی روایت بیان کی ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا:

''مجھ سے پہلے حکمرانوں (خلفائے ثلاثہ) نے واضح طور پر رسول اکرم (ﷺ) کی مخالفت کی، عہد شکنی کے مرتکب ہوئے، اور آپ کی سنت کو تبدیل کردیا۔''(۱)

ایرانی انقلاب کے شیعہ قائد خمینی کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''ہم ایسے خدا کی پرستش نہیں کرتے جو یزید ومعاویہ اور عثمان جیسے ظالموں اور بدقماشوں کو امارت وحکومت سپرد کردے۔''(۲)

اصحاب محمد (ﷺ) کے متعلق شیعوں کے عقائد ان کی خباثت اور ان کے بغض عناد کو سمجھنے کے لیے چند مثالیں پیش کی گئیں، مزید تفصیلات کو بیان کرنا اپنے قلم وزبان کو آلودہ کرنے کے سوا کچھ نہیں، تاہم اس سلسلہ میں کوئی شیعوں کے متعلق نرم گوشہ رکھتا ہو تو اسے خمینی کے ممدوح مجلسی کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ ہے جس کی ستائش خمینی نے ان الفاظ میں کی ہے:

''فارسی کی وہ کتابیں جو مجلسی مرحوم نے فارسی داں ایرانی لوگوں کے لیے لکھی ہیں انھیں پڑھتے رہو تاکہ اپنے آپ کو کسی اور بے وقوفی میں مبتلا نہ کرو۔''(۳)

صحابہ کرام جن کے بارے میں ساتویں آسمان سے فیصلۂ خداوندی نازل ہو چکا ہے کہ اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی ہیں ﴿رضی اللّٰہ عنھم ورضوا عنه﴾ ان پاکیزہ نفوس کے بارے میں شیعوں کے خیالات اور ان کے اعتقادات کس قدر گھناونے اور لرزہ خیز ہیں! کیا ان شیعوں سے بڑھ کر احسان فراموشی و بہتان تراشی کی کوئی اور مثال ہو سکتی ہے؟!

(۱) کتاب الروضہ من الکافی: ۸/۵۹ (۲) کشف الاسرار: ۱۰۷ (۳) کشف الاسرار: ۱۲۱

امت محمدیہ-شیعوں کی نظر میں

شیعوں کی کتابوں میں اس کی صراحت موجود ہے کہ جس طرح صحابہ کرام نعوذ باللہ لعنت کے اور ان کی سب وشتم کے مستحق ہیں اسی طرح ان کے ماننے والے اور ان کے پیرو کار بھی ملعون ہیں اور شیعوں کے ازلی دشمن ہیں۔

شیعہ خود کے لیے مؤمن کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اور سنیوں کے لیے مسلم کا لفظ نیز عامہ/ عامۃ الناس اور ناصبی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

شیعہ مجتہد سید نعمت اللہ جزائری لکھتے ہیں کہ حضرت جعفر صادقؒ نے فرمایا:

''ناصبی وہ ہے جو اے شیعہ تمھیں اچھا نہ سمجھتا ہو اور تم سے بغض وعداوت رکھتا ہو، ناصبی کی علامت یہ ہے کہ وہ حضرت علیؓ پر دوسروں کو فضیلت دیتا ہے۔''(۱)

شیعوں کا عقیدہ ہے کہ سنی دائرہ اسلام سے خارج اور کافر ہیں، چنانچہ شیعوں کی معتبر کتاب ''الاستبصار'' میں موجود ہے:

''کسی نے امام محمد باقرؒ سے پوچھا کہ کیا کسی شیعہ عورت کا نکاح کسی ناصبی یعنی سنی سے کر سکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں! لان الناصب کافر'' کیونکہ ناصبی کافر ہے۔''

''ناصبی سے نہ نکاح کرو، نہ نکاح دو، نہ ان کا ذبح کیا ہوا جانور کھاؤ اور نہ ان کے ساتھ رہن سہن اختیار کرو۔''(۲)

اہل سنت والجماعت سے متعلق شیعوں کے عقائد ونظریات، اور ان کے دلوں میں پنپ رہی اسلامی عداوت کو مزید سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو یہ چند روایتیں:

---

(۱)الأنوار النعمانية:۲/۳۰۷ (۲)الاستبصار:۳/۱۸٤

شیعوں کے علاوہ سب حرامی

”ان الناس کلهم أولاد الزنا أو قال بغایا ماخلا شیعتنا۔“ (۱)

(سارے لوگ حرام کی اولاد ہیں۔ یا فرمایا: زانی وبدکار ہیں سوائے ہم شیعوں کے)

کتے سے بھی بدتر

”حضرت جعفر صادق نے فرمایا: وہاں غسل نہ کرو جہاں غسل کا پانی گرتا اور جمع ہوتا ہے، کیونکہ وہاں ولد الزنا سنی کا دھوون ہوتا ہے، اور سنی ولد الزنا سے بھی بدتر ہے، یہ یقینی بات ہے کہ خدا نے کوئی مخلوق کتے سے زیادہ بری نہیں پیدا کی اور سنی خدا کے یہاں کتے سے بھی زیادہ ذلیل وخوار ہے۔“ (۲)

کافر اور واجب القتل

”تمام شیعوں کا اس بات پہ اتفاق ہے کہ تمام بدعتی (اہل سنت کو شیعہ بدعتی مانتے ہیں) کافر ہیں، اور امام پر لازم ہے کہ اقتدار پا کر ان سے توبہ کرائے، اور دین حق (یعنی شیعیت) کی طرف بلا کر حجت پوری کرے، اگر وہ اپنے مذہب سے توبہ کرلیں اور راہ راست پر آجائیں تو قبول کرے ورنہ ان کو قتل کردے اس لیے کہ وہ مرتد ہیں ایمان سے، اور جو کوئی ان میں سے اُسی مذہب پر مرجائے وہ جہنمی ہے۔“ (۳)

سنی اور مشرک یکساں ہیں

”اس شیعی ایمان کے مقابل کفر ہے اس میں تمام مذاہب باطلہ کے سب فرقے شامل ہیں، جیسے عام کفار، منافقین، مشرکین اور سنی مسلمان۔“ (۴)

سوچنے کا مقام ہے کہ جو قوم اپنے دلوں میں اس قدر بغض وکینہ رکھے ہو کیا اس سے کسی طرح کے خیر کی امید کی جاسکتی ہے؟!

---

(۱) روضۃ الکافی: ۸/ ۱۳۵ (۲) حق الیقین: ۵۱۶ (۳) ایضاً: ۵۱۹ (۴) ایضاً: ۵۳۷

شیعوں کی مذہبی عیدیں

اللہ کے رسول (ﷺ) نے امت مسلمہ کے لیے صرف دو عید متعین فرمائی ہیں، عید الفطر اور عید الاضحیٰ، اور آج پوری دنیا کے مسلمان صرف انہیں دونوں عیدوں کو اپنا مذہبی تیوہار مانتے ہیں اور اس دن خوشیاں مناتے ہیں، لیکن شیعوں کے نزدیک ان دونوں عیدوں کے علاوہ بھی عیدیں ہیں جن کو وہ خاصی اہمیت دیتے ہیں، اور ان کے فضائل میں اپنے ائمہ کے حوالے سے بہت سی روایتیں بھی بیان کرتے ہیں، ان کے مشہور عیدوں کے نام ہیں: عید غدیر، عید زہراء، عید مباہلہ، عید بابا شجاع اور عید نوروز۔

عید غدیر

شیعوں کے خود ساختہ تیوہاروں میں سب سے اہم ترین ''عید غدیر'' ہے، یہ عید ہر سال ۱۸/ ذی الحجہ کو منائی جاتی ہے، شیعوں کا عقیدہ ہے کہ اس دن اللہ کے رسول (ﷺ) نے حضرت علی کے سر پر امامت کا تاج رکھا تھا اور فرمایا تھا ''من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ''۔ (جس کا میں مولیٰ ہوں علی بھی اس کے مولیٰ ہیں)

امام ابو عبد اللہ کہتے ہیں:

''عید غدیر خم کا دن افضل ترین عید ہے، اور یہ ذی الحجہ کی ۱۸/ تاریخ کو ہوتی ہے۔''(۱)

شیعہ شیخ عبد اللہ العلایلی کہتے ہیں:

''بلا شبہ عید غدیر اسلام کا ایک جزء ہے، جس نے اس عید کا انکار کیا اس نے گویا اسلام کا انکار کیا۔''(۲)

---

(۱) وسائل الشیعة جلد ۷ صفحه نمبر ۳۸۰-۳۸۱ حدیث نمبر ۱۸

(۲) الشیعة فی المیزان صفحه ۲۵۸ حاشیه نمبر ۱

علامہ محمد جواد مغنیہ شیعہ لکھتے ہیں:

"بے شک ہمارا اس روز عید منانا قرآن کریم کی حقیقت اور نبی معظم کی سنت کی خوشی منانا ہے، اس دن عید کرنا درحقیقت اسلام اور یوم اسلام منانا ہے، یقیناً اس روز عید منانے سے روکنا دوسرے الفاظ میں کتاب وسنت پر عمل کرنے سے روکنا ہے، اسلام کی تعلیمات اور اس کی مبادیات سے روکنا ہے۔"(۱)

عیدزہراء

ہر سال ۹/ ربیع الاول کو خوشیاں منائی جاتی ہے اور صحابہ کرام بالخصوص حضرت عمر الفاروق کی شان میں گستاخیاں کی جاتی ہیں اور تبرا کیا جاتا ہے۔

شیعہ کی کتابوں میں اس دن خوشی منانے کا تذکرہ ضرور موجود ہے لیکن اس کے اسباب حتمی طور پر مذکور نہیں ہیں، اسی لیے اس سلسلہ میں مختلف باتیں بیان کی جاتی ہیں، ایک وجہ یہ ہے کہ اسی تاریخ کو آنحضرت (ﷺ) نے حضرت خدیجہ سے شادی کی تھی اور حضرت فاطمہ زہراءؓ ہر سال اس دن خوشی مناتی تھی، دوسری وجہ یہ ہے کہ اسی تاریخ کو شیعوں کے بارہویں امام دنیا کے سامنے ظاہر ہوں گے، لیکن یہ دونوں اسباب سے عوام شیعہ ناواقف ہیں۔

البتہ عام طور پر اس دن خوشیاں منانے والے شیعہ عوام کا عقیدہ ہے کہ حضرت عمر الفاروقؓ کی وفات اسی دن ہوئی تھی، اور وہ اہل بیت کے سب سے بڑے دشمن تھے اس لیے ان کی وفات کے دن خوشی منانا ایمانی تقاضا ہے، اور چونکہ اہل بیت میں سب سے زیادہ مظلوم حضرت فاطمہ زہراء ہیں اس لیے سب سے زیادہ خوشی کی حقدار وہی ہیں، بس اسی وجہ سے اس دن کو "عید زہراء" کے نام سے موسوم کیا گیا۔

حضرت عمر الفاروقؓ کے سلسلہ میں سنیوں اور اکثر شیعوں کو اتفاق ہے کہ ان کی

(۱)الشیعة فی المیزان:۲۵۸

شہادت ۹/ ربیع الاول کونہیں ہوئی ہے، بلکہ ۲۴یا۲۹ ذی الحجہ کو ہوئی ہے۔ تاہم کسی غلط فہمی یا کسی ضعیف روایت کی بنیاد پر شیعہ عوام میں یہ تصور عام ہو گیا ہے۔

اس نظریہ کو تقویت پہنچانے والی یہ روایت بھی ملاحظہ ہو:

''۹/ ربیع الاول سے متعلق راوی حذیفہ کہتے ہیں: میں نے امیر المؤمنین کو دیکھا کہ اپنے فرزند امام حسن وحسین کے ساتھ ہیں اور وہ رسول مقبول (ﷺ) کے ساتھ غذا تناول فرمارہے ہیں، اور پیغمبر (ﷺ) دونوں کے چہروں کو دیکھ کر مسکرارہے ہیں، اور امیر المؤمنین کے دونوں صاجزادوں سے فرمارہے ہیں کہ کھاؤ، آج کا دن مبارک ہو، کیونکہ آج کا دن وہ دن ہے کہ خداوندے عالم اس دن تمہارے اور تمہارے جد کے دشمن کو ہلاک کرے گا، اور تمہاری ماں کی دعا قبول فرمائے گا، کھاؤ آج ہی کے دن کلام خدا تحقق پائے گا، کھاؤ آج کے دن خداوندے عالم تمام اعمال دشمناں کو لائے گا اور اس کو مثل روئی اڑادے گا۔''(۱)

عید مباہلہ

مباہلہ یعنی حق وباطل کے اثبات کے لیے دونوں فریق کا اپنی اپنی ہلاکت کی قسمیں کھانا، تاریخ وسیر اور تفسیر کی کتابوں میں مباہلہ کا واقعہ مذکور ہے جو کہ نجران کے عیسائیوں کے ساتھ پیش آیا۔

۹ھ میں عیسائیوں کا ایک وفد آنحضرت (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ (ﷺ) نے وفد کا اعزاز کیا اور دلائل سے سمجھایا، جب انھوں نے انکار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مباہلہ کی دعوت دی اور حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ اور حضرات حسنینؓ کو لے کر نکلے، جب وفد کے سب سے بڑے عالم نے دیکھا تو کہا کہ خدا کی قسم میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ پہاڑ ٹلنے کی دعا کریں تو ٹل جائے، پھر وفد کو خطاب

(۱) الانوار النعیمیۃ جلد ا صفحہ ۱۱۰، بحار الانوار جلد ۳۱ صفحہ ۱۲۲ و جلد ۹۸ صفحہ ۳۵۲

کر کے کہا کہ ان سے مباہلہ کرنا پوری قوم کو ہلاک کرنا ہے چنانچہ انھوں نے معذرت کرلی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کا عذاب ان کے قریب آ گیا تھا اگر یہ مباہلہ کرتے تو ان کی صورتیں بھی مسخ ہو جاتیں۔

اس موقع پر اللہ کے رسول (ﷺ) نے اپنے ہمراہ صرف حضرت علی و فاطمہ اور حضرت حسن اور حضرت حسین کو لیا تھا جس سے ان کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، اس واقعہ کی نسبت سے شیعہ ''پنجتن پاک'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور اس دن کی مناسبت سے ۲۴/ ذی الحجہ کو خوشیاں مناتے ہیں۔

عید بابا شجاع

امیر المؤمنین حضرت عمر الفاروقؓ کو شہید کرنے والے ملعون کا نام ابولؤلؤ فیروز مجوسی تھا، شیعوں کے اعتبار سے ابولؤلؤ کا کارنامہ بہت ہی جرأت و بہادری کا کام تھا اس لیے انھوں نے اسے ''بابا شجاع الدین'' کا لقب دیا ہے، ایران کے شہر کاشان میں ایک قبر ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ حضرت عمر الفاروقؓ کے قاتل ابولؤلؤ کی قبر ہے، اس کے آستانہ کی دیواروں پر یہ عبارت کندہ ہے: ''مرگ بر ابوبکر، مرگ بر عمر، مرگ بر عثمان''، یعنی ابوبکر و عمر و عثمان مردہ آباد (نعوذ باللہ من ذلک)۔

حضرت عمرؓ کی شہادت کی خوشی میں شیعہ ابولؤلؤ کے مزار پر حاضر ہوتے ہیں، دھوم دھام سے خوشیاں مناتے ہیں، روپئے پیسوں اور نذرانوں کے ڈھیر لگاتے ہیں۔ خاص کر ''عید زہراء'' میں اس مزار پر زبردست دھوم ہوتی ہے، اور سبھی شیعہ زبانیں تبراء میں آلودہ ہوتی ہیں۔(۱)

عید نوروز

نوروز یعنی شمسی سال کے آغاز اور بہار کی آمد کا نیا دن، یہ دن ایران کی ہزار سالہ

(۱) تحقیق و انصاف کی عدالت میں مظلوم اہل بیت کا مقدمہ (مترجم) از محمد حسین موسوی: ۱۱۷

زرتشتی تہذیب کا ایک حصہ ہے، خاص کر ایران کے مجوسی اور اس کے ہمسایہ ملکوں میں اس دن جشن منایا جاتا ہے، اور چونکہ شیعیت بھی مجوسیوں کی ہی پروردہ ہے اس لیے اس میں بھی اس دن کی بڑی اہمیت ہے، اور اسے مذہبی رنگ دینے کے لیے مختلف طرح کی روایتیں گڑھ کر اپنے ائمہ کی جانب منسوب کردیں۔ ملاحظہ ہو:

شیخ طوسی اپنی کتاب " مصباح التهجد "میں نقل کرتے ہیں:

''معلّٰی بن خنیس نے امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ نوروز کے دن غسل کرنا پاکیزہ ترین لباس پہننا خوشبو لگانا، روزہ رکھنا، ظہر وعصر اور ان کی نوافل کے بعد چار رکعت ادا کرنا (جس کی خاص ترکیب بھی ذکر ہے)، اور نماز کے بعد خداوند متعال سے اپنے پچاس سالہ گناہوں کو بخش دینے کی درخواست کرنا چاہیے۔''(۱)

اس کے علاوہ کتاب مہذب میں معلّٰی بن خنیس سے ہی مروی ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا کہ اسی دن پیغمبر اسلام نے لوگوں سے غدیر خم میں حضرت علی کے لیے بیعت لی تھی............ یہ وہ دن ہے جس دن ہمارے قائم اپنے کارندوں کے ساتھ ظہور کریں گے، خداوند متعال انھیں دجال کو شکست دینے میں کامیابی عطا کریں گے اور وہ دجال کو کوفہ میں سولی پر چڑھائیں گے، کوئی ایسا نوروز نہیں جس میں ہم اپنے امام کے ظہور کی امید نہ رکھتے ہوں،..................''(۲)

امام جعفر صادق نے فرمایا:

''نوروز کے دن عیدین کی طرح غسل کرنا اور روزہ رکھنا مستحب ہے''(۳)

---

(۱)وسائل الشيعة:۱۷۳/۸ (۲)وسائل الشيعة:۱۷۳/۸

(۳) تحرير الوسيلة:۱/۹۸-۹۹- ۱۵۲

یہودیت اور شیعیت کا باہمی امتزاج

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے حواریوں نے ان کے دعوتی مشن کو قائم رکھا اور عیسائیت کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا، رفتہ رفتہ عیسائیت پھیلنے لگی، اور مختلف علاقوں کا وہ مقبول عام مذہب بن گئی، جس کے نتیجہ میں یہودیوں کا مذہبی رسوخ مٹنے لگا جو ان کی مذہبی چودھراہٹ کے لیے خطرہ کا ایک سائرن تھا، اس بات کو یہودیوں کے تخریبی وسازشی ذہن نے بہت سنجیدگی سے لیا اور پھر عیسائیت کے خلاف نہ صرف سازشیں رچیں، رکاوٹیں کھڑی کیں بلکہ عیسائیت کے لبادہ میں اپنے کارندے کھڑے کیے، جنھوں نے عیسائیت کا رخ ہی موڑ دیا، اور ایک آسمانی مذہب کو مختلف اوہام وخرافات کا مجموعہ بنا دیا، عبادات کی شکلیں بگڑ گئیں، قدروں کے پیمانے بدل گئے، صلیب کو تقدس کا درجہ حاصل ہوا اور توحید کی جگہ پوری عیسائیت ''عقیدۂ تثلیث'' (Trinity) کے ناقابل فہم فلسفہ پر قائم ہوگئی، اس طرح عیسائیت ایک ایسے مذہب میں تبدیل ہوگئی جس کی تراش خراش یہودیوں نے اپنے مزاج کے موافق کی، اور اس کا بانی معروف عیسائی پادری ''سینٹ پال'' قرار دیا گیا جو حقیقت میں عیسائیت کے بھیس میں ایک کٹر یہودی ایجنٹ تھا۔

عیسائیت کے بعد یہودیوں کا واسطہ مذہب اسلام سے پڑا، اسلام کی آمد سے یہودیوں کی سیاسی چودھراہٹ اور مذہبی تسلط دونوں پر کراری ضرب پڑی جس سے یہودی سامراج بوکھلا گیا، چنانچہ اس نے اسلام کے بڑھتے رسوخ کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی، جنگیں کیں، بغاوتیں کیں، غداریاں کیں، منافقین کی ٹولی بھی تیار کی، حتی کہ

نبی کریم (ﷺ) کو قتل کرنے کی سازش تک رچ ڈالی، لیکن جب کوئی حربہ کارگر نہ ہوسکا تو وہی پالیسی اختیار کی جس کا تجربہ عیسائیت کے ساتھ ہوچکا تھا، اور سینٹ پال کی طرح عبداللہ بن سبا کو اسلامی صف میں لا کھڑا کیا۔

عبداللہ ابن سبا نے خاص کر ان عجمیوں کو نشانہ بنایا جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے، محبت اور غلو ان کی سرشت میں داخل تھا، ایک لمبے عرصہ تک مختلف مذاہب اور حکمرانوں کی غلامی میں رہ کر ان کا ذہن غلامی کا عادی اور شخصیت پرست بن چکا تھا، ان کی گردنیں ہر حکم عالی کے سامنے خم ہونے کو تیار رہتی تھیں، اس کے علاوہ مرکز اسلام حجاز مقدس سے دوری کی وجہ سے وہ اسلامی مزاج سے بالکل ناآشنا تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن سبا کی کوششوں اور سازشوں سے ایک نئے انداز کے لوگ سامنے آئے جن کا مزاج نکتہ چینی، عیب جوئی، بغاوت اور جذباتیت کا عکاس تھا، ابن سبا کے ہمنواؤں نے ان کا بھرپور استعمال کیا اور پورا عالم اسلام خانہ جنگی کی بھینٹ چڑھ گیا۔

عبداللہ ابن سبا نے یہودیت کے خام مال اور مجوسیت کے رنگ وروغن سے ایک نیا سانچہ تیار کیا جس میں اپنی جماعت کو ڈھال کر اس نے دنیا کے سامنے پیش کیا، آج اسی جماعت کو ہم ''شیعہ'' کے نام سے جانتے ہیں، جس کی جڑوں میں یہودیت اس قدر پیوست ہوچکی ہے کہ اس کے بغیر شیعیت کا وجود ہی نہیں۔ شیعیت کی گہری سازشوں اور اس کے مقاصد کو بخوبی سمجھنے کے لیے ان حقائق کو جاننا ضروری ہے جو یہودیوں اور شیعوں کے مابین مشترک ہیں:

غلو ومبالغہ آرائی

یہودیوں کے امراض اور ان کی خرابیوں کو قرآن مجید نے بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے، ان کی ایک بنیادی صفت غلو ومبالغہ آرائی ہے، قرآن مجید کہتا ہے:

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ﴾ (النساء: ۱۷۰)

(اے اہل کتاب اپنے دین میں غلومت کرو اور اللہ کے بارے میں وہی بات کہو جو ٹھیک ہو)

ایرانی انقلاب کے رہنما جناب خمینی لکھتے ہیں:

”وان من ضروريات مذهبنا أن لأئمتنا مقاما لايبلغه ملك مقرب ولا نبي مرسل“ (۱)

(اور ہمارے مذہب کی بنیادوں میں سے یہ عقیدہ بھی ہے کہ ہمارے اماموں کو وہ مقام حاصل ہے جہاں تک کوئی مقرب فرشتہ یا نبی مرسل بھی نہیں پہنچ سکتا)

”فان للامام مقاما محمودا ودرجة سامية وخلافة تكوينية تخضع لولايتها وسيطرتها جميع ذرات الكون“(۲)

(امام کو وہ مقام محمود، مرتبہ عالی اور حکومت تکوینی حاصل ہوتی ہے جس کی طاقت وشوکت کے سامنے کائنات کا ذرہ ذرہ سرنگوں ہوتا ہے)

دینی رہنماؤں کو خدا بنانا

﴿اتَّخَذُواْ أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ﴾(التوبة: ۳۱)

(انھوں نے اپنے علماء اور اپنے بزرگوں کو اللہ کے علاوہ رب بنالیا)

اصول کافی میں امام جعفر صادق کے حوالہ سے روایت ہے:

”وِلايتُناولاية الله التى لم يبعث نبى قط الا بها“ (۳)

(ہماری ولایت وحکومت اللہ کی ولایت وحکومت کی طرح ہی ہے، جو بھی نبی بھیجا گیا وہ اسی کو لے کر بھیجا گیا)

حضرت جعفرؒ ہی کے حوالہ سے مزید لکھتے ہیں:

---

(۱)الحكومة الاسلامية :۵۲ (۲)الحكومة الاسلامية :۵۲ (۳)اصول کافی:۱:۲۷۶

''دنیا اور آخرت امام کے قبضۂ اختیار میں ہیں، جسے چاہے اور جو چاہے عطا کردے۔''(۱)

احساس برتری

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى نَحْنُ أَبْنَاء اللّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ﴾(المائده:۱۸)
(اور یہود و نصاریٰ نے کہا کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں)
﴿وَقَالُواْ لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلاَّ مَن كَانَ هُوداً أَوْ نَصَارَى تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُواْ بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾(البقرة:۱۱۱)
(اور وہ بولے کہ جنت میں تو وہی داخل ہوں گے جو یہودی یا عیسائی ہیں، یہ صرف ان کی تمنائیں ہیں، آپ فرما دیجیے کہ اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کردو)

شیعہ بھی خود کو سب سے افضل اور باقی سب کو حقیر سمجھتے ہیں، کافی میں مذکور ہے:

"ان الناس كلهم أولاد الزنا او قال بغايا ماخلا شيعتنا۔" (۲)
(سارے لوگ حرام کی اولاد ہیں۔ یا فرمایا: زانی و بدکار ہیں سوائے ہم شیعوں کے)

یہودیوں کی طرح شیعہ کو بھی عذاب الٰہی کا کوئی خوف نہیں، وہ بغیر حساب کتاب کے جنت میں جائیں گے، کیونکہ وہ محبان اہل بیت اور شیعان علیؓ ہیں:

شیعہ مفسر قمی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: قیامت کے دن امیر المؤمنین علی علیہ السلام کو آواز دی جائے گی، وہ لبیک کہیں گے، پھر باقی تمام ائمہ کو آواز دی جائے گی، پھر شیعان علی کو، اور وہ اپنے اماموں کے ساتھ بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔''(۳)

(۱)أصول الكافي:۴۰۹/۱ (۲)الروضة من الكافي:۱۳۵/۸ (۳)أيضاً:۱۲۸/۱

تحریف کتاب

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واسطہ سے یہودیوں کو تورات عطا کی، جس میں ان کے لیے نصیحت اور ہر معاملہ میں ہدایت موجود تھی، لیکن انھوں نے اس میں من چاہی تحریفات کر دیں اور پوری تورات کو الگ الگ ورق میں کر دیا تا کہ حسب ضرورت ان اوراق کو پیش کیا جائے یا چھپا لیا جائے، ان کی ان حرکتوں کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان کیا ہے:

﴿قَالُواْ مَا أَنزَلَ اللّهُ عَلَى بَشَرٍ مِّن شَيْءٍ قُلْ مَنْ أَنزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاء بِهِ مُوسَى نُوراً وَهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ تُبْدُونَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيراً﴾ (الانعام: ۹۱)

(وہ بولے کہ اللہ نے انسانوں پر تو کچھ اتارا ہی نہیں آپ پوچھئے کہ موسیٰ جس کتاب کو لوگوں کی ہدایت اور روشنی کے لیے لے کر آئے وہ کس نے اتاری تم اس کو ورق ورق کر کے دکھاتے ہو اور بہت کچھ چھپا جاتے ہو)

﴿يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَنَسُواْ حَظّاً مِّمَّا ذُكِّرُواْ بِهِ﴾

(المائدۃ: ۱۳)

(وہ (خدا کی) باتوں تحریف کرنے لگے اور جو کچھ ان کو نصیحت کی گئی تھی اس کا (بڑا) حصہ انھوں نے فراموش کر دیا)

اہل اسلام کو اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتاب قرآن مجید عطا کی، دنیا کے سارے مسلمان اس کتاب پر، اس کے ایک ایک حرف پر، اس کی صداقت وحقانیت پر کامل یقین رکھتے ہیں، اور قرآن مجید کے کسی بھی جزء کے انکار کرنے والے کو اسلام سے خارج شمار کرتے ہیں، یعنی قرآن مجید پر یقین رکھنا ایمان کا اہم جزء ہے، لیکن شیعہ حضرات کھلے طور پر اس قرآن مجید کا انکار کرتے ہیں اور اس میں تحریفات کا عقیدہ رکھتے ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ موجودہ قرآن اصلی قرآن نہیں ہے، اور جو قرآن موجود

ہےاس میں وہ مختلف طرح کی ظاہری ومعنوی تحریفات کے قائل ہیں۔

شیعوں کے سب سے پہلے عالم سلیم بن قیس ہلالی (م۹۰ھ) نے اپنی کتاب ''کتاب سلیم بن قیس'' میں ایسی متعدد روایات درج کی ہیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ قرآن مجید میں تحریفات ہوئی ہیں، انہی روایات میں ایک روایت حضرت علی بن ابی طالبؓ کے حوالہ سے بھی درج ہے:

"ان الاحزاب تعدل سورة البقرة،والنور ستون مأة آية، والحجرات ستون آية، والحجر تسعون ومأة وآية فما هذا؟!(۱)

(سورہ احزاب مساوی تھی سورہ بقرہ کے، اور سورہ نور میں ایک سو ساٹھ آیات تھیں، سورہ حجرات میں ساٹھ آیتیں تھیں، سورہ حجر میں ایک سو نوے آیتیں تھیں، یہ سب تحریفات نہیں تو پھر کیا ہے؟)

حضرت جعفر صادق کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے:

ان القرآن الذی جاء به جبرئيل عليه السلام الى محمد (ﷺ) سبعةعشر ألف آية۔(۲)

(وہ قرآن جو جبرئیلؑ محمد (ﷺ) پر لے کر نازل ہوئے تھے اس میں سترہ ہزار آیتیں تھیں۔)

شیعی امام طبرسی نے یہاں تک لکھا ہے کہ قرآن مجید کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ پوشیدہ رکھا گیا ہے، اور تقیہ کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ سب کچھ ظاہر کر دیتے:

"لو شرحت لك كل ما أسقط وحرف وبدل مما يجری هذا المجری لطال وظهر ما تحضر التقية اظهاره من مناقب الأولياء ومثالب الأعداء۔" (۳)

---

(۱) كتاب سليم بن قيس :۱۲۲ (۲)أصول الكافی كتاب فضل القرآن باب النوادر
(۳) كتاب الاحتجاج:۲٥٤

(اگر میں تیرے سامنے حذف کیے گئے، تحریف وتبدیل کیے گئے ہر مقام کی مکمل تشریح کردوں تو کلام حد سے زیادہ لمبا ہوجائے، اور اولیاء کے فضائل اور دشمنوں کے عیوب ظاہر ہوجائیں لیکن اس کے اظہار میں تقیہ مانع ہے)

کتمان حق

یہودیوں کی ایک بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ حق کو چھپاتے تھے جس کی وجہ سے وہ لعنت کے مستحق قرار دیے گئے، شیعوں نے اسی کو مذہب سے جوڑ دیا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ﴾(البقرة:۱۵۹)

(یقیناً وہ لوگ جو ہماری اتاری ہوئی کھلی نشانیوں کو اور ہدایت کو چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم نے اس کو لوگوں کے لیے کتاب میں صاف صاف بیان کردیا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے ان پر لعنت کرتے ہیں)

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ (آل عمران:۷۱)

(اے کتاب والو! تم حق کو باطل کے ساتھ کیوں گڈمڈ کردیتے ہو اور جانتے بوجھتے حق کو چھپا جاتے ہو)

اصول الکافی میں امام جعفر صادق کا قول ہے:

"انکم علی دین من کتمه أعزه الله ومن أذاعه أذله الله۔" (۱)

(تم ایک ایسے دین پر ہو کہ جو شخص اس کو چھپائے گا اللہ تعالیٰ اس کو عزت عطا کریں گے، اور جو اس کو ظاہر وعام کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل ورسوا کرے گا)

---

(۱)أصول الكافی ، باب الكتمان:۲/۲۲۲

مسلمانوں سے سخت دشمنی

یہودیوں نے شروع سے ہی مسلمانوں کو اپنا سب سے بڑا حریف اور دشمن سمجھا، شیعوں نے بھی اسی روش کو اختیار کیا:

﴿لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُواْ الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُواْ﴾ (المائدة:۸۲)

(آپ لوگوں میں ایمان والوں کے ساتھ سب سے بڑھ کر دشمنی رکھنے والے یہودیوں اور مشرکوں ہی کو پائیں گے)

ابوجعفر کلینی اپنے پانچویں امام باقر کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"کان الناس أهل ردة بعد النبي (ﷺ) الا ثلاثة؛ فقلت ومن الثلاثة؟ فقال المقداد بن الأسود، وأبوذر الغفاری، وسلمان الفارسی رحمة الله علیهم وبرکاته"(۱)

آنحضرت (ﷺ) کی وفات کے بعد سارے صحابہ مرتد ہوگئے سوائے تین کے، راوی نے پوچھا کہ وہ تین کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: مقداد بن اسود، ابوذر غفاری، اور سلمان فارسی، ان پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں)

ملا باقر مجلسی اپنے امام غائب کے کارنامے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقتیکہ قائم علیہ السلام ظاہری شود پیش از کفار ابتداء بہ سنیان خواہد با علماء ایشاں وایشاں را خواہد کشت۔"(۲)

(جس وقت مہدی علیہ السلام ظاہر ہوں گے تو کافروں سے پہلے وہ سنیوں اور ان کے علماء سے کارروائی شروع کریں گے، اور ان سب کو قتل کردیں گے)

---

(۱) کتاب الروضة:۱۱۵ (۲) حق الیقین:۱۳۸

مسلمانوں کی تکفیر

یہودی اپنے علاوہ سب کو کافر قرار دیتے ہیں، ملاحظہ ہو یہ روایتیں:

"كل الشعوب ماعدا اليهود وثنيون وتعاليم الحاخامات مطابقة لذلك۔"(۱)

(تمام غیر یہودی اقوام بت پرست ہیں، اور حاخامات کی تعلیمات اس کے عین مطابق ہیں۔)

"النعيم مأوى اليهود ولا يدخل الجنة الا اليهود، أما الجحيم فمأوى الكفار من المسيحين والمسملين، ولا نصيب لهم فيها سوى البكاء لما فيها من المظلوم والعفوفة۔"(۲)

(جنت یہودیوں کا ٹھکانہ ہے، اور جنت میں یہودیوں کے سوا کوئی نہیں داخل ہوگا، اور جو جہنم ہے تو یہ کافروں یعنی عیسائیوں اور مسلمانوں کا ٹھکانہ ہے، اس تاریک اور بدبودار مقام میں ان کے لیے رونے کے سوا کچھ نہ حاصل ہوگا)

شیعوں کی نظر میں اہل اسلام دین سے خارج اور کافر ہیں، امام جعفر کے حوالہ سے روایت ہے:

"ما أحد على ملة ابراهيم الا نحن وشيعتنا وسائر الناس منها براء" (۳)

''ہمارے اور ہمارے شیعوں کے علاوہ کوئی بھی ملت ابراہیمی پر قائم نہیں ہے، سارے کے سارے لوگ اس سے لاتعلق ہیں۔''

اسی طرح کلینی نے "كتاب الروضة" میں حضرت علی ابن حسینؓ کے حوالہ سے یہ روایت ذکر کی ہے:

ليس على فطرة الاسلام غيرنا وغير شيعتنا وسائر الناس من

(۱)تلمود:۱۰۰ (۲) تلمود:٦٧ (۳) كتاب المحاسن:١٤٨ ازملا برقی

ذلك براء (۱)

(ہم اہل بیت اور ہمارے شیعوں کے علاوہ کوئی بھی فطرت اسلام پر نہیں ہے، باقی سارے لوگ اس سے محروم ہیں)

چونکہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ مسلمان اور کافر میں کوئی فرق نہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک مسلمانوں سے نکاح کرنا، ان کا ذبیحہ کھانا یا ان کے ساتھ میل ملاپ رکھنا درست نہیں ہے:

"عن فضيل بن يسار عن أبى جعفرقال ذكر الناصب فقال لا تنكحهم ولا تأكل ذبيحتهم ولاتسكن معهم۔"(۲)

فضیل بن یسار کا بیان ہے کہ امام جعفر صادق کے سامنے ناصبی (سنی) کا تذکرہ ہوا تو آپ نے فرمایا: نہ ان کے ساتھ نکاح کرو، نہ ان کا ذبیحہ کھاؤ اور نہ ان کے ساتھ بود و باش اختیار کرو)

خمینی کی یہ روایت بھی ملاحظہ ہو:

"وكذا لايجوز للمؤمن أن ينكح النصبية والغالية لأنهما بحكم الكفار وان انتحلا دين الاسلام۔"(۳)

کسی مومن (یعنی شیعہ) کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی ناصبی (سنی) یا غالی عورت سے نکاح کرے، کیونکہ یہ دونوں کفار کے زمرہ میں شامل ہیں، اگرچہ دونوں خود کو اسلام کی طرف منسوب کرتے ہوں۔)

شیخ صدوق نے ایان بن تغلب کی روایت ذکر کی ہے:

قال أبو عبدالله عليه السلام: كل ناصب وان تعبد اجتهد يصير الى هذه الآية : عاملة الناصبة تصلىٰ ناراً حامية۔" (٤)

(ابوعبداللہ نے فرمایا: ہر ناصبی (سنی) چاہے وہ کتنی ہی عبادت و ریاضت

---

(۱)الكافی، كتاب الروضه:۸/١٤٥ (۲)الاستبصار للطوسی:۳/١٨٤

(۳)تحرير الوسيلة:۲/۲٦٠ (٤)ثواب الأعمال والعقاب للصدوق:۲٤٧

کرلے، اس کا انجام اس آیت کے مطاق ہی ہوگا: ’’مصیبت جھیلتے ہوں گے، خستہ حال ہوں گے، جلتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔‘‘)

اس سلسلہ میں معروف ومستند شیعی عالم سید نعمۃ الجزائری کا قول سب سے معتبر اور جامع ہے وہ لکھتے ہیں:

”انهم كفار أنجاس باجماع علماء الشيعة الامامية، وانهم شر من اليهود والنصارىٰ وان من علامات الناصبي تقديم غير علي عليه في الامامة۔“ (۱)

(علمائے شیعہ امامیہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ اہل سنت سب کافر ہیں، نجس اور پلید ہیں، یہود ونصاریٰ سے بدتر ہیں، اور ناصبی (سنی) کی پہچان یہ ہے کہ وہ امامت میں حضرت علیؓ پر دوسروں کو فوقیت دیتا ہے)

عقیدۂ وصایت

یہودی اس بات کے قائل ہیں کہ نبی موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک وصی ہونا لازمی ہے، جو نبی کا قائم مقام بن کر بنی اسرائیل کی رہنمائی کرے، اس سلسلہ میں تورات اوران کی دیگر کتابوں میں ایسے نصوص موجود ہیں، جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی وفات سے قبل یہ حکم دیا تھا کہ وہ یوشع بن نون کو اپنا وصی مقرر کریں تا کہ ان کے بعد وہ بنی اسرائیل کی رہنمائی کریں:

’’رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: یوشع بن نون ایسے آدمی ہیں جن میں روح ہے، انھیں ساتھ لو اور ان پر ہاتھ رکھو، اور انھیں عازر کاہن اور بنی اسرائیل کی جماعت کے سامنے کھڑا کرو اور ان کے سامنے انھیں وصیت کرو، تو موسیٰ علیہ السلام نے اسی طرح کیا جس طرح ان کے رب نے انھیں حکم دیا تھا، یوشع کو ساتھ لیا، ان کے سامنے کھڑا کیا اور جس طرح

(۱) الأنوار النعيمية: ۲/ ۲۰۶-۲۰۷

رب نے کلام کیا تھا یوشع پر ہاتھ رکھا اور انھیں وصیت کی۔'' (۱)

اس روایت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نبی پر اپنا وصی متعین کرنا واجب ہے اور وصی کا انتخاب خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے۔

شیعوں کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ آنحضرت (ﷺ) کے لیے اپنا وصی متعین کرنا ضروری تھا، جس کا اعلان آپؐ نے غدیر کے موقع پر کیا، اور حضرت علیؓ کو وصی اور اپنا خلیفہ متعین کیا۔

شیعوں کی کتابوں میں اس کی بھی صراحت موجود ہے کہ وصی یعنی خلیفہ کا انتخاب خود اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے، اور ہر نبی کو حضرت علی کی وصایت دے کر مبعوث کیا گیا تھا۔ چنانچہ کلینی روایت کرتے ہیں:

حضرت علی کی وصایت تمام صحف انبیاء میں مکتوب ہے، اور ہر نبی کو محمد (ﷺ) کی نبوت اور حضرت علیؑ کی وصایت دے کر مبعوث کیا گیا تھا۔'' (۲)

اصول الکافی کتاب الحجہ میں ایک باب کا عنوان ہے:

”مـانـص الله عزوجل ورسوله على الأئمة عليهم السلام واحدا فواحدا۔“

(اللہ تعالیٰ نے اور رسول اللہ (ﷺ) نے اماموں پر یکے بعد دیگرے ایک ایک پر نص فرمائی ہے)

یعنی ہر امام کا ذکر اس کے نام کی صراحت کے ساتھ موجود ہے، اور یہ منطق اس لیے ہے کہ شیعوں کے عقیدہ کے مطابق نبی کی طرح امام بھی معصوم ہوتا ہے، اس سے چھوٹی بڑی کوئی بھی غلطی نہیں ہو سکتی، اور چونکہ عصمت ایک معنوی چیز ہے جس کا علم صرف اللہ کو ہے اس لیے انبیاء کی طرح امام کا بھی منصوص من اللہ ہونا ضروری ہے۔

---

(۱) سفر الاصحاح: ۲۷ (۲) کافی، کتاب الحجہ: ۱/ ۴۳۸

یہودی حکومت کا قیام

یہودیوں کو انتظار ہے ایک ''مسیح موعود'' کا جو آل داؤد میں سے ہوگا، وہ پوری دنیا پر حکمرانی کرے گا، تمام قبائل عرب کو غلام بنائے گا اور انھیں یہودیوں کی خدمت پر مامور کرے گا، پھر سارے حکمراں یہودیوں کے سامنے سرنگوں ہوں گے، انھیں دوبارہ عز وشرف حاصل ہوگا اور پھر پوری دنیا میں ان کا داؤدی نظام و یہودی شریعت نافذ ہوگی۔

ٹھیک اسی طرح شیعوں کو بھی انتظار ہے ایک ایسے حاکم (امام غائب) کا جس کی حکومت میں شیعوں کو عالمی اقتدار حاصل ہوگا، ان کے سارے دشمن تہہ تیغ کردیے جائیں گے اور پھر اس کی حکومت میں ''شریعت داؤدی'' کا نفاذ ہوگا چنانچہ شیعوں کے معروف عالم دین محمد بن یعقوب کلینی نے الکافی میں اس عقیدہ سے متعلق مستقل ایک باب ہی قائم کیا ہے، عنوان ہے:

"باب فی الأئمة اذا ظهر أمرهم حکموا بحکم داؤد وآل داؤد، ولا یسألون البینة۔"

(باب ائمہ کے سلسلہ میں کہ جب ان کا معاملہ غالب آئے گا تو وہ داؤد اور آل داؤد کے حکم کے مطابق فیصلے کریں گے، اور ان سے دلیل و گواہ نہیں پوچھا جائے گا)

کلینی کی یہ روایت بھی ملاحظہ ہو:

''بارہواں امام دوبارہ ظاہر ہوکر دنیا پر آل داؤد کی سی عقل وفراست اور طور طریق کے ساتھ حکومت کرے گا۔''(۱)

سوال یہی اٹھتا ہے کہ جب شریعت محمدیؐ موجود ہے، اور قیامت تک کے لیے

---

(۱) الکافی، کتاب الحجة باب:۹۸

وہی اللہ کی طرف سے متعین کردہ شریعت ہے، اور اس کے آنے کے بعد دوسری ساری شریعتیں منسوخ ہوچکیں تو پھر شیعوں کا امام شریعت داؤدی کا نفاذ کیوں کرے گا؟ اہل اسلام کی شریعت کو چھوڑ کر یہودیوں کی اس شریعت کا نفاذ کیوں ہوگا جو یہودی ہاتھوں سے کتر وبیونت کا شکار ہوچکی ہے، جس میں تحریفات وترمیمات کردی گئیں اور جو مختلف خامیوں اور نقائص سے پر ہوچکی ہے؟! یہ صرف اس لیے کہ شیعیت حقیقت میں یہودیت ہی کا پرتو ہے، یہودیت کی جڑوں کو مضبوط کرنے اور اسلام کی عمارت کو کمزور کرنے کے لیے اس کا وجود ہوا ہے۔

تبرکات انبیاء

یہودی قوم اپنے انبیاء کے تبرکات کو نہایت مقدس اور اپنے لیے فال نیک سمجھتی ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ جب تک یہ تبرکات ان کے دسترس میں تھیں انھیں عالمی اقتدار حاصل تھا اور دوسروں کی نگاہ میں وہ عزوشرف کے حامل تھے، لیکن یہ تبرکات گم ہوجانے کے بعد سے ان کے زوال کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔

شیعہ بھی ان تبرکات کو خاصی اہمیت دیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ساری تبرکات ان کے ائمہ کے پاس موروثی طور پر پہنچی ہیں، اور جب ''امام غائب'' کا ظہور ہوگا تو وہ ان تبرکات کے ساتھ رونما ہوگا:

کلینی روایت کرتے ہیں:

''امام کی تحویل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ہے۔''(۱)

ایک دوسری روایت ہے:

''حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیض جوان کے خاندان میں تھی وہ آخرکار منتقل ہوکر آل محمد کو ورثہ میں حاصل ہوئی۔''(۲)

(۱)الكافی، كتاب الحجة باب:٣٦ (۲)أيضاً: باب٣٧

تابوت سکینہ

تابوت سکینہ سے مراد وہ صندوق ہے جس میں تورات کی الواح، اور حضرت موسیٰ وحضرت ہارونؑ کی تبرکات موجود تھیں، جسے فرشتے اٹھائے ہوئے رہتے تھے، یہ تابوت یہودیوں کے نزدیک نہایت مقدس اور خاصی اہمیت کا حامل تھا، یہ تابوت ان کے عروج کی نشانی تھا، لیکن جب وہ ایمانی واخلاقی زوال کا شکار ہوئے تو یہ تابوت ان سے چھین لیا گیا اور وہ ذلت ونکبت میں گرفتار ہوگئے، بعد میں حضرت بادشاہ طالوت کے زمانہ میں وہ یہودیوں کو دوبارہ ملا، قرآن مجید میں اس کا تذکرہ موجود ہے:

﴿وَقَالَ لَهُمْ نِبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَن يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَى وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلآئِكَةُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾ (البقرة:٢٤٨)

(اوران کے نبی نے ان سے کہا کہ ان کی بادشاہت کی علامت یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ تابوت آئے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے سکینت ہے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں بھی ہیں جو آل موسیٰ اور آل ہارون چھوڑ گئے ہیں اس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے، یقیناً اس میں تمہارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو)

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ جب یہ تابوت انھیں دوبارہ حاصل ہوجائے گا تو ایک بار پھران کا دورعروج آجائے گا۔

اس تابوت سے شیعوں کو بھی خاص لگاؤ ہے، وہ نہ صرف اس تابوت پر ایمان رکھتے ہیں بلکہ خود اس کا وارث اور حقدار بھی مانتے ہیں۔

کلینی کی اس روایت سے شیعوں کا عقیدہ پوری طرح واضح ہوجاتا ہے:

''امام نے دعویٰ سے کہا کہ میرے قبضہ میں نبی کی تلوار، زرہ اور نیزہ ہے، میرے پاس حضرت موسیٰ کا عصا اور توریت کی لوحیں ہیں، میرے پاس

حضرت داؤد بن سلیمان کی انگشتری کے علاوہ وہ شئی بھی ہے جسے فرشتے
اٹھائے ہوئے تھے، اور بعد میں بنی اسرائیل کو واپس پہنچایا تھا۔''(۱)

اس مستند اقبالی بیان کے بعد مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں، دراصل یہ بیان یہودیت اور شیعیت کے افکار وعقائد میں یکسانیت و یک جہتی کا منھ بولتا ثبوت ہے۔

تو ارت وانجیل کا علم

شیعوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے ائمہ کو بنی اسرائیل کا علم وراثت میں ملا ہے تا کہ وہ اس کی اشاعت کر سکیں۔

کلینی روایت کرتے ہیں:

''امام نے فرمایا کہ ان کے پاس ''الجفر الابیض'' (سفید صندوق) ہے، جس میں داؤد کا زبور، موسیٰ کی تورات، اور عیسیٰ کی انجیل ہے، لیکن اس میں قرآن نہیں ہے۔''(۱)

''جب امام سے سوال کیا گیا کہ تورات وانجیل کا علم کہاں سے اور کس سے حاصل ہوا تو فرمایا: یہ علم ورثہ میں ملا ہے۔ پھر فرمایا: ائمہ ان صحیفوں کو ان انبیاء کی طرح اصل زبان میں پڑھتے اور سمجھتے ہیں جن پر وہ صحیفے نازل ہوئے ہیں۔''(۳)

مذکورہ وضاحتوں کو بعد یہ کہنا بالکل غلط نہیں کہ شیعیت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے ائمہ کو ان کتابوں کا علم ضرور ملا جو کتابیں بنی اسرائیل کو ملی تھیں لیکن سب سے اہم اور آخری آسمانی کتاب قرآن مجید کا علم ان کو نہیں ملا، کیونکہ یہودیت کو قرآن کی ضرورت نہیں ہے۔

---

(۱)الکافی، کتاب الحجة باب:۳۷ (۲)أیضاً،باب:۳۳ (۳)أیضاً،باب:۳۹

شیعوں کے
اعتراضات اوران کے جوابات

تلاش بسیار اور جستجوئے کامل کا خلاصہ یہ ہے کہ اس عالم کون ومکاں میں کوئی ذات ایسی نہیں جس کے حق میں بدزبانوں اور عیب چینوں نے زبان طعن وقدح دراز نہ کی ہو، حتی کہ دہریوں نے ذات الٰہی جل شانہ تک میں کلام کیا۔ معتزلہ نے انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی عصمت کا انکار کیا اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزماں (ﷺ) تک کو موضوع بنایا، یہودی فرقہ نے عصمت انبیاء کے سلسلہ میں یہی روش اختیار کی، نواصب وخوارج نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت کی شان میں یہی وطیرہ اختیار کیا، اور آخر میں ابن سبا اور مختلف فرقوں اور ناموں سے جانے گئے اس کے متبعین نے خلفائے ثلاثہ، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، اور کبار صحابہؓ کی شان عالی میں مطاعن کا دروازہ کھولا، اور گویا دنیا کو یہ باور کرانا چاہا کہ اللہ کے رسول (ﷺ) کی تیئس سال (۲۳) کی جہد مسلسل اور پیہم قربانیوں کے نتیجہ میں صرف چار شخص کے دل میں اسلام راسخ ہوا باقی سارے صحابہ کا ایمان نہایت کمزور تھا، اسی لیے آپ (ﷺ) کی وفات کے بعد سب کے سب مرتد ہوگئے، اور آپ (ﷺ) ایک صالح معاشرہ کی تشکیل میں پوری طرح ناکام رہے۔ (نعوذ باللہ من کل ذلک)۔

شیعوں نے رسول اللہ (ﷺ) کے جاں نثار اصحاب کو بدنام ومطعون کرنے کے لیے جو اعتراضات پیش کیے ہیں ان کا ایک جائزہ ملاحظہ ہو:

حدیثِ قرطاس

اللہ کے رسول (ﷺ) نے اپنی وفات سے چار دن قبل فرمایا تھا کہ کاغذ قلم لاؤ تاکہ میں ایک ایسی تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہوگے، اس سلسہ کی دو روایتیں بخاری شریف میں اس طرح موجود ہیں:

۱- حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جب رسول اللہ (ﷺ) کی وفات کا وقت آیا اور دولت کدہ میں لوگ جمع تھے جن میں عمر بن الخطابؓ بھی تھے، تو حضور (ﷺ) نے فرمایا کہ آؤ میں تمھیں ایک ایسی تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہوگے، پس حضرت عمر نے کہا کہ حضور (ﷺ) پر درد غالب ہے اور تمہارے پاس قرآن ہے اور اللہ کی کتاب ہمارے لیے کافی ہے، پس گھر والوں نے اختلاف کیا اور آپس میں جھگڑ پڑے، بعض کہتے تھے کہ (سامان کتابت) پاس رکھ دو تاکہ نبی کریم (ﷺ) تمہارے لیے ایسی تحریر لکھ دیں جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے، اور بعض ویسا کہتے تھے جیسا عمرؓ نے کہا۔ پس جب انھوں نے نبی (ﷺ) کے پاس شور واختلاف زیادہ کیا تو رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا اٹھ جاؤ۔ عبیداللہ راوی کا بیان ہے کہ حضرت ابن عباس کہتے تھے کہ مصیبت! کتنی بڑی مصیبت وہ چیز ہے جو ان کے اختلاف اور شور کی وجہ سے آپ (ﷺ) اور ان کے لیے تحریر لکھنے کے درمیان حائل ہوئی! (۱)

۲- حضرت سعید بن جبیرؓ سے روایت ہے کہ ابن عباسؓ نے کہا کہ جمعرات کا دن کیسا عجیب وسخت دن تھا! جمعرات کے دن نبی کریم (ﷺ) کی

---

(۱) بخاری: ۵۶۶۹

تکلیف سخت ہوگئی، پس آپ (ﷺ) نے فرمایا: لاؤ میں تمہارے لیے ایک ایسی تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے، تو ان لوگوں میں نزاع پیدا ہوگیا، اور کسی پیغمبر کے پاس جھگڑنا مناسب نہیں تھا، تو ان لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ (ﷺ) کی شان مبارک اور حال کیا ہے؟ کیا کبھی آپ (ﷺ) کی زبان مبارک سے پریشان کلام یا ہذیان نکلا ہے؟ آپ (ﷺ) سے دریافت کرلو، پس وہ معاملۂ کتابت آپ (ﷺ) کے سامنے دوبارہ پیش کرنے لگے، اس پر آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ مجھے چھوڑ دو کیونکہ میں جس حالت میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم بلا رہے ہو، اور آپ (ﷺ) نے ان کو تین باتوں کی وصیت کی کہ مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دو، اور ایلچیوں کو انعام دو جیسے میں دیا کرتا تھا، اور تیسری بات کے متعلق سعید بن جبیرؒ خاموش رہے، راوی کہتا ہے کہ میں بھول گیا۔(۱)

اعتراضات اور جوابات

ان دونوں روایتوں کی بنیاد پر شیعوں نے امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ پر درج ذیل اعتراضات کیے ہیں:

اعتراض: آنحضرت (ﷺ) کے فرمان کو رد کیا، آپ (ﷺ) کا فرمان وحی ہوا کرتا تھا اور وحی کو ٹھکرانا سراسر کفر ہے: ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى ، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى﴾ (النجم:۳-۴) (اور وہ خواہش سے نہیں کہتے، وہ تو صرف وحی ہے جو ان پر کی جاتی ہے)

جواب: حضرت عمرؓ نے آپ (ﷺ) کے فرمان کی مخالفت نہیں کی بلکہ ان کو آپ (ﷺ) کے آرام کی فکر تھی اور آپ کے حق میں کسی بھی طرح کی مشقت انھیں گوارہ نہ تھی، یہ فرط عقیدت اور غایت درجہ محبت کی ایک مثال ہے، اور ایسی ہی

(۱) بخاری: ۳۰۵۳، ۳۱٦۸

عقیدت ومحبت کی ایک مثال حضرت علیؓ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی پیش کی تھی جب آپ (ﷺ) نے انھیں کو حکم دیا تھا کہ ''رسول اللہ'' کا لفظ قلم زد کردو لیکن حضرت علیؓ اس پر راضی نہ ہوئے تھے، اگر یہ حکم نبوی کے خلاف ہے تو وہ بھی حکم نبوی کے خلاف تھا لیکن ہمارے نزدیک دونوں غایت درجہ کی محبت اور عقیدت کی مثال ہے......بس!

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ''اللہ کی کتاب ہمارے لیے کافی ہے'' یہ گویا اس آخری آیت کی طرف اشارہ ہے﴿ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الإِسْلَامَ دِيْناً ﴾یعنی جب دین مکمل ہو چکا تو حضور (ﷺ) کا کچھ تحریر کروانا صرف شفقت کی بنا پر تھا نہ کہ کوئی شرعی حکم تھا، اور محض شفقت کی خاطر حضور کو تکلیف میں ڈالنا مناسب نہیں۔

اس کے علاوہ اس موقع پر حضور کا فرمان ایک نبی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بشر کی حیثیت سے تھا، کیونکہ اگر یہ نبی کی حیثیت سے ہوتا تو آپ (ﷺ) کی بات وحی یعنی خدا کے حکم کے درجہ میں ہوتی، اور خدا کا پیغام پہنچانا نبی کا فرض ہے، اور یہ کیسے ممکن ہوتا کہ حضور کسی کے کہنے پر اپنی ذمہ داری سے کوتاہی فرماتے، جبکہ اس کے بعد بھی آپ کے پاس تین دن کا وقت تھا۔ نیز اگر یہ واقعی حکم خداوندی تھا تو آپ (ﷺ) اپنی زبان مبارک سے بھی ارشاد فرما سکتے تھے جیسے دیگر باتوں کی وصیت فرمائی تھی۔

اعتراض: آپ (ﷺ) کے لیے ہذیان گوئی کا لفظ استعمال کیا جو کہ سراسر نبی معصوم کی توہین ہے۔

جواب: پہلی بات تو یہ کہ روایت میں کہیں بھی اس کی صراحت نہیں ہے کہ یہ لفظ حضرت عمر کی زبان سے نکلا، بلکہ اس موقع پر جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے یعنی بعض لوگوں نے ایسا کہا۔

دوسری روایتوں میں یہ الفاظ استفہامیہ انکاریہ کے طور پر مذکور ہیں، یعنی ''کیا کبھی آپ (ﷺ) کی زبان مبارک سے پریشان کلام یا ہذیان نکلا ہے؟'' اسی لیے کہا

گیا کہ حضور سے دوبارہ دریافت کرلو جس پر آپ نے فرمایا: ''میں جس حالت میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم بلا رہے ہو۔''

تیسری بات یہ کہ ''ہذیان گوئی'' کی تعبیر متعصب اردو دانوں نے اختیار کی ہے ورنہ عربی میں ''ھجر'' کا لفظ اس موقع پر بولا جاتا ہے جب آواز صاف اور بات واضح نہ ہو خواہ گلا بیٹھنے کی وجہ سے یا تکلیف کی شدت وکمزوری کی وجہ سے۔

اعتــراض : حضور (ﷺ) کے سامنے جھگڑا کیا اور شور و ہنگامہ کیا، اور یہ ایسی گستاخی ہے جس پر خدا کی طرف سے گرفت ہوتی ہے، کیونکہ فرمان الٰہی ہے:

﴿ يٰٓاَ يُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾ (الحجرات:۲)

(اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز پر بلند مت کیا کرو، اور جس طرح تم ایک دوسرے کو زور زور سے پکارتے ہو اس طرح نبی کو زور سے مت پکارا کرو کہ کہیں تمہارے سب کام بیکار چلے جائیں اور تمہیں احساس بھی نہ ہو)

جواب: کسی بیمار کے پاس جب دس لوگ دھیمی آواز میں بھی گفتگو کریں گے تو بھی وہ ہنگامہ ہی محسوس ہوگی، اسی لیے آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ تم لوگ میرے پاس سے چلے جاؤ، اور ان میں حضرت عمر کے ساتھ حضرت عباس وحضرت علی بھی اور دیگر صحابہ بھی تھے، تو اکیلے حضرت عمر کو ہی مورد طعن ٹھہرانا کہاں کا انصاف ہے؟

اور عام طور پر جب کچھ لوگ مل کر کسی ایک موضوع پر بات کرتے ہیں تو اردو زبان میں سب کی ملی ہوئی آواز کو ہنگامہ اور رائے کے اختلاف کو جھگڑے سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے جو کہ اردو کی تنگ دامنی ہے، ورنہ جھگڑے اور ہنگامے کے لیے عربی میں دوسرے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

رہا سوال مذکورہ آیت کا، تو اس کا مفہوم ہے کہ جب نبی بات کریں تو تمہاری آواز ان کی آواز سے تیز نہیں ہونی چاہیے، یہ نہیں کہا گیا کہ نبی کی موجودگی میں تم بات ہی نہیں کر سکتے۔

اعتراض: امت مسلمہ کی حق تلفی ہوئی، اگر وہ تحریر لکھ لی گئی ہوتی تو آج امت گمراہی سے بچ جاتی اور انتشار وافتراق کا شکار نہ ہوتی۔

جواب: رسول اللہ (ﷺ) نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمادیا تھا کہ میں نے اپنی تبلیغ دین کی ذمہ داری پوری کردی ہے، اور اللہ کی طرف سے جو باتیں پہنچانی تھی وہ میں پہنچا چکا، پھر اتمام شریعت کی یہ آیت بھی نازل ہوئی تھی ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مرض الوفات میں حضور (ﷺ) جو بات کہنا چاہتے تھے وہ شریعت کا کوئی نیا حکم نہیں تھا۔

بالفرض مان لیا جائے کہ وہ خدائی پیغام تھا تو یہ حضور (ﷺ) کی شان میں گستاخی ہوگی، کیونکہ ایسی صورت میں یہ ماننا ہوگا کہ آپ (ﷺ) نے اپنی ذمہ داری پوری طرح ادا نہیں کی، اور خدا کے اس فرمان کی خلاف ورزی کی ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (اے رسول جو آپ پر اترا ہے اسے آپ پہنچا دیجیے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو اس کا پیغام آپ نے نہ پہنچایا، اور اللہ لوگوں سے آپ کی حفاظت فرمائے گا) اللہ نے لوگوں سے آپ (ﷺ) کی حفاظت کا وعدہ کیا پھر بھی آپ نے حضرت عمرؓ کے خوف سے یہ پیغام نہیں پہنچایا، جبکہ اس مجلس کے بعد آپ (ﷺ) کئی دن تک باحیات رہے، صرف اہل خانہ آپ کے پاس تھے، آپ ان سے بھی وہ اہم بات بیان کر سکتے تھے، لیکن آپ (ﷺ) نے کسی سے بیان کرنے کے بجائے اس دنیا سے تشریف لے گئے اور خدا کے اس اہم پیغام کو نہ بتانے کی وجہ سے امت مسلمہ انتشار واختلاف کا شکار ہے۔ العیاذ باللہ

اعتراض:- رسول اللہ (ﷺ) حضرت علی کی خلافت کی تصریح لکھانا چاہتے تھے، لیکن حضرت عمرؓ نے ایسا کرنے سے روک دیا۔

جواب: اگر رسول اللہ (ﷺ) کا منشاء حضرت علی کی خلافت لکھوانا تھا تو حضرت عباس نے حضرت علیؓ سے یہ کیوں کہا تھا:

"ہمارے ساتھ رسول اللہ (ﷺ) کے پاس چلو، ہم آپ سے دریافت کریں کہ کام (یعنی کارخلافت ونبوت) کس کے پاس رہے گا؟ اگر ہمارے (یعنی اہل خاندان) کے سپرد ہونے والا ہوتو ہم کو معلوم ہوجائے اور اگر ہمارے علاوہ کسی کے سپرد ہونے والا ہوتو ہم کو اس کا علم ہوجائے، اور آپ ہمارے بارے میں وصیت فرمادیں۔" (۱)

بالفرض ہم یہ مان لیں کہ آپ (ﷺ) حضرت علیؓ کی خلافت کے سلسلہ میں تحریر لکھوانا چاہتے تھے تو اس کا لازمی مفہوم یہی نکلے گا حدیث غدیر کی وہ روایت ناکافی تھی جس کو بنیاد بنا کر شیعہ حضرت علیؓ کی خلافت ثابت کرتے ہیں۔

پس یہ کہنا کہ آپ (ﷺ) حضرت علیؓ کی خلافت کے سلسلہ میں تحریر لکھوانا چاہتے تھے یہ صرف ایک مفروضہ ہے، جبکہ اس کے مقابل یہ وضاحت موجود ہے کہ آپ (ﷺ) یہ تحریر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حق میں لکھوانا چاہتے تھے جس کا اظہار آپ نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کیا تھا، آپؓ کہتی ہیں:

"قال رسول اللّٰه (ﷺ) في مرضه ادعي لي أبا بكر أباك، وأخاك، حتىٰ أكتب كتاباً، فإني أخاف أن يَتَمَنّى مُتمَنّ ويقول قائل: أنا أولىٰ، ويأبى اللّٰه والمؤمنون إلا أبابكر." (۲)

(رسول اللہ (ﷺ) نے اپنے مرض میں مجھ سے فرمایا کہ اپنے والد ابوبکر کو اور اپنے بھائی (عبدالرحمٰن) کو میرے پاس بلالو تاکہ میں ایک نوشتہ

(۱) بخاری: ۴۴۴۷، ۶۲۶۶ (۲) مسلم: ۶۳۳۲

(وصیت نامہ کے طور پر) لکھادوں، مجھے خطرہ ہے کوئی تمنا کرنے والا تمنا کرے اور کوئی کہنے والا کہے کہ میں زیادہ مستحق ہوں اور اللہ اور مؤمنین ابوبکر کے سوا کسی کو قبول نہ کریں گے)۔

لیکن بعد میں جب آپ کو یہ اطمینان ہوگیا کہ تقدیر الٰہی میں یہ طے ہو چکا ہے تو آپ (ﷺ) نے تحریر لکھوانے کا ارادہ ترک فرمادیا جیسا کہ علامہ بدرالدین عینیؒ نے عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں اسی حدیث قرطاس کی شرح میں لکھا ہے:

''امام بیہقیؒ نے بیان کیا ہے کہ سفیان ابن عیینہ نے (جو اس حدیث قرطاس کے ایک راوی ہیں) اہل علم سے نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ (ﷺ) نے ارادہ فرمایا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ مقرر فرمادیں، پھر آپ نے یہ معلوم ہونے پر کہ تقدیر الٰہی میں یہ طے ہو چکا ہے، اس کے لکھانے کا خیال ترک فرمادیا، جیسا کہ اسی مرض کے ابتداء میں (جب آپ نے فرمایا تھا: وا رأساہ!) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں تحریر لکھوانے کا خیال فرمایا تھا پھر لکھوانے کا خیال ترک فرمادیا تھا اور فرمایا تھا: "یأبی اللّٰہ والمؤمنون إلا أبابکر" (اور بجائے کچھ لکھوانے کے) آپ نے ان کو نماز کی امامت کرنے کا حکم فرمادیا (یہ گویا عملی استخلاف تھا)(۱)

نوٹ

مذکورہ سبھی اعتراضات کا مجمل اور الزامی جواب یہ ہے کہ یہ ساری باتیں اکیلے حضرت عمرؓ سے متعلق نہیں ہیں بلکہ اُن سبھی سے متعلق ہیں جو وہاں موجود تھے، اور بعد میں دو گروہ ہو گئے تھے، اور ان میں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ بھی شامل تھے۔

اختلاف کی صورت میں حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ اگر حضرت عمرؓ کے طرفدار رہے ہوں گے تو ایسی صورت میں شیعوں کا اعتراض ان پر بھی وارد ہوگا، اور اگر

(۱) عمدۃ القاری:۲/۱۷۱ طبع مصر

وہ حضرت عمرؓ کے مخالف رہے ہوں گے تب بھی اِس اعتراض سے نہیں بچ سکتے کہ جنھوں نے حضور کی موجودگی میں شور و ہنگامہ کیا ان میں آپ حضرات بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ امت کی حق تلفی کا مسئلہ تھا تو حضرت علیؓ کو پیش قدمی کرنی چاہیے تھی کیونکہ دولت خانۂ نبوت پر حضرت علیؓ ہی کتابت کی ذمہ داری ادا کرتے تھے۔اور حضرت علیؓ نے خود صراحت کی کہ اس حکم نبوی (ﷺ) کے مخاطب وہ خود بھی تھے، چنانچہ مسند احمد میں حضرت علیؓ کا یہ قول درج ہے:

"أمرني النبي صلى الله عليه وسلم أن آتيه بطبق (أي كتف) يكتب ما لا تضل أمته بعده."(۱)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو حکم فرمایا تھا کہ میں طبق (یعنی کتف) لے آؤں، تاکہ آپ ایسی تحریر لکھا دیں، جس کے بعد آپ کی امت کبھی گمراہ نہ ہو)۔

اور آپؓ کے اقدام سے کوئی چیز مانع نہ تھی کیونکہ آپؓ "اسد اللہ الغالب"، "لا فتی الا علی" اور "خیبر شکن" جیسے القاب سے نوازے جا چکے تھے۔اور اس مجلس کے بعد سے وفات تک آپ کے پاس وقت ہی وقت تھا۔اور اگر تھوڑا غور کیا جائے تو حضور (ﷺ) کے مخاطب بغیر کسی استثناء کے سب کے سب تھے،اس لیے اس مجلس کا ہر فرد قابل طعن ٹھہرے گا۔لیکن انصاف کی بات یہی ہے کہ ہر کسی کو آپ (ﷺ) کی راحت کا خیال تھا چاہے وہ حضرت ابوبکر وعمر رہے ہوں یا حضرت عباس وعلی یا دیگر اصحاب بیت، اور جو بات حضرت عمرؓ نے کہی تھی سب کا وہی منشا تھا، اور سب اسی پر راضی تھے۔اسی لیے ان حضرات میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے پر اعتراض نہیں کیا بلکہ آپ (ﷺ) کی وفات کے تین سو سال بعد شیعوں کے پیٹ میں مروڑ پیدا ہوئی اور انھوں نے ایسے لغو اعتراضات سے انتشار پھیلانے کی کوشش کی۔

(۱) فتح الباری: ۱/۱۰۶، طبع دہلی

قضیۂ سقیفہ بنو ساعدہ

اللہ کے رسول (ﷺ) کے انتقال کے فوراً بعد (تدفین سے قبل) قریش وانصار کے کچھ لوگ ''سقیفۂ بنی ساعدہ'' میں جمع ہوئے، اور خلافت کے مسئلہ پر ان میں زوردار بحث شروع ہوئی، چونکہ قریش کا تعلق آنحضرت (ﷺ) کے خاندان سے تھا اس لیے وہ خود کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے، اور انصار خود کو اس ذمہ داری کے لیے موزوں سمجھتے تھے کیونکہ اسلام کی اشاعت اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں انصار کا کلیدی کردار تھا، لیکن ساتھ ہی اوس وخزرج کی دیرینہ عداوت بھی اپنا رنگ دکھا رہی تھی، اور کوئی فریق نہیں چاہتا تھا کہ خلافت دوسرے کے پاس چلی جائے۔ اس سرگرمی کی اطلاع اوس کے ایک شخص نے حضرت عمرؓ کو دی، انھوں نے حضرت ابوبکرؓ سے بتایا جسے انھوں نے بڑی سنجیدگی سے لیا، اس وقت حضرت ابوعبیدہؓ بھی ان کے پاس ہی تھے، پس حضرت ابوبکرؓ نے دیگر اکابر صحابہ کو ساتھ لینے کا انتظار کیے بغیر انھیں کو ساتھ لیا اور سقیفۂ بنو ساعدہ چل دیے، ان کا ارادہ بس اتنا تھا کہ جسد مبارک کی تدفین تک خلافت کے مسئلہ کو مؤخر کرنے پر دونوں فریق کو آمادہ کرلیں، حضرت ابوبکرؓ پہنچے تو خلافت کا موضوع زیر بحث تھا، انصار خلافت پر اپنا حق جتلا رہے تھے۔ انصار قریش سے کہہ رہے تھے: "منا أمیر ومنکم أمیر" (ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک امیر تم میں سے ہو)

حضرت ابوبکرؓ نے اپنی بات رکھتے ہوئے انصار کے فضائل بیان کیے اور پھر کہا کہ اگر خلیفہ اہل مکہ میں سے نہ ہوا تو اسے عالم عرب قبول نہیں کرے گا اور کوئی احترام بھی حاصل نہ ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ امراء ہم قریش سے ہوں اور وزراء تم انصار سے ہوں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے اللہ کے رسول (ﷺ) کی یہ حدیث بیان کی کہ آپ (ﷺ) نے فرمایا تھا "الأئمة من قریش" یعنی

ائمہ قریش ہی میں سے ہوں گے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے کہا میں عمرؓ اور ابوعبیدہؓ کے نام تجویز کرتا ہوں، آپ انہیں میں سے کسی کو اپنا خلیفہ منتخب کر لیں۔

یہ سنتے ہی دونوں حیران ہو گئے، اور ان دونوں نے برجستہ و بیک زبان کہا:

''بخدا ایسا نہیں ہو سکتا، اس بار خلافت کو آپ کے ہوتے ہوئے ہم لوگ اٹھائیں، آپ ''ثانی اثنین'' ہیں اور نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب رہے، اور نماز مسلمانوں کے دین کا سب سے افضل رکن ہے، کون آپ پر پیش قدمی کر سکتا ہے اور آپ کے ہوتے ہوئے اس بار خلافت کو اٹھا سکتا ہے، ہاتھ بڑھائیے ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔'' (۱)

ان دونوں بزرگ شخصیتوں کے اس بیان واعتراف اور حق گوئی کا یہ اثر پڑا کہ انصار و مہاجرین کے مابین جو تلخی قائم ہو رہی تھی وہ یکلخت کافور ہو گئی، اور اس سے قبل کہ حضرت عمرؓ بڑھ کر بیعت کرتے حضرت بشیر بن سعد بن ثعلبہ خزرجیؓ نے ہاتھ آگے بڑھا دیا اور بیعت کر لی، اسی طرح انصار کی اوسی شاخ کے قائد حضرت اسید بن حضیرؓ نے بھی فوراً پیش قدمی کی اور اپنے اوسی بھائیوں کو بھی آمادہ کیا، ان سب نے بیعت کی، جوق در جوق لوگ آتے رہے اور بیعت کا سلسلہ جاری رہا، قبیلہ اسلم کی جماعتیں آئیں اور بیعت کا سلسلہ جاری رہا، مدینہ کی گلیاں تنگ ہو گئیں، لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے، قبیلہ اسلم کا حال دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عمومی نصرت کا یقین ہو گیا اور یہ یقین ہو گیا کہ اب اس مسئلہ میں نزاع نہیں رہا۔ (۲)

شیعوں کا کہنا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی یہ بیعت منصوبہ بندی کے ساتھ ہوئی تھی، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ اچانک پیش آیا تھا، اور حضرت ابوبکر نے فوری تدبیر نہ کی ہوتی تو ممکن تھا کہ قریش وانصار کے بیچ تلواریں کھنچ جاتیں کیونکہ ان کی صفوں میں منافقین بھی اپنی ''ذمہ داری'' نبھا رہے تھے۔

---

(۱) تاریخ طبری ۲/۲۴۳، طبع دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۸۸ء

(۲) تفصیلات دیکھئے: تاریخ طبری ۲/۲۴۴۔ بخاری: ۳۶۶۸۔ البدایہ والنہایہ: ۳/ ۶۱۶، ۲۱۷

اعتراضات اور جوابات

اعتــراض: حضرت ابوبکر کی خلافت پر اجماع نہیں ہوا تھا، بلکہ صرف انہیں لوگوں نے بیعت کی جو سقیفہ بنوساعدہ میں موجود تھے، نیز صحابہ کرام کی ایک جماعت نے آپؓ کو خلیفہ تسلیم نہیں کیا تھا۔

جواب: یہ بالکل غلط دعویٰ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر اجماع نہیں ہوا تھا، ہاں یہ ضرور ہے کہ بیعت کا آغاز سقیفہ بنوساعدہ میں ہوا تھا، پھر آنحضرت (ﷺ) کی تدفین کے بعد مسجد نبوی میں حضرت ابوبکرؓ نے تمام مسلمانوں کو جمع کیا اور ان کو بتایا کہ کس طرح اور کن حالات میں انھیں ان کی مرضی کے خلاف منتخب کیا گیا ہے، انھوں نے یہ بھی کہا کہ جو کچھ ہوا آپ اس کی تائید کے ہرگز پابند نہیں ہیں، آپ آزاد ہیں، اور آپ چاہیں تو نیا امیر منتخب کر سکتے ہیں، لیکن کوئی بھی اس فیصلہ کو تبدیل کرنے پر آمادہ نہ ہوا، اور سب نے آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔(۱)

رہا یہ کہنا کہ صحابہ کی ایک جماعت نے بیعت نہیں کی تھی تو یہ ایک بہتان ہے، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ دیر سویر سارے صحابہ نے بیعت کر لی تھی البتہ صرف حضرت سعد بن عبادہؓ نے بیعت نہیں کی تھی، تو کسی ایک دو فرد کا بیعت نہ کرنا اجماع کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کسی کی بھی خلافت ثابت نہیں ہو سکتی۔

ایک الزامی جواب یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر کی خلافت پر امت کا جو اجماع ہوا تھا وہ اجماع حضرت علیؓ کی خلافت پر نہیں ہو سکا بلکہ ایک تہائی سے زیادہ لوگوں نے بیعت میں شرکت نہیں کی، پس اگر امت کے چند افراد کی عدم شرکت سے کسی خلیفہ کی خلافت نا قابل تسلیم ہوتی ہے تو حضرت علیؓ کی خلافت سب سے پہلے نا قابل تسلیم ٹھہرے گی، لیکن اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ حضرت ابوبکر و حضرت علی دونوں کی خلافت بالکل درست اور علی منہاج النبوۃ تھی۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ: ۳۰/ ۲۱۷

نہج البلاغہ کے شارح ابن ابی الحدید جو کہ ایک معتزلی شیعہ ہیں لکھتے ہیں:

''ہمارے قدیم ومتأخر بصری وبغدادی علماء لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت صحیح، شرعی اور قانونی بیعت تھی، یہ بیعت نص سے نہیں بلکہ انتخاب سے عمل میں آئی تھی جس پر اجماع ہو گیا تھا، اور یہ بھی انتخاب کا طریقہ ہے۔''(۱)

اعتراض: حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکر کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا تھا اسی لیے آپؓ نے تقریباً چھ مہینے تک بیعت نہیں کی۔

جواب: اس سلسلہ میں تاریخ وحدیث کی کتابوں میں متعدد روایتیں موجود ہیں، چنانچہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

''اس واقعہ کا اہم اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے پہلے ہی دن (یعنی جس دن سقیفۂ بنو ساعدہ میں بیعت ہوئی) بیعت کی ہے یا وفات کے دوسرے روز، اور یہی حقیقت امر ہے، کیونکہ حضرت علیؓ نے کسی بھی وقت حضرت ابوبکر کا ساتھ نہیں چھوڑا، اور کسی نماز میں بھی غیر حاضر نہیں رہے۔''(۲)

ابن سعد کی روایت ہے:

''محمد بن سیرین کی روایت ہے کہ جب ابوبکر کی بیعت کی گئی تو علیؓ نے بیعت میں دیر کی اور خانہ نشیں رہے، ابوبکر نے کہلا بھیجا کہ میری بیعت سے آپ کی تاخیر کا کیا سبب ہے؟ کیا آپ میری امارت کو ناپسند کرتے ہیں؟ علیؓ نے کہا کہ میں آپ کی امارت کو ناپسند نہیں کرتا لیکن میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک قرآن جمع نہ کرلوں نماز کے سوا اپنی چادر نہیں اوڑھوں گا۔''(۳)

---

(۱) شرح نہج البلاغہ: ۱/ ۷ (۲) البدایہ والنہایہ: ۵/ ۲۴۹ (۳) طبقات ابن سعد ۳/ ۱۲۹

جمع قرآن کی مشغولیت کے علاوہ حضرت فاطمہ کی طویل بیماری کی وجہ سے بھی وہ تقریباً چھے مہینے تک عوامی ربط سے دور رہے، حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکر کو اپنے گھر بلایا، اچھے ماحول میں ان کی گفتگو ہوئی، حضرت علی نے حضرت ابوبکر کی تعریفیں کیں اور کہا کہ قرابت رسول کی بنا پر میں اپنے آپ کو خلافت کا حق دار خیال کرتا تھا، لیکن اب کوئی ملال نہیں، اور پھر علی الاعلان مسجد میں بیعت کر لی۔ (۱)

ابن کثیر کا بیان ہے کہ یہ دوسری بیعت پہلی بیعت کی توثیق وتجدید تھی۔(۲)

تاریخ وسیرت کی کتابوں سے ثابت ہے کہ حضرت علیؓ نے کبھی کسی موقع پر اشارۃً یا کنایۃً یہ نہیں کہا کہ حضرت ابوبکر کی خلافت غیر شرعی تھی یا انھوں نے ان کا حق خلافت سلب کیا، بلکہ جب بھی ضرورت پڑی انھوں نے حضرت ابوبکر کی خلافت سے ہی دلیلیں دی ہیں، اوران کی بیعت کرنے کو باعث فخر گردانا ہے۔ چنانچہ جب حضرت امیر معاویہؓ سے اختلاف ہوا تو حضرت علیؓ نے ان کو جو خط لکھا اس کا آغاز اس طرح کیا:

> ''مجھ سے ان لوگوں نے بیعت کی ہے جن لوگوں نے ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ سے بیعت کی تھی، اور انہی باتوں پر بیعت کی ہے جن باتوں پر ان حضرات سے بیعت کی تھی......''(۳)

ایک وضاحت

مشہور ہے کہ باغ فدک کے سلسلہ میں حضرت فاطمہ کو حضرت ابوبکر سے کچھ ملال تھا اسی لیے ان کی دلجوئی و پاس خاطر میں حضرت علی نے بیعت کرنے میں توقف کیا، اور جب حضرت فاطمہ کا انتقال ہو گیا تو انھوں نے بیعت کی۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت فاطمہ کو حضرت ابوبکر سے کسی بھی طرح کوئی

(۱) بخاری: ۴۲۴۰- مسلم: ۱۷۵۹ (۲) البدایہ والنہایہ: ۵/۲۴۶ (۳) نہج البلاغہ ۳۶۶-۳۶۷

شکایت نہیں تھی جس کی تفصیلات خود شیعوں کی کتابوں میں موجود ہیں، ہاں ابتدا میں انھیں کچھ ناگواری ضرور ہوئی تھی لیکن یہ حضرت فاطمہ کی شان سے بہت پرے ہے کہ وہ دنیا کی کسی معمولی چیز کے لیے ناراض ہوں اور وہ بھی اس شخص سے جوان کے والد ذی شان کا رفیق غار رہا ہو۔(۱)

دراصل صورتحال یہ تھی کہ ایک طرف جمع قرآن اور حضرت فاطمہ زہراءؓ کی تیمارداری کی وجہ سے حضرت علی کا عوامی رابطہ منقطع تھا، اور دوسری طرف عرب کی اندرونی حالت سخت تشویشناک ہوچکی تھی، مختلف فتنوں نے سر اٹھالیا تھا، بہت سے قبیلے مرتد ہوگئے تھے، بعضوں نے اسلام کے رکن اعظم زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کردیا تھا، جھوٹے مدعیان نبوت علیحدہ شورش پر آمادہ تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ ان فتنوں کا سر کچلنے میں مصروف تھے، اس لیے خلافت کے موضوع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ کی اطمینان بخش گفتگو نہ ہوسکی جس میں تقریباً چھ مہینے کا عرصہ گذر گیا، اس دوران حضرت علی کو ان کی خلافت سے کوئی شکایت نہ تھی، ہاں اتنا ملال ضرور تھا کہ خلافت کا اہم ترین معاملہ طے ہوا اور وہ اس میں شریک نہ تھے۔ پھر حضرت فاطمہ کے انتقال کے بعد جب ان کو ذہنی سکون ملا اور ایک عظیم ذمہ داری سے وہ سبکدوش ہوئے تو سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کو بلا بھیجا اور پھر رسمی گفت وشنید کے بعد انھوں نے بیعت کرلی۔

(۱) اس کی تفصیلات ''فدک کی میراث'' کے باب میں ملاحظہ ہو۔

فدک کی میراث

فدک کے مسئلہ کو شیعوں نے ایک سیاسی رنگ دے کر اہل بیت عظام اور السابقون الاولون صحابہ کرام کو دوفریق کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور یہ عمومی تأثر دیا کہ رسول اللہ (ﷺ) کی وفات کے بعد اہل بیت سے ان کے حقوق سلب کیے گئے اور انھیں ان کی جائدادوں سے محروم کیا گیا، اس سلسلہ میں فدک کے قضیہ کی نمک مرچ لگا کر خوب تشہیر کی گئی، ذیل میں اس قضیہ کی وضاحت ملاحظہ ہو:

فدک کیا ہے؟

فدک حجاز میں ایک بستی کا نام ہے جو مدینہ منورہ سے دودن کی مسافت پر واقع ہے، جس میں پانی کا چشمہ اور کھجور کا باغ تھا، یہ بستی ۷ھ میں غزوہ خیبر کے بعد مصالحت کے طور پر رسول اللہ (ﷺ) کے قبضہ میں آئی، اور شریعت کی اصطلاح میں جو مال بغیر کسی جنگ وقتال کے حاصل ہو اسے ''مال فے'' کہتے ہیں، مال فے پر کس کا تصرف ہوگا اور اس کا مصرف کیا ہوگا، اس سلسلہ میں قرآنی حکم ہے:

﴿مَآ أَفَآءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ﴾ (الحشر:۷)

(اللہ نے بستی والوں سے جو بھی اپنے رسول کے ہاتھ لگایا تو وہ اللہ کا ہے اور رسول کا ہے اور (ان کے) قرابت داروں کا ہے اور یتیموں کا ہے اور مسکینوں کا ہے اور مسافر کا ہے تاکہ وہ تم میں مالداروں کی جاگیر بن کر نہ رہ جائے)

چنانچہ فدک رسول اللہ (ﷺ) کے تصرف میں تھا، آپ (ﷺ) اس کی آمدنی

سے اپنے اہل وعیال کی ضرورت کے لیے رکھ کر باقی صدقات وخیرات اور رفاہ عام کے کاموں میں صرف فرمایا کرتے تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی اپنے عہد میں اسی اسوۂ نبوی پر قائم رہے، جب حضرت عمرؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو انھوں نے یہ ذمہ داری حضرت عباسؓ وحضرت علیؓ کے سپرد کردی۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ جب کبھی اس سلسلہ میں ان کے مابین کوئی اختلاف ہوتا تو عقدہ کشائی کے لیے وہ حضرت عمرؓ کی ہی خدمت میں حاضر ہوا کرتے۔(۱)

اموی حکومت میں فدک پہلے مروان پھر اس کے بیٹوں اور پھر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی تحویل میں آیا، خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ فدک کا مال اپنے پیش رو خلفائے اربعہ کے مطابق صرف کیا کرتے تھے، ۲۱۰ھ میں خلیفہ مامون کے حکم سے فدک کا علاقہ حضرت فاطمہؓ کی اولاد کے تصرف میں آیا، اور محمد بن یحیٰ بن حسین بن زیدؒ اور محمد بن عبداللہ بن حسین بن علیؓ اس کے متولی قرار پائے، عباسی خلیفہ متوکل کے زمانہ میں اولاد فاطمہؓ کے مابین نزاع پیدا ہوا تو اس نے حکم دیا کہ اب سے فدک حکومت کے تصرف میں رہے گا اور اس کی آمدنی حسب سابق رفاہی کاموں میں خرچ کی جائے گی جیسا خلافت صدیقؓ سے لے کر سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور تک ہوتا رہا ہے۔(۲)

فدک کا قضیہ سنیوں کے نزدیک

امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ حضرت عائشہؓ کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں:

”سیدہ فاطمہؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے مطالبہ کیا کہ مدینہ میں جو مال غنیمت نبی کرم (ﷺ) کے پاس موجود تھا نیز فدک اور خیبر کے خمس میں سے جو مال ہے وہ آپ میراث کے طور پر مجھے عنایت کردیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: نبی کریم (ﷺ) کا ارشاد ہے: ”ہماری وراثت نہیں، جو کچھ ہم چھوڑیں وہ سب صدقہ ہے۔“ البتہ نبی کریم (ﷺ) کے اہل بیت بسر

(۱) بخاری: ۳۰۹۴ (۲) المنتقىٰ من منهاج السنة النبوية: ۲۸۷-۲۸۸

اوقات کے لیے اس میں سے استعمال کر سکتے ہیں۔ خدا کی قسم! میں صدقہ کی تقسیم میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گا، بلکہ اس کو اسی حال پہ رہنے دوں گا، نبی کریم (ﷺ) کے زمانہ میں جس بات پر عمل کیا جاتا تھا میں اسے کسی قیمت پر ترک نہیں کروں گا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اس میں سے کچھ بھی حضرت فاطمہؓ کو دینے سے معذرت کر لی، جس کی وجہ سے حضرت فاطمہؓ حضرت ابوبکرؓ سے خفا ہو گئیں، اور اپنی وفات تک دوبارہ اس موضوع پر ان سے گفتگو نہیں کی، اس کے بعد چھ مہینے تک وہ باحیات رہیں، جب ان کا انتقال ہو گیا تو ان کے شوہر حضرت علیؓ نے رات ہی رات ان کی تدفین کر دی، اور تدفین میں حضرت ابوبکر کو بھی نہیں بلایا۔''(۱)

نوٹ:

یہاں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت فاطمہؓ دونوں شریعت کے اسرار و رموز سے پوری طرح واقف اور اجتہاد کی اعلیٰ شان رکھتے تھے، دونوں نے اپنے اعتبار سے اس مسئلہ کو دیکھا اور اپنی رائے قائم کی، اور رائے اور اجتہاد میں اختلاف کوئی ادنیٰ و معیوب چیز نہیں، اس لیے کسی ایک کو صحیح یا غلط کہنا کسی بھی صورت میں درست نہیں ہے، بلکہ دونوں حق پر تھے اور دونوں کے پاس اپنے اپنے دلائل تھے۔

حضرت ابوبکر کے اس فیصلہ پر حضرت فاطمہؓ کو بعد میں شرح صدر ہو گیا تھا اور دیگر اہل بیت بھی اس فیصلہ پر راضی تھے چنانچہ حافظ ابن کثیر روایت کرتے ہیں:

"قال زيد بن علي بن الحسين بن علي بن أبي طالب: أما لو كنت مكان أبي بكر لحكمت بما حكم به أبو بكر في فدك"(۲)

---

(۱) بخاری: ۴۲۴۰۔ مسلم: ۱۷۵۹ (۲) البدایہ والنہایہ: ۲۵۳/۳

(زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب کہتے ہیں: اگر میں حضرت ابوبکر کی جگہ ہوتا تو فدک کے سلسلہ میں وہی فیصلہ کرتا جو ابوبکر نے کیا تھا)

فدک کا قضیہ شیعوں کے نزدیک

شیعوں کو یہ گوارہ نہیں کہ حضرت فاطمہ اتنی آسانی سے اس فیصلہ پر راضی ہو جائیں، چنانچہ انھوں نے اس موضوع پر صفحوں پر صفحے سیاہ کرڈالے، بیشمار کتابیں لکھ ماریں، جن میں رسول اللہ (ﷺ) کے صحابہ کو گالیاں بکیں، طعن وتشنیع کے تیر برسائے، انھیں فاسق وفاجراور اسلام سے خارج قرار دیا، اور یہ عمومی تاثر دینے کی کوشش کی کہ صحابہ کرام اور اہل بیت دو فریق ہو گئے تھے، اور خاص طور پر حضرت ابوبکر وعمرؓ نے ان کے ساتھ نہ صرف ناروا سلوک کیا بلکہ ان کے حقوق تک سلب کر لیے، چنانچہ مذکورہ واقعہ کو شیعہ حضرات اس طرح پیش کرتے ہیں:

> ''جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ روایت پیش کی: ''ہماری وراثت نہیں، جو کچھ ہم چھوڑیں وہ سب صدقہ ہے۔'' تو حضرت فاطمہؓ نے قرآن کا سہارا لیتے ہوئے یہ آیت پیش کی ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ﴾ (النمل:١٦) (یعنی پیغمبر سلیمانؑ اپنے والد پیغمبر حضرت داوٗدؑ کے وارث ہوئے) جب حضرت ابوبکرؓ نے اس دلیل کو قبول نہیں کیا تو حضرت فاطمہؓ نے دوسری دلیل پیش کی: ﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ (النساء:١١) (مرد کے لیے دو عورت کے برابر کا حصہ ہے) یعنی اس آیت میں نبی اور غیر نبی سب برابر ہیں۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس کو بھی تسلیم نہیں کیا، تو حضرت فاطمہ زہراؓ نے کہا کہ اے ابوبکرؓ کیا خدا کے دین میں یہی ہے کہ تو تو اپنے باپ کا وارث ہو، اور میں اپنے باپ کی میراث نہ پاؤں! کیا حضرت رسول اللہ (ﷺ) نے نہیں فرمایا ہے کہ

انسان اپنی اولاد کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ سن کر جناب ابوبکرؓ بہت شدت سے روئے، لیکن انھوں نے وراثت نہیں دی۔

جب ابوبکرؓ نے وراثت کا حق ماننے سے انکار کردیا تو حضرت فاطمہؓ نے تملیک کا دعویٰ کیا اور فرمایا کہ ہمارے پدر بزرگوار نے اپنی زندگی ہی میں فدک ہم کو ہبہ کردیا تھا، اس پر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت فاطمہؓ سے گواہ مانگے تو انھوں نے حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، اور حضرت ام ایمنؓ کو پیش کیا، ان حضرات نے شہادت دی لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان لوگوں کی شہادت کو رد کر کے مقدمہ خارج کردیا۔''(۱)

''حضرت فاطمہ کے دعوی ملکیت کی تفصیل یہ ہے کہ فتح خیبر کے بعد آنحضرت (ﷺ) نے حضرت علیؓ کو دعوت اسلام کے لیے فدک والوں کی طرف بھیجا، ان لوگوں نے حضرت علیؓ سے اس امر پر صلح کرلی کہ نصف علاقہٗ فدک پر حضرت رسول اللہ (ﷺ) کا قبضہ رہے گا۔ اس صلح کے بعد آیت ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبىٰ حَقَّه﴾ نازل ہوئی، یعنی اے رسول! صاحبان قرابت کو ان کا حق دے دو۔ تو رسول اللہ (ﷺ) نے حضرت جبرئیل سے پوچھا کہ میرے قرابت دار کون لوگ ہیں؟ حضرت جبرئیل نے عرض کیا کہ وہ فاطمہؓ ہیں، ان کو فدک دے دیجیے، اس وقت رسول اللہ (ﷺ) نے فاطمہ کو بلایا اور سند لکھ دی، وہی سند حضرت فاطمہ زہراؓ نے حضرت رسول اللہ (ﷺ) کے بعد ابوبکر کے سامنے پیش کی، اور فرمایا کہ یہ حضرت رسول اللہ (ﷺ) کا لکھا ہوا وثیقہ ہے جو ہمارے لیے لکھا ہے۔''(۲)

جب حضرت فاطمہ زہراؓ نے اپنی دلیلوں سے جناب ابوبکر کو لاجواب کردیا انھوں نے حضرت فاطمہ زہراؓ کے دعویٰ کے مطابق سند واگذاری لکھ کر ان

---

(۱) الفرقة الناجية فى الاسلام: ۳۳۵-۳۵۰ (۲) ایضا: صفحہ: ۳۴۳-۳۴۴

کو دے دی، اتنے میں جناب عمرؓ آ گئے اور انھوں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ ابوبکرؓ نے کہا کہ یہ فدک کے واگذاری کی سند ہے، جو فاطمہ زہرؓ کے لیے لکھی ہے، عمرؓ نے فاطمہ زہرؓ کے ہاتھ سے وہ سند لے کر فوراً پھاڑ دی، اور کہا کہ علیؓ ان کے شوہر ہیں اور حسنینؓ ان کے بیٹے ہیں، لہٰذا ان لوگوں کی شہادتیں قبول نہیں۔''(۱)

اعتراضات وجوابات

اعتراض:- حضرت ابوبکرؓ نے اور پھر ان کے بعد حضرت عمرؓ نیفدک نہ دے کر سیدہ فاطمہؓ سے ان کا حق وراثت غصب کر لیا۔

ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں:

چنانکہ بنائے ظلم اول ابوبکر و عمر گذاشتند در غصب کردن حق امامت وفک ومیراث۔''(۲)

(سب سے پہلے ظلم کی بنیاد ابوبکر و عمر نے رکھی، امامت، فدک اور میراث کا حق غصب کر کے۔)

جواب:- نبی کا کوئی وارث نہیں ہوتا ہے، اگر معاملہ وراثت کا ہوتا تو آپ (ﷺ) کی ازواج مطہرات کو بھی حصہ ملتا، ان میں سے ایک حضرت عائشہ تھیں جو حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی تھیں، اور دوسرے حضرت عمرؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہ تھیں، ان کے علاوہ اس ترکہ کے حقدار خود آنحضرت (ﷺ) کے چچا حضرت عباسؓ بھی موجود تھے، جو کہ ابتدا ہی سے حضرت ابوبکرؓ کے مشیر تھے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اتنے لوگوں کو اور خود اپنی بیٹی کو وراثت سے محروم کریں اور ان میں سے کوئی بھی اپنی زبان پر شکایت کا ایک لفظ بھی نہ لائے؟!

غصب کا مطلب کسی کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کرنا ہوتا ہے، یہاں حضرت ابوبکرؓ

(۱) حوالہ سابق صفحہ: ۳۴۵ (۲) تذکرۃ الائمہ یا ائمۂ معصومین: ۵۳، طبع ایران

نے فدک پر قبضہ نہیں کیا بلکہ آنحضرت (ﷺ) کی زندگی میں وہ جس حال میں تھا اس کو اسی پر باقی رکھا، ان کے بعد حضرت عمرؓ پھر حضرت عثمانؓ حتی کہ حضرت علیؓ نے بھی اسی روایت پر عمل کیا۔

اعتراض:- انبیاء کی اولاد وراثت سے محروم نہیں رہتیں، اور اس کی صراحت خود قران مجید میں اس طرح ہے: ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوُدَ﴾ (حضرت سلیمانؑ اپنے والد حضرت داؤدؑ کے وارث ہوئے) اور ﴿يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ (اللہ تعالیٰ تمھیں تمہاری اولاد کے سلسلہ میں وصیت کرتا ہے، مرد کے لیے دوعورت کے برابر کا حصہ ہے) حضرت ابوبکرؓ نے سیدہ فاطمہ کو وراثت سے محروم کر کے قرآنی حکم کی مخالفت کی ہے۔

جواب:- پہلی آیت ﴿وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوُدَ﴾ میں وراثت سے مراد مال وجائداد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد علم ونبوت ہے، کیونکہ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے انیس لڑکے تھے، اور ضابطہ کے اعتبار سے سارے لڑکے وارث ہوئے، اور جب لڑکے کو وارث ہونا ہی ہے تو اس کے ذکر سے کیا فائدہ؟ اور مال وجائداد کا وارث ہونا ایسا کوئی اعزاز نہیں جس کا ذکر قران مجید میں کیا جائے، کیونکہ دنیا کا ہر لڑکا اپنے باپ کا وارث ہوتا ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ذکر کیا جس سے مراد ان کا علم ونبوت میں وارث ہونا ہے کیونکہ اس وراثت سے دوسری اولادیں محروم تھیں۔

قرآن مجید میں مختلف جگہوں پر اسی مفہوم کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے:

﴿ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا﴾ (فاطر: ۳۲)

(پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا ان لوگوں کو جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا)

﴿وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا﴾ (الزخرف: ۷۲)

(اور یہ وہ جنت ہے جس کا تم کو وارث بنایا گیا ہے)

﴿إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾(الاعراف:۱۲۸)

(بے شک زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا وارث بنائے)

اس کی مزید وضاحت کے لیے شیعوں کی یہ روایت بھی ملاحظہ ہو:

ابو عبداللہ علیہ السلام نے فرمایا:

''سلیمان علیہ السلام وارث ہوئے داؤد علیہ السلام کے، اور محمد (ﷺ) وارث ہوئے سلیمانؑ کے، اور ہم وارث ہیں محمد (ﷺ) کے۔''(۱)

جہاں تک تعلق ہے اس آیت کا ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾ تو اس آیت کی مخاطب امت مسلمہ ہے نہ خود آنحضرت (ﷺ) ہیں، کیونکہ اس سے پہلے اور بعد کی آیتوں میں جو احکام بیان ہوئے ہیں ان کا تعلق خود آنحضور (ﷺ) کی ذات سے ہو ہی نہیں سکتا، مثال کے طور پر ابتدائی آیات میں یتیم کے مال میں تصرف کرنے اور چار سے زائد بیویاں رکھنے سے منع کیا گیا ہے، اور یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ (ﷺ) کو یتیم کے مال میں تصرف کے سلسلہ میں مخاطب کیا جائے، اسی طرح آپ (ﷺ) کو بیک وقت چار سے زائد نکاح کا اختیار تھا۔

اعتراض:- سیدہ فاطمہؓ کو وراثت سے محروم کرنے کے لیے حضرت ابوبکرؓ نے گڑھ کر روایت پیش کی، کیونکہ ان کے علاوہ کسی اور نے یہ روایت بیان نہیں کی۔

جواب:- یہ سراسر الزام، دروغ گوئی اور بے بنیاد الزام ہے، کیونکہ جو حدیث حضرت ابوبکرؓ نے پیش کی اس کو متعدد صحابہ کرام نے بھی روایت کیا ہے، اور ان روایت کرنے والوں میں بعض وہ صحابہ بھی ہیں جو ''عشرہ مبشرہ'' میں شامل ہیں، ان صحابہ کرام کے اسماء گرامی یہ ہیں: حضرت عباس، حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضیٰ، حضرت زبیر بن العوام، حضرت ابو ہریرہ، حضرت حذیفہ بن الیمان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، اور حضرت سعد بن وقاص (رضی اللہ عنہم)

(۱) اصول کافی: جلد ا صفحہ ۱۳۷

بالفرض حضرت ابوبکر نے گڑھی ہوئی روایت بیان کی تھی تو اس روایت کا کیا جواب دیں گے جس میں متعدد صحابہ کرام کے علاوہ خود حضرت علیؓ بھی شریک ہیں:

امام بخاری نے مالک بن اوس بن حدثان النضریؓ سے یوں روایت کی ہے:

''حضرت عمر فاروقؓ نے صحابہ کے ایک مجمع کو مخاطب کیا جس میں حضرت علی، عباس، عثمان، عبدالرحمٰن ابن عوف، زبیر بن العوام اور سعد ابن وقاص (رضی اللہ عنہم) تھے، کہا کہ میں تم کو اس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے زمین وآسمان قائم ہیں، کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا ہماری میراث نہیں ہوتی، جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے؟ سب نے جواب دیا: بخدا ہاں۔ پھر آپؓ حضرت علیؓ و حضرت عباسؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ میں تمھیں خدا کو واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا آپ جانتے ہیں رسول اللہ (ﷺ) نے ایسا فرمایا تھا؟ ان دونوں نے جواب میں کہا کہ ہاں! بخدا ایسا ہی کہا تھا۔''(۱)

حضرت ابوبکرؓ نے جو روایت پیش کی اس کے صحیح ہونے کی سب بڑی دلیل خود شیعوں کی کتاب موجود ہے، ملاحظہ ہو کلینی کی یہ روایت:

''جعفر صادق نے فرمایا: علمائے دین ہی پیغمبروں کے وارث ہوتے ہیں، اور یہ اس لیے کہ پیغمبروں نے کسی کو سونے اور چاندی کا وارث نہیں بنایا، انھوں نے تو صرف شریعت کی باتوں کا وارث بنایا ہے، پس جس نے اس میں سے کچھ بھی حاصل کیا اس نے بڑا نصیبہ حاصل کر لیا۔''(۲)

اس کے علاوہ شیعوں کی فقہ تو اس بات کی قائل ہے کہ عورت کو غیر منقولہ جائداد اور زمین کی وراثت میں کوئی حصہ نہیں ملتا، ان کے محدثین نے اس مسئلہ کو مستقل ابواب وعنوانات کے تحت بیان کیا ہے، کلینی نے ایک مستقل باب اس عنوان سے لکھا

---

(۱) بخاری: ۳۰۹۴ (۲) اصول کافی باب صفۃ العلم وفضلہ: ۱/۳۴

ہے ’’عورتوں کو منقولہ مال وراثت میں سے کچھ بھی نہیں ملتا۔‘‘ اس عنوان کے تحت انھوں نے متعدد روایات بیان کی ہیں۔ حضرت ابو جعفرؒ کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں: ’’عورتوں کو زمین اور منقولہ وراثت میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا۔‘‘ (۱)

اعتراض :- آنحضور (ﷺ) نے سیدہ فاطمہ کو اپنی زندگی میں فدک ہبہ کردیا تھا لیکن حضرت ابوبکرؓ نے سیدہ فاطمہؓ کو اس پر قبضہ سے روک دیا، اور حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، اور حضرت ام ایمنؓ کی گواہی کو رد کردیا۔

جواب:- جب وراثت کی بات ثابت نہیں ہوسکی تو شیعوں نے ایک نیا دعویٰ تراشا اور یہ راگ الاپا کہ آنحضور (ﷺ) نے اپنی زندگی میں ہی فدک ہبہ کردیا تھا جو کہ جھوٹ وافتراء کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ شیعوں کا کہنا ہے جب آیت ﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبىٰ حَقَّه﴾ نازل ہوئی تو رسول اللہ (ﷺ) نے یہ حضرت جبرئیل کے کہنے پر حضرت فاطمہ کو فدک ہبہ کردیا، اور شیعہ سنی دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھی، اور فدک پہ قبضہ مدینہ منورہ میں فتح خیبر کے بعد سنہ ۷ھ میں ہوا تھا، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد آپ (ﷺ) حضرت فاطمہ کو فدک ہبہ کردیں؟! اور یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت فاطمہ ایک دنیاوی چیز کے لیے دو دو دعوے پیش کریں، جبکہ ان کے پاس شہادت بھی مکمل نہیں تھی۔ اور اگر فدک پر حضرت فاطمہؓ کا حق ہوتا تو انھوں نے جب آنحضرت (ﷺ) سے کسی خادمہ کا مطالبہ کیا تھا تو نبی کریم (ﷺ) فدک میں سے کچھ عطا کردیتے لیکن آپ (ﷺ) نے ان کو تسبیحات (تسبیحات فاطمہؓ) پڑھنے کی ہدایت دی۔

نیز شیعہ سنی سب اس بات پر متفق ہیں کہ فدک آنحضرت (ﷺ) کی زندگی میں حضرت فاطمہؓ کے قبضہ وتصرف میں نہیں تھا، بلکہ خود آپ (ﷺ) اس پر مالکانہ تصرف فرمایا کرتے تھے، اور شرعی احکام کی روشنی میں ہبہ سے ملکیت ثابت نہیں ہوتی تاوقتیکہ

(۱) الفروع من الکافی، کتاب المواریث، باب ان النساء لایرثن - بحار الانوار ۲۶/۵۱۴

اس پر قبضہ ثابت نہ ہو، اور قبضہ ثابت ہونے کی صورت میں کسی گواہ ودلیل کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اور حضرت ابوبکر نے یہی فرمایا تھا کہ جس طرح نبی کریم (ﷺ) اپنی زندگی میں اس میں تصرف فرمایا کرتے تھے میں اسے اسی حال پہ باقی رکھوں گا۔

بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے اپنی زندگی میں فدک ہبہ کردیا تھا تو گواہ کے طور پر حضرت فاطمہؓ نے جو نام پیش کیے وہ ناکافی تھے، کیونکہ حضرت علیؓ گرچہ بہت اونچے مقام ومرتبہ کے حامل ہیں لیکن قضا کے مسئلہ میں مقام ومرتبہ کے بجائے شہادت ودلائل کو اعتبار ہوتا ہے، اور ضابطہ کے اعتبار سے کسی عورت کے حق میں شوہر اور بیٹوں کی گواہی قابل قبول نہیں ہوتی، اسی طرح حضرت ام ایمنؓ اکیلی گواہ تھیں، اور اسلام میں صرف ایک عورت کی گواہی ناکافی ہے۔ چنانچہ یہ نہیں کہا جائے گا کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان حضرات کی شہادت کو رد کردیا بلکہ انھوں شہادت کے ناکافی ہونے کی صورت میں ان کے حق میں فیصلہ نہیں دیا، ٹھیک اسی طرح کہ جب حضرت علیؓ خلیفہ تھے اور ایک زرہ کے سلسلہ میں ان کو اور ایک یہودی کو قاضی شریح کی عدالت میں پیش ہونا پڑا، اور حضرت علیؓ کے بلند مقام اور خلیفہ ہونے کے باوجود ان سے گواہ پیش کرنے کو کہا گیا اور ان کے حق میں ان کے صاحبزادہ حضرت حسنؓ کی شہادت کو تسلیم نہیں کیا گیا، اور فیصلہ حضرت علیؓ کے بجائے یہودی کے حق میں ہوا تھا۔

اسی طرح یہ دعویٰ کہ حضرت ابوبکرؓ نے وثیقہ تحریر کرکے دیدیا تھا اور فاطمہؓ کے پیش کردہ تحریر نامہ کو حضرت عمر نے پھاڑ دیا تھا تو یہ گڑھی ہوئی بات ہے، اس طرح کی بات کسی بھی سنی مصنف نے بیان نہیں کی، اور اس سلسلہ کی جو روایت ملتی ہے اس کے سارے راوی شیعہ ہیں۔

اعتراض:- سیدہ فاطمہ زہرؓ حضرت ابوبکر سے سخت ناراض ہوئیں، پوری زندگی ان سے بات نہیں کی، اور رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا ہے "من أغضبها أغضبني" یعنی جس نے فاطمہ کو غصہ دلایا اس نے مجھے غصہ دلایا، اور اسی ناراضگی کی

وجہ سے حضرت علیؓ نے ان کی تدفین میں حضرت ابوبکرؓ کو بلایا بھی نہیں۔

جواب:- اس سے انکار نہیں کہ حضرت فاطمہؓ اس وقت حضرت ابوبکرؓ سے ناراض ہوئی تھیں، اوراس کی وجہ بالکل واضح ہے کہ انھیں یقین تھا کہ فدک میں ان کو وراثت ملے گی، لیکن جب معلوم ہوا کہ نبی کی وراثت نہیں ہوتی تو انھیں ایک دھچکا لگا جو بشریت کا تقاضا تھا، لیکن انھوں نے اسے کوئی ذاتی مسئلہ نہیں بنایا اور کچھ ہی وقفہ کے بعد ان کی ناراضگی کافور ہوگئی۔

حضرت ابوبکر کو بھی احساس ہوا کہ شاید سیدہ فاطمہؓ کو کچھ تکلیف پہنچی ہے، اس لیے انھوں نے سیدہ فاطمہؓ کے گھر جا کر ان سے معاملہ صاف کرلیا، اس کی وضاحت خود شیعوں کی معتبر کتاب ''محجاج السالکین'' میں موجود ہے:

''جب ابوبکرؓ نے دیکھا کہ فاطمہ زہراؓ نے مجھ سے کبیدہ خاطر ہو کر تعلقات توڑ لیے ہیں اور فدک کے معاملہ میں کوئی بات نہیں اٹھائی تو آپ پر یہ بہت شاق گذرا، آپ نے ان کو راضی کرنا چاہا، آپ ان کے پاس آئے اور کہا کہ اے رسول اللہ کی صاحبزادی! آپ اپنے دعوے میں سچی تھیں لیکن میں نے رسول اللہ (ﷺ) کو دیکھا ہے کہ اس کی آمدنی میں سے تم کو اور اس میں کام کرنے والوں کو دینے کے بعد باقی فقیروں، مسافروں اور مسکینوں میں تقسیم فرمادیا کرتے تھے، اس پر جناب فاطمہؓ نے فرمایا کہ آپ بھی اسی طرح کیا کریں جیسے میرے والد رسول اللہ (ﷺ) کیا کرتے تھے۔ ابوبکرؓ نے کہا کہ خدا کی قسم میں میں آپ کے لیے ویسا ہی کروں گا جیسا رسول اللہ (ﷺ) کیا کرتے تھے، ابوبکر نے پھر فرمایا: بخدا میں ضرور کروں گا۔ اس پر سیدہ فاطمہؓ نے فرمایا: اے اللہ تو اس کا گواہ رہ، پس آپ ان سے راضی ہوگئیں، اور اس پر عہد لیا۔'' (۱)

(۱) شرح نہج البلاغۃ ابن ہیثم جزء ۳۵ صفحہ ۴۳ - تحفۂ اثنا عشریہ: ۵۴۵ - ہدایۃ الشیعہ: ۴۹ از حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

اس کے علاوہ یہ روایت بھی ملاحظہ ہو:

''جب سیدہ فاطمہ بیمار ہوئیں تو حضرت ابوبکر ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، سیدہ فاطمہ نے ان سے گفتگو کی، اور وہ حضرت ابوبکر سے راضی تھیں، اور کیوں نہ راضی ہوتیں وہ انھیں خلیفۂ برحق سمجھتی تھیں، اسی لیے ان کے پاس اپنا مقدمہ لے کر گئی تھیں، ورنہ امام جعفر صادق کا قول ہے کہ ظالم حکام کے پاس مقدمہ لے کر جانا حرام ہے۔''(۱)

اس روایت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ نہ حضرت فاطمہ حضرت ابوبکر سے ناراض تھیں اور نہ انھوں نے ان سے بات چیت بند کر دی تھی، ہاں یہ ضرور تھا کہ بقیہ زندگی فدک کے موضوع پر گفتگو نہیں کی، جسے فتنہ پروروں نے ایک الگ ہی رنگ دیا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ حضرت فاطمہؓ حضرت ابوبکرؓ کی محرم نہیں تھیں اس لیے بلاوجہ بات کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا، اور پھر حضرت فاطمہؓ مرض الموت میں مبتلا تھیں اور اس قدر بیمار تھیں کہ گھر سے نکل کر کہیں آنا جانا ممکن نہ تھا اور بمشکل چھ مہینہ ہی باحیات رہیں، اور بیماری بھی ایسی تھی خود حضرت علیؓ کو ان کی تیمارداری کی وجہ سے لوگوں سے ملنے ملانے کا موقع نہیں ملتا تھا، نیز حضرت ابوبکرؓ خود خلافت کے مسائل اور فتنوں کی سرکوبی میں حد سے زیادہ مصروف تھے۔

اب رہا سوال کہ آنحضرت (ﷺ) نے فرمایا: "من أغضبها أغضبني" یعنی جس نے فاطمہ کو غصہ دلایا اس نے مجھے غصہ دلایا'' یہاں دو الگ الگ باتیں ہیں، ایک غصہ ہونا اور ایک غصہ دلانا۔ غصہ ہونا انسانی طبیعت کا خاصہ ہے، اور اسی بشری تقاضہ کے تحت حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام پر اس قدر غصہ ہوئے کہ ان کے بال پکڑ کر انھیں جھنجوڑ ڈالا، اور اس پر اللہ رب العزت کی طرف سے حضرت ہارون کی گرفت بھی نہیں ہوئی، کیونکہ انھوں نے غصہ دلانے

---

(۱) فروع کافی جلد ۳ صفحہ ۲۲۵- البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۲۵۳- طبقات ابن سعد ۸/ ۱۷

والا کوئی کام نہیں کیا تھا، ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ کلیم اللہ کو غصہ دلانے کے بعد حضرت ہارون منصب رسالت پر فائز رہتے یا خدا کی طرف سے کوئی تنبیہ نازل نہ ہوتی کیونکہ نبی کو غصہ دلانا کفر کے زمرہ میں آتا ہے!

حضرت فاطمہؓ کے سلسلہ میں بھی رسول اللہ (ﷺ) کے فرمان کا یہی مطلب ہے کہ اگر کسی نے فاطمہؓ کی شان میں گستاخی کی اور اپنے قول یا فعل سے ان کو غصہ دلایا تو گویا اس نے مجھے ناراض کیا۔ آپ (ﷺ) نے یہ نہیں فرمایا ''جس پر فاطمہ ناراض ہوئیں اس سے میں بھی ناراض ہوا۔'' اور پورے واقعہ میں حضرت ابو بکر نے حضرت فاطمہ کی شان میں گستاخی کرنا تو دور کی بات اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نامناسب ادا نہیں کیا، بلکہ انھوں نے صرف آنحضرت (ﷺ) کی حدیث پیش کی، اور یہی کہا کہ جیسا رسول اللہ (ﷺ) کیا کرتے تھے میں بھی ویسا ہی کروں گا، ساتھ ہی یہ بھی عرض کرتے رہے کہ ''اے رسول اللہ کی لخت جگر! صلہ رحمی کے لیے مجھے رسول اللہ (ﷺ) کی قرابت اپنی قرابت سے زیادہ عزیز ہے۔''

اس کے علاوہ اس کا ایک الزامی جواب یہ بھی ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے یہ بات اس وقت فرمائی تھی جب حضرت علیؓ نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تھا، اس پر حضرت فاطمہؓ نہ صرف ناراض ہوئیں تھیں بلکہ آنحضرت (ﷺ) کی خدمت میں شاکی بھی ہوئی تھیں، پھر اسی سلسلہ میں رسول اللہ (ﷺ) نے خطبہ میں فرمایا: فاطمة بضعة مني فمن أغضبها أغضبني۔ (۱)

رہا آخری سوال کہ حضرت فاطمہ کی تدفین میں حضرت علی نے حضرت ابو بکر کو شریک نہیں کیا، تو یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت علی نے ناراضگی کی وجہ سے حضرت ابو بکر کو جنازہ میں شریک نہیں کیا بلکہ یہ حضرت فاطمہ کی غایت درجہ حیا و پاکدامنی کی دلیل ہے کہ انھیں یہ گوارا نہیں تھا کہ ان کے جنازہ میں غیر محرم شریک ہوں اسی لیے حضرت علیؓ

---

(۱) بخاری: ۳۷۲۹، ۳۷۶۷

نے خود دیگر صحابہ کرام کو تو دور کی بات خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر تک کو اطلاع نہیں دی لیکن دوسرے واسطوں سے انھیں خبر ہوئی اور وہ شریک بھی ہوئے، چنانچہ اس کی صراحت طبقات بن سعد میں یوں ہے:

''امام مالک اس سند سے جو حضرت جعفر سے شروع ہو کر سیدنا زین العابدین پر ختم ہوتی ہے، روایت کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کا انتقال مغرب وعشاء کے درمیان ہوا، انتقال کی خبر سن کر حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تشریف لائے، جب جنازہ پڑھنے کے لیے لایا گیا تو حضرت علی نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ نماز پڑھایئے، انھوں نے فرمایا کہ کیا آپ کی موجودگی میں؟ حضرت علی نے جواب دیا کہ ہاں! آگے بڑھیے، واللہ آپ کے سوا کوئی نماز نہیں پڑھائے گا، حضرت ابوبکر نے نماز پڑھائی اور رات ہی کو تدفین عمل میں آئی'' (۱)

اور اگر حضرت ابوبکر سے کسی قسم کی ناراضگی ہوتی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت فاطمہ کی تجہیز وتکفین میں حضرت ابوبکر کی زوجہ محترمہ ام رومانؓ شریک ہوتیں؟ اس کی صراحت خود شیعوں کے یہاں موجود ہے:

''حضرت فاطمہ کو ام رومان زوجہ حضرت ابوبکر نے غسل دیا۔'' (۲)

فدک کے حدود اربعہ

شیعی نظریہ اور اس وضاحت کے مطابق فدک صرف ایک باغ نہیں بلکہ پوری ایک مملکت کا نام ہے، اور اس کے حدود اربعہ ایک عظیم ریاست کے مساوی ہے، اور اس میں وہ سارے علاقہ شامل ہیں جو کبھی یہودیوں کے قبضہ میں تھے، چنانچہ ملا باقر مجلسی نے فدک کی حد بندی کا قصہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

---

(۱) الطبقات الکبریٰ لابن سعد: ۸/ ۲۹ (۲) بحار الانوار جلد ۱۰ صفحہ ۵۶

''حضرت امام جعفر صادق نے بیان کیا: رسول اللہ (ﷺ) حضرت فاطمہ کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ جبرئل آئے اور کہا: اے محمد! اٹھو، خدائے تبارک وتعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ آپ کے لیے اپنے پروں سے فدک کی حد بندی کر دوں، آپؐ جبرئیل کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور تھوڑی دیر میں لوٹ آئے، اور سیدہ فاطمہ کے پوچھنے پر آپؐ نے فرمایا کہ جبرئیل نے میرے لیے اپنے پروں سے فدک کی حد بندی کر دی ہے۔''(۱)

حضرت جبرئیل نے فدک کی جو حد بندی کی تھی اس کی وضاحت شیعہ اپنے امام موسیٰ کاظم علیہ الرحمہ کی زبانی اس طرح کرتے ہیں:

''عباسی خلیفہ مہدی نے حضرت موسیٰ کاظم سے عرض کیا کہ آپ فدک کے حدود بیان کر دیں، تو آپ نے فرمایا: ایک حد اس کی احد پہاڑ ہے، دوسری حد اس کی عریش مصر ہے، تیسری حد اس کی سیف البحر ہے، اور چوتھی حد اس کی دومۃ الجندل ہے۔''(۲)

ایک دوسری روایت اس طرح ہے:

''ہارون رشید نے امام موسیٰ کاظم کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ فدک لے لیں، میں آپ کو واپس دیتا ہوں، تو حضرت نے انکار فرمایا، جب ہارون رشید نے اصرار کیا تو حضرت نے فرمایا کہ تم مجھے فدک دینا چاہتے ہو تو اس کے پورے حدود بھی دو تب میں لینے کو تیار ہوں۔ ہارون رشید نے پوچھا کہ اس کے حدود کیا ہیں؟ پس حضرت نے فرمایا کہ اس کی حد اول عدن ہے، پس ہارون کا رنگ فق ہو گیا، دوسری حد سمرقند ہے، یہ سن کر ہارون کا رنگ زرد ہو گیا۔ تیسری حد افریقہ ہے، بس ہارون کا رنگ سیاہ

---

(۱) بحار الانوار، کتاب الفتن، جلد ۸ صفحہ ۱۰۱

(۲) الاصول من الکافی باب الفیئ والانفال جلد ۱ صفحہ ۵۴۳

ہو گیا، اور چوتھی حد سیف البحر ہے جو جزائر آرمینیہ سے ملحق ہے، تب ہارون نے کہا کہ پھر ہمارے لیے کیا رہ گیا؟ پس حضرت نے فرمایا کہ میں نے پہلے ہی تمہیں کہہ دیا تھا کہ جب فدک کے حدود متعین کر کے بتاؤں گا تو تم نہیں دے سکو گے۔''(۱)

''امام نے وضاحت کی کہ فدک کے حدود میں احد کے پہاڑ عریش مصر، سیف البحر اور دومۃ الجندل آتے ہیں۔''(۲)

ایک طرف شیعہ فدک کے حوالہ سے نہ صرف ایک مملکت ہی کا دعویٰ کرتے ہیں بلکہ دوسری طرف بیت المقدس پر بھی اپنا حق جتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ بیت المقدس سے مراد آل محمد ہے۔

شیعی روایت ہے کہ امام موسیٰ کاظم نے مخاطب سے پوچھا:

''تم جانتے ہو بیت المقدس کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بیت المقدس سوریہ (شام) میں واقع ہے۔ اس پر امام نے فرمایا کہ بیت المقدس، بیت آل محمد کے سوا کچھ نہیں۔'' (۳)

اس وضاحت کے بعد یہ کہنا غلط نہیں کہ یروشلم نہ صرف بنی اسرائیل کا مرکز و قبلہ ہے بلکہ شیعوں کا مرکز عقیدت بھی ہے اور عرب کی وہ وسیع و عریض سرزمین جو کبھی یہودیوں کی تحویل میں آ چکی تھی اس پر اب یہودیوں اور شیعوں کا مشترکہ دعویٰ ہے، اور یہی دراصل ''اسرائیل عظمیٰ'' کا خواب اور منصوبہ ہے، جس کی تعبیر اور تکمیل کے لیے یہودیت سرگرم عمل ہے، اور شیعیت اس کے دوش بدوش۔

---

(۱) بحار الانوار، کتاب الفتن، جلد ۸ صفحہ ۱۰۱ (۲) الکافی، کتاب الحجہ، باب: ۱۲۸
(۳) الکافی، کتاب الحجہ، باب: ۱۲۸

حضرت علی المرتضیٰؓ کی اوّلیت

حضرت علیؓ کے بلند مقام اور ان کے بے شمار فضائل سے کسی کو اختلاف نہیں، البتہ تنازع کا اصل موضوع آپؓ کی خلافت ہے، شیعوں کا دعوی ہے کہ حضور (ﷺ) کی جانشینی اور آپ (ﷺ) کی خلافت کے اولین اور بنیادی حقدار صرف حضرت علیؓ تھے، لیکن حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھ تقریباً سبھی صحابہ کرام نے (نعوذ باللہ) حضرت علیؓ کے ساتھ دھوکہ کیا، ان کے حقِ خلافت کو سلب کیا، اور معاشرہ میں انھیں بے حیثیت بنا دیا، اور پھر اسی دعویٰ کے بعد سے اہل سنت والجماعت اور شیعوں کے مابین اختلافات کا آغاز ہوا اور دونوں کی راہیں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو گئیں۔

رسول اللہ (ﷺ) کی جانشینی

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اللہ کے رسول (ﷺ) اس دنیا سے تشریف لے گئے اور آپ (ﷺ) نے کسی کو بھی صراحت کے ساتھ اپنا خلیفہ متعین نہیں کیا، بلکہ اس معاملہ کو مسلمانوں کے باہمی مشورہ پر چھوڑ دیا تھا، جس کی اساس قرآن مجید کی یہ دو بنیادی آیتیں تھیں:

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾ (الشوریٰ:۳۸)

(اور ان کے معاملات آپس کے مشورہ سے (طے ہوتے) ہیں)

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

(اور معاملات میں ان سے مشورہ کر لیا کرو)

چونکہ رسول اللہ (ﷺ) کے وصال کے وقت آپ (ﷺ) کے کوئی صاحبزادہ

وراثت سنبھالنے کے لیے موجود نہ تھے، اگر کوئی صاحبزادہ باحیات ہوتے تو امید کی جاسکتی تھی کہ آپ (ﷺ) کے جاں نثار صحابہ انہی کو آپ (ﷺ) کا جانشین بنا دیتے لیکن اس وقت آپ (ﷺ) کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ تھیں اور آپ (ﷺ) کبھی بھی عورت کی حاکمیت اعلیٰ کے حق میں نہ تھے، اس لیے آپ (ﷺ) کی جانشینی کے مسئلہ پر بعض صحابہ کرام خاصے فکرمند تھے۔

آپ (ﷺ) کے قریب ترین رشتہ داروں میں آپ (ﷺ) کے چچا حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ سمیت متعدد عم زاد موجود تھے، اور اسلامی قانون کے مطابق وراثت چچا کو ملتی ہے چچا کے بیٹوں کو نہیں، یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ (ﷺ) مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ رسول اللہ (ﷺ) نے جانشینی کے مسئلہ پر کوئی وصیت نہیں کی، آؤ ہم چل کر آپ (ﷺ) سے پوچھتے ہیں کہ اگر سیاسی قیادت ہمارے پاس رہنی ہے تو ہمیں معلوم ہو جائے، اور اگر نہیں تو ہم آپ (ﷺ) کی وصیت کے گواہ بن جائیں، لیکن حضرت علیؓ نے انکار کر دیا، اور فرمایا: ’’اگر ابھی آپ (ﷺ) نے ہمارے متعلق انکار کر دیا تو بعد میں کوئی بھی شخص ہمیں اس کا اہل نہ سمجھے گا۔‘‘ (۱)

حضرت علیؓ کے اس قول سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ (ﷺ) نے کسی بھی موقع پر صراحۃً یا کنایۃً یہ نہیں فرمایا تھا کہ آپ (ﷺ) کے بعد حضرت علیؓ ہی آپ (ﷺ) کے جانشین ہوں گے، اسی طرح یہ بھی واضح ہوا کہ خلافت کا مسئلہ اسلام کے بنیادی ارکان میں سے نہیں ہے ورنہ آپ (ﷺ) اس کے متعلق واضح ہدایت ضرور دیتے جیسا کہ دیگر ارکان اسلام سے متعلق احکامات موجود ہیں۔

بہرحال حضور پاک (ﷺ) کی جانشینی کا معاملہ طے نہ ہو سکا اور آپ (ﷺ) اس دنیا سے رخصت ہو گئے، آپ (ﷺ) کی وفات کے فوراً بعد استحقاق خلافت کے لیے

---

(۱) بخاری: ۶۲۶۶، ۴۴۴۷

اولیت وافضلیت کا مسئلہ سامنے آگیا، ایک طرف حضرت عباسؓ ابن عبدالمطلب حضرت علیؓ کومخاطب ہوکر کہتے ہیں:

”أعطني يدك لأبايعك حتى يقول القوم عم رسول الله ﷺ بايع ابن عم رسول الله“

(اپنا ہاتھ آگے کیجیے کہ میں آپ سے بیعت کروں، تاکہ لوگ کہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) کے چچا نے آپ (ﷺ) کے چچا کے بیٹے کے ہاتھ پر بیعت کی)

اس پر حضرت علیؓ نے جواب دیا:

”هـل يـطـمـع فيها طامع غيرى ثم اننى لا أريد أن أبايع من وراء رتاج“

(کیا میرے علاوہ بھی کوئی اس کی توقع رکھتا ہے؟ پھر بھی میں خفیہ طریقے سے بیعت لینا نہیں چاہتا)(۱)

حضرت علیؓ کو اطمینان تھا کہ ان کی خلافت پر کوئی بھی سوال نہیں اٹھائے گا اور یہ اطمنان خاص طور پر اس لیے بھی تھا کہ حضور (ﷺ) کے چچا آپؓ کی حمایت کررہے تھے، نیز بعض صحابہ کرام کو بھی یہی اندازہ تھا کہ حضرت علیؓ ہی خلیفۃ الرسول ہوں گے۔

خلافت کے سلسلہ میں جن حضرات نے حضرت علیؓ کو ہی مستحق سمجھا تھا انھیں تاریخ میں ''شیعان علی'' (۲) کہا جاتا تھا، گویا شیعیت کا یہی نقطۂ آغاز تھا جس کی ظاہری بنیاد محض افضلیت اور غیر افضلیت پر تھی، لیکن جب شیعیت کے اس ڈھانچہ میں یہودیت اور مجوسیت کی روح سرایت کرگئی تو معاملہ حد سے تجاوز کرگیا، اور بات

---

(۱) کتاب الانساب از بلاذری جلد :۱ پیرا:۱۱۸۵ بحوالہ رسول اللہ (ﷺ) کی حکمرانی وجانشینی از ڈاکٹر محمد حمیداللہ مرحوم (۲) تاریخ کی قدیم کتابوں میں اساطین اہل سنت کے لیے''شیعہ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس سے مراد یہی شیعہ ہیں جو حضرت علی کے مخلص ساتھی تھے، واقدی کی تاریخ اور استیعاب میں اس طرح کے الفاظ کثرت سے آئے ہیں لہٰذا اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔

افضلیت اور غیر افضلیت سے آگے نکل کر خلفائے ثلاثہ کی شان میں گستاخی، ان کی تکفیر اور حضرت علیؓ کے فضائل کی بہتات تک پہنچ گئی، پھر تیسری صدی ہجری کے بعد جب شیعیت نے مستقل مذہب کی شکل اختیار کرلی تو اس کی پوری عمارت خلافت کی ہی بنیاد پر قائم کی گئی جسے بعد میں امامت سے تعبیر کیا گیا اور پھر شیعوں نے اپنے اس عقیدۂ امامت کو ایک نیا فلسفہ دیا جس میں ان کا امام سارے نبیوں سے بھی افضل قرار پایا۔

شیعوں نے اپنے مذہب کی بنیاد حضرت علیؓ کی ذات پر رکھی تھی اس لیے انھوں حضرت علیؓ کی شان میں حد سے زیادہ تجاوز کیا، طرح طرح کی روایتیں گڑھیں، ان کے فضائل ومناقب بیان کرتے کرتے انھیں نبی سے بھی افضل بنادیا بلکہ خدائی درجہ تک پہنچادیا، اور یہ سب کچھ نادانستہ یا فرطِ عقیدت میں نہیں ہوا بلکہ یہ سوچ سمجھ کر ایک سازش کے تحت ہوا تا کہ جس طرح سے عیسائیت کا چہرہ مسخ کیا گیا اسی طرح اسلام کی شکل وصورت بھی بگاڑ دی جائے اور اسلام اور آنحضرت (ﷺ) کی ذات اقدس تاریخ کا ایک حصہ بن کر رہ جائے، چنانچہ اس کاز کی تکمیل کے لیے حضرت علیؓ اور اہل بیت کی عقیدت ومحبت کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرکے سادہ لوح مسلمانوں کو فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کردیا۔ جبکہ حضرت علی مرتضیٰؓ نے کبھی بھی خود کو خلفائے ثلاثہ سے افضل نہیں قرار دیا۔

شیعوں نے حضرت علی کی افضلیت واولیت ثابت کرنے کے لیے بعض ایسے دلائل بھی پیش کیے ہیں جو اہل سنت والجماعت کی کتابوں میں موجود ہیں، لیکن انھوں نے ان دلائل کو نہ صرف توڑ مروڑ کر پیش کیا بلکہ ان دلائل کی من چاہی تشریحات کیں، ان کے حقیقی مفہوم کو غلط قرار دیا اور ان کے سیاق وسباق کو کبھی بدل کر تو کبھی حذف کرکے حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

حضرت علی کے فضائل اور خلفائے ثلاثہ پر ان کی افضلیت وفوقیت کو ثابت کرنے کے لیے شیعوں نے جن روایتوں کا سہارا لیا ان میں سے چند اہم روایتیں یہ ہیں:

حدیث غدیر سے غلط استدلال

آنحضرت (ﷺ) کی جانشینی اور حضرت علیؓ کی خلافت کے سلسلہ میں شیعوں کی سب سے معتبر اور بنیادی دلیل ''موالات علی'' والی روایت ہے جسے ''حدیث غدیر'' بھی کہا جاتا ہے۔اس روایت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اس حدیث سے متعلق گیارہ جلدوں میں ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام ہی ہے ''حدیث الغدیر''۔

اللہ کے رسول (ﷺ) نے حجۃ الوداع سے لوٹتے وقت خم نامی تالاب کے پاس اپنے خطبہ میں فرمایا تھا:

''من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ، اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ۔'' (۱)

(جس کا میں مولیٰ ہوں تو یہ علی بھی اس کے مولی ہیں، اے اللہ! جو علی سے موالات رکھے تو بھی اس سے موالات رکھ، اور جو علی سے عداوت رکھے تو بھی اس سے عداوت رکھ)

شیعہ اس روایت کو بنیاد بنا کر کہتے ہیں کہ مولیٰ کا مفہوم خلافت و جانشینی ہے، اور حضور (ﷺ) کے اس فرمان ''من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ'' کا مطلب یہی ہے کہ حضرت علیؓ بلافصل خلیفہ ہیں، جبکہ قرآن وحدیث میں کہیں بھی یہ لفظ جانشین کے معنی میں استعمال نہیں ہوا، قرآن مجید میں مولیٰ کا لفظ متعدد جگہوں پر مستعمل ہوا ہے لیکن کہیں بھی حاکم، ولی عہد یا جانشین کا مفہوم نہیں ہے۔

ابن الاثیر کے مطابق مولیٰ کا لفظ رب، منعم، ناصر، محبّ، حلیف، غلام، چچازاد، داماد کے لیے بولا جاتا ہے۔(۲)

---

(۱)سنن الترمذی:۴۰۷۸ (۲)النھایۃ فی غریب الحدیث:۵/۲۲۸

کسی نے بھی مولیٰ کے لفظ کو خلافت یا امامت کے مفہوم میں استعمال نہیں کیا، اس کے علاوہ اگر نبی کریم (ﷺ) کا منشاء حضرت علیؓ کی جانشینی تھی تو آپ (ﷺ) اس کے لیے کوئی واضح لفظ استعمال فرماتے نا کہ ایسا لفظ جس کے متعدد معانی ہوں کہ اس سے مقصود کا حصول دشوار ہو جائے۔

بالفرض شیعوں نے اس روایت سے حضرت علیؓ کی جانشینی کا مفہوم لیا ہو تو اتنے اہم مسئلہ میں صرف ان کے فہم کو بنیاد نہیں بنایا جا سکتا، اس کے علاوہ اگر حضور (ﷺ) کا منشا اپنے بعد حضرت علیؓ کو خلیفہ نامزد کرنا ہوتا تو یہ بات آپ (ﷺ) حج کے موقع پر ہی فرما دیتے جہاں چاروں سمت سے مسلمان اکٹھا ہوئے تھے، اور تکمیل دین کی آیت ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ کا نزول ہو رہا تھا، اور تکمیل دین کی آیت کے بعد حضور (ﷺ) کے کسی حکم کو کسی تشریعی حکم سمجھنے کا مطلب دین کو مکمل نہ ماننا ہے، اور یہ واقعہ حجۃ الوداع سے لوٹتے وقت کا ہے، جہاں صرف آپ (ﷺ) کے رفقائے سفر تھے۔

خود حضرت علیؓ نے اپنی پوری زندگی میں کہیں بھی اس بات کا حوالہ نہیں دیا کہ رسول اللہ (ﷺ) نے آپؓ کو اپنا خلیفہ یا جانشین نامزد کیا تھا، جبکہ حضرت امیر معاویہؓ سے اختلافات کے دوران اسلام کے سلسلہ میں اپنی خدمات اور رسول اللہ (ﷺ) سے اپنی قرابت داری کو ضرور بیان کیا ہے۔

حدیث غدیر کا پس منظر

اس روایت کا ایک خاص پس منظر ہے، وہ یہ کہ مدینہ کے کچھ اصحاب خاص طور سے حضرت بریدہ بن حصیبؓ اور حضرت ابو سعیدؓ اور ان کے کچھ حامیوں کو حضرت علیؓ سے شکایت تھی کہ انھوں نے کسی موقع پر مال غنیمت کے استعمال سے متعلق آپ کی ہدایات میں کچھ سختی محسوس کی تھی، جس کی وجہ سے مدینہ میں حضرت علیؓ سے متعلق کچھ چہ می گوئیاں شروع ہو گئی تھیں، آپ (ﷺ) کو اس بات کی خبر ہوئی لیکن آپ (ﷺ)

نے حجۃ الوداع کے موقع پر مکہ مکرمہ یا عرفہ کے دن اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں کی بلکہ اس کو مدینہ کی واپسی تک کے لیے مؤخر کر دیا، کیونکہ اس معاملہ کو تعلق انہی حضرات سے تھا جو مدینے کے تھے۔(۱)

شیعوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ غدیر خم جہاں واقع ہے وہ تمام حاجیوں کے رخصت ہونے کی جگہ ہے، گویا حاجیوں کی رخصتی کے وقت آپ (ﷺ) نے یہ بات ارشاد فرمائی، جبکہ غدیر خم جحفہ میں ہے جو مکہ سے تقریباً دوسو پچاس کلومیٹر کی دوری پر ہے، لہٰذا یہ کہنا مکہ سے ڈھائی سو کلومیٹر دور حاجیوں کے جدا ہونے کی جگہ تھی تو ایک لغو اور غیر معقول بات ہوگی، حاجیوں کے جمع ہونے اور رخصت ہونے کی جگہ مکہ مکرمہ ہی تھی، یہیں سے طائف والے طائف کی طرف، یمن والے یمن کی طرف اور عراق والے عراق کی طرف لوٹتے تھے، اور اہل مکہ حج کے بعد مکہ میں ہی ٹھہر جاتے تھے، اور جحفہ کی طرف وہی لوگ جاتے تھے جنھیں مدینہ پہنچنا ہوتا یا جن کا ٹھکانہ مدینہ کے راستہ میں ہوتا، اور انہیں لوگوں کے سامنے آپ (ﷺ) نے یہ خطبہ دیا تھا۔

تشبیہ ہارونؑ سے غلط استدل

اللہ کے رسول (ﷺ) جب غزوہ تبوک کے لیے تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ میں حسب ذیل لوگ ہی ٹھہرے رہے اور وہ غزوہ میں شریک نہ ہوئے:

۱-جنھیں خود نبی کریم (ﷺ) نے ٹھہرنے کا حکم دیا۔(۲) عورتیں۔(۳) بچے۔ (۴) معذور حضرات یعنی بوڑھے، اندھے، لنگڑے، بیمار وغیرہ (۵) جو بلا کسی عذر کے شریک جنگ نہ ہوئے اور بعد میں توبہ وندامت کے بعد ان کی براءت آسمان سے

(۱) تفصیلات کے لیے دیکھئے: بخاری کتاب المغازی باب بعث علی وخالد الی الیمن:۴۳۵۰۔ البدایہ والنہایہ:۵/ ۱۹۵ الحدیث ۵/ ۲۲۸

نازل ہوئی جیسے کعب بن مالکؓ، ہلال بن امیہؓ اور مرارۃ بن ربیعؓ۔(۲) منافقین۔

غزوہ تبوک میں شریک نہ ہونے والوں میں ایک نام حضرت علیؓ کا بھی تھا، ان کا شمار پہلے قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے یعنی جن کو خود آپ (ﷺ) نے مدینہ میں ہی رہنے کا حکم دیا تھا۔

جب حضرت علیؓ کو اس بات کا علم ہوا کہ انھیں مدینہ میں ٹھہرنے کا حکم ہے تو وہ نبی کریم (ﷺ) کے پیچھے چل دیے، آپ (ﷺ) مدینہ منورہ سے کوچ کر چکے تھے، حضرت علیؓ آنحضرت (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جاتے ہیں؟ تو آنحضور (ﷺ) نے انھیں حوصلہ دیا اور فرمایا:

"ألا ترضى أن تكون مني بمنزلة هارون من موسىٰ الا انه لا نبي بعدي" (۱)

(کیا تم اس بات سے راضی نہیں کہ تم میری طرف سے اسی مقام پر ہو جو ہارون کا موسیٰ سے تھا، البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں)

آنحضرت (ﷺ) نے یہ تشبیہ حضرت علیؓ کی ہمت افزائی، اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے دی تھی، یقیناً حضرت علیؓ جیسے تجربہ کار اور جرأت مند کا کسی غزوہ میں شریک نہ ہونا ان کے لیے باعث کلفت ہے لیکن یہاں معاملہ مدینہ منورہ میں اہل بیت کی حفاظت اور ان کی نگہبانی کا تھا، اور اس کے لیے حضرت علیؓ سے زیادہ موزوں کوئی ذات نہ تھی۔

حضرات شیعہ کا کہنا ہے کہ اس حدیث سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت علیؓ ہی حضور (ﷺ) کے خلیفہ ہوں گے کیونکہ جب حضرت موسیٰ میقات پر گئے تو حضرت ہارونؑ ان کے خلیفہ تھے۔

---

(۱) بخاری: ۴۴۱۶

لیکن شیعوں کا یہ استدلال چند وجوہات کی بنا پر باطل ہے:

پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول (ﷺ) نے حضرت علی کو مدینہ میں اپنا نائب نہیں بنایا تھا، بلکہ انھیں اپنے اہل بیت کا محافظ مقرر کیا تھا، اور مدینہ میں حضرت محمد ابن مسلمہ انصاریؓ کو ایک روایت کے مطابق حضرت سباع بن عرفطہؓ کو اپنا نائب بنایا تھا۔(۱)

اس کے علاوہ مختلف موقعوں پر آپ (ﷺ) نے حضرت علیؓ کے علاوہ دوسروں کو مدینہ منورہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا، مثلاً جب آپ (ﷺ) بنونضیر کے مقابلہ کے لیے مدینہ سے باہر نکلے تو عبداللہ ابن ام مکتوم کو حاکم مدینہ مقرر کیا، غزوۂ ذات الرقاع کے موقع پر حضرت عثمانؓ مدینہ کے حاکم متعین ہوئے تھے، غزوہ بدر کے موقع پر ابوالبابہ بن عبدالمنذرؓ حاکم مقرر ہوئے تھے۔ ظاہر ہے یہ استخلاف مطلق نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ ان اصحاب میں سے کسی کو بھی خلیفہ تسلیم نہیں کیا گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ہارونؑ، حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ نہیں ہوئے تھے، بلکہ وہ حضرت موسیٰ سے قبل ہی وفات پا چکے تھے۔ اور حضرت موسیٰؑ کے بعد یوشع بن نونؑ ان کے قائم مقام قرار پائے تھے۔ اور یہاں معاملہ آنحضرت (ﷺ) کی وفات کے بعد کا ہے نہ کہ آپ (ﷺ) کی زندگی کا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرت ہارون اور حضرت علیؓ کا معاملہ بالکل مختلف ہے، حضرت ہارون اس شان سے خلیفہ تھے کہ ان کے ساتھ پورا لشکر اور بنی اسرائیل کا پورا نظام تھا، جبکہ حضرت علیؓ کے ساتھ صرف وہی لوگ تھے جو کسی عذر کی وجہ سے غزوہ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔

چوتھی وجہ یہ کہ آنحضرت (ﷺ) نے یہ بات اس وقت فرمائی جب حضرت علیؓ نے آکر یہ عرض کیا کہ کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جاتے ہیں؟ اور اگر یہ کوئی فضیلت کا معاملہ ہوتا تو حضرت علی نبی کریم (ﷺ) سے یوں تذکرہ نہ کرتے۔

---

(۱)(۲) تاریخ طبری: ۲/ ۳۶۸۔ البدایہ والنہایہ: ۵/ ۷

پانچویں وجہ یہ ہے کہ اگر محض تشبیہ کی بنیاد پر کسی کی افضلیت اور غیر افضلیت ثابت کرنی ہوتو غزوہ بدر کے موقع پر آپ (ﷺ) نے حضرت ابوبکرؓ کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے تشبیہ دی اور حضرت عمرؓ کو حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ سے تشبیہ دی اور یہ انبیاء حضرت ہارونؑ سے زیادہ جلیل القدر مانے جاتے ہیں۔

آیت تطہیر سے غلط استدلال

حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں:

''ایک صبح نبی کریم (ﷺ) گھر سے نکلے، آپؐ کے جسم پر ایک چادر تھی، پس حسنؓ آئے تو آپ (ﷺ) نے ان کو اپنی چادر میں لے لیا، پھر حسینؓ آئے، آپ نے ان کو بھی ان کے ساتھ کرلیا، پھر فاطمہ آئیں ان کو بھی آپ نے چادر میں لے لیا، پھر علیؓ آئے اور آپ نے ان کو بھی اپنی چادر میں لے لیا اور فرمایا: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ (اے اہل بیت اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور کردے اور تم کو صاف وشفاف کردے)(۱)

اعتراض :- مذکورہ روایت کی بنا پر اہل تشیع کا دعویٰ ہے کہ آنحضرت (ﷺ) کے اہل بیت میں صرف حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور حسنؓ و حسینؓ شامل ہیں، آپؐ کی ازواج مطہرات اس میں شامل نہیں ہیں۔

جواب: مذکورہ آیت کا سیاق وسباق واضح طور پر دلالت کررہا ہے کہ اس آیت کا نزول ازواج مطہرات کی شان میں ہی ہوا ہے، اور اہل بیت سے حقیقی طور پر ازواج ہی مراد ہیں، ملاحظہ ہو:

---

(۱) مسلم::۲۴۲۴

﴿يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوفًا وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَى فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا﴾

(اے نبی کی بیویو! تم ہر کسی عورت کی طرح نہیں ہو اگر تم پرہیز گاری رکھو، بس دب کر بات مت کرنا کہیں وہ شخص جس کے دل میں روگ ہے امید نہ کرنے لگ جائے اور معقول بات کہو اور اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ رہو اور گزشتہ زمانہ جاہلیت کی طرح بن ٹھن کر مت نکلنا اور نماز قائم رکھنا اور زکوۃ دیتی رہنا اور اللہ اور اس کے رسول کی بات مانتی رہنا، اے (نبی کے) گھر والو! یقیناً اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے میل کچیل کو دور کر دے اور تمہیں پوری طرح پاک صاف کر دے اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیتیں اور حکمت (کی جو باتیں) سنائی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو بلاشبہ اللہ بڑا باریک بیں اور ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے)

مذکورہ آیات میں واضح طور پر ازواج مطہرات کو مخاطب کیا گیا، اس کے بعد اللہ کے رسول (ﷺ) نے اپنی چادر میں حضرت علی و فاطمہ اور حضرات حسنین کو لے کر مذکورہ آیت تلاوت فرمائی، اسی لیے اس روایت کو ''حدیث الکساء'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس طرح آپ (ﷺ) نے نص قرآنی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ بھی اہل بیت میں شامل ہیں۔

خلاصہ یہ کہ آیت تطہیر کی رو سے ازواج مطہرات اہل بیت ہیں، اور حدیث

الکساء کی رو سے حضرت علیؓ وفاطمہؓ اور حضرات حسنینؓ بھی اہل بیت میں شامل ہیں۔

اگر اللہ کے رسول (ﷺ) صراحت فرما کر حضرت علیؓ وفاطمہؓ اور حضرات حسنینؓ کو اہل بیت میں شامل نہ فرماتے تو دنیوی نظام کے مطابق کوئی بھی انھیں ''اہل بیت نبی'' میں شامل نہ کرتا کیونکہ نسل اور خاندان کی نسبت مردوں کی جانب کی جاتی ہے، اس اعتبار سے حضرت علیؓ وفاطمہؓ اور حضرات حسنینؓ کی نسبت ''اہل بیت ابی طالب'' کی جانب ہوتی، نیز یہاں ان حضرات کی فضیلت اور عندالرسول ان کی محبوبیت اور اہمیت بتلانا مقصود تھی تاکہ لوگ اس کا لحاظ رکھیں، ورنہ جس طرح آنحضرت (ﷺ) کی بیٹی حضرت فاطمہ اور داماد حضرت علی تھے، اسی طرح دیگر بیٹیاں، ان کے شوہر اور ان کی اولاد بھی اسی زمرہ میں شامل ہوں گی، کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ حضور ایک بیٹی کو اپنے اہل بیت میں شامل کریں اور باقی تینوں کو خارج کر دیں۔

اعتراض:- اہل میں بیوی شامل نہیں ہے۔

جواب:- اہل میں بیوی بھی شامل ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کا تذکرہ اس طرح ہے: ﴿ قَالُواْ أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللّهِ رَحْمَتُ اللّهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ(ھود:۳۷) (انھوں نے کہا کہ آپ کو اللہ کے حکم پر تعجب ہے؟ اہل بیت! تم پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں بلاشبہ وہ ہر تعریف کا مستحق بڑی شان والا ہے)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بیوی کی تذکرہ اس طرح ہے: ﴿ فَلَمَّا قَضَى مُوسَى الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ ﴾ (اور جب موسیٰ نے مدت پوری کر لی اور اپنے اہل یعنی بیوی کو لے کر چلے)

اردو زبان میں ''اہلیہ'' یعنی بیوی کا لفظ اسی اہل سے ہی مشتق ہے۔

اعتراض:- آیت میں ''عَنكُمُ'' اور ''يُطَهِّرَكُمْ'' کا صیغہ استعمال ہوا ہے جو مردوں کے لیے ہے، یعنی اگر یہاں ازواج النبی (ﷺ) مراد ہیں تو مؤنث کا صیغہ

"عنکن"اور" یطھر کن" استعمال کیوں نہیں ہوا؟

جواب:- یہاں مؤنث کے بجائے مذکر کا صیغہ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ اہل بیت میں آنحضرت (ﷺ) بھی داخل ہیں بلکہ وہ سربراہ ہیں، اور عربی کا قاعدہ ہے کہ جب مخاطب میں مرد وعورت دونوں شامل ہوں تو مرد کے اعتبار سے صیغے استعمال کیے جاتے ہیں۔اسی طرح کا قرآنی خطاب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ کو بھی ہوا ہے﴿ قَالُوا أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ﴾(هود:۳۷)

چنانچہ آیت تطہیر کا اطلاق حضرت علیؓ وفاطمہؓ اور حضرات حسنینؓ پر کرنا درست نہیں، اور اس آیت کی رُو سے حضرت علیؓ کا مقام ومرتبہ ثابت نہیں ہوتا بلکہ ''حدیث الکساء'' کی بنیاد پر حضرت علی اور ان کے اہل خانہ کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے، اور اس فضیلت کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت علی کا مقام ومرتبہ حضرت ابوبکر وحضرت عمر اور حضرت عثمان سے بڑھا ہوا ہے اور وہ خلافت کے اول مستحق ہیں، کیونکہ اس فضیلت میں رسول اللہ (ﷺ) نے حضرت سلمان فارسیؓ کو بھی شامل کرتے ہوئے فرمایا تھا:" سلمان منا أهل البيت" (سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہیں) اس کے علاوہ اہل بیت میں وہ سبھی شامل ہیں جن کے لیے صدقہ حرام ہے اور وہ ہیں: آل علی، آل جعفر، آل عقیل اور آل عباس نیز آل حارث بن عبدالمطلب۔(۱)

آیت ولایت سے غلط استدلال

آیت ولایت سے مراد قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ﴾ (المائدہ:۵۵)

(۱) مسلم کتاب فضائل الصحابۃ:۳۶۔ مسلم کتاب الزکاۃ:۱۶۷

(تمہارا ولی تو اللہ ہے اور اس کا رسول ہے اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور نماز قائم رکھتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے رہتے ہیں اور وہ جھکنے والے لوگ ہیں)

شیعوں کا کہنا ہے کہ حضرت علی ظہر کی نفل نماز ادا کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں ایک سائل آ گیا، آپ رکوع کی حالت میں تھے، اس کے سوال کرنے پر آپ نے اسے اپنی انگوٹھی دیدی، اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی، جس میں حضرت علی کی ولایت کا اعلان کیا گیا، چونکہ حضرت علی کے علاوہ کسی نے بھی رکوع کی حالت میں صدقہ نہیں کیا، اس لیے اس سے خلفائے ثلاثہ پر حضرت کی اولیت ثابت ہوتی ہے، اور اس میں جو جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے تو اس سے اشارہ حضرت علی کی اولاد کی جانب ہے جو بعد میں امام ہوئے۔(۱)

شیعوں کے مذکورہ دعوے کے باطل ہونے کی کئی وجہیں ہیں:

۱- مذکورہ واقعہ کی سند کسی بھی معتبر کتاب میں نہیں ہے، بالفرض اس واقعہ کو صحیح مانا جائے تو اس میں حضرت علی کی کسر شان ہے، کیونکہ قرآنی حکم ہے ﴿قد أفلح المؤمنون الذين هم في صلاتهم خاشعون﴾ یعنی وہ مؤمن کامیاب ہوئے جو نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں، کیا خشوع کی حالت میں یہ ممکن ہے کہ حضرت علی سائل کی طرف متوجہ ہوں اور اپنی انگوٹھی اس کو عنایت کریں، کیا ایسی صورت میں خشوع باقی رہے گا......؟!

۲- آیت میں تذکرہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا ہے، کیا حضرت علیؓ کے پاس اتنا مال تھا کہ آپ پر زکاۃ فرض ہوگئی تھی؟ کیا زکاۃ کی ادائیگی کے لیے حضرت علی کو سائل کا انتظار تھا؟

۳- اگر رکوع کی حالت میں زکوٰۃ کا ادا کرنا قابل تعریف عمل ہوتا تو یہ عمل بعد

(۱) مجمع البیان: ۲/۶۴۳ از طبرسی بحوالہ ولایت وحکومت از وزیر عباس حیدر قم: ۷۰

میں بھی اختیار کیا جاتا اور کم از کم شیعوں کے نزدیک تو اس ’’سنتِ علی‘‘ پر عمل کیا جاتا، لیکن سنیوں اور شیعوں میں کسی کے یہاں یہ عمل مقبول نہیں ہے۔

۴- آیت میں ’’یُقِیمُونَ الصَّلاَةَ‘‘ کا لفظ موجود ہے جس میں رکوع کا بھی تذکرہ آ گیا، اب دوبارہ رکوع کے تذکرہ میں تکرار لازم آئے گی، اس لیے یہاں رکوع کا مطلب نماز کا رکوع نہیں بلکہ تواضع و فرمانبرادی مراد ہے جس کی دلیل قرآن مجید کی متعدد آیات ہیں، چنانچہ فرمایا گیا:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ﴾ (المرسلات:٤٨)

(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فرمانبردار بن جاؤ تو وہ فرمانبرداری نہیں کرتے)

حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾

(آل عمران:٤٣)

(اے مریم اپنے رب کے سامنے جھک جاؤ، اور سجدہ کرو اور فرمانبرداروں کے ساتھ فرمانبردار بن جاؤ)

حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ میں ہے:

﴿وَظَنَّ دَاوُودُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعاً وَأَنَابَ﴾

(ص: ٢٤)

(اور داؤد کو خیال ہوا کہ ہم نے ان کو آزمایا ہے تو وہ اپنے رب سے استغفار کرنے لگے اور سجدے میں گر پڑے اور رجوع ہوئے)

یہاں رکوع سے مراد سجود ہے، اور سجود کے لیے رکوع کا لفظ ان کے غایت خضوع کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

چنانچہ مذکورہ آیت میں بھی ’’وھم راکعون‘‘ سے مراد ’’وھم خاضعون‘‘

(یعنی تواضع اختیار کرنے والے) ہی ہے، اور اس صفت میں حضرت علیؓ کے ساتھ سارے صحابہ کرام شامل ہیں، اور جمع کا صیغہ اسی پر دلالت کر رہا ہے۔

۵-اس آیت کا شان نزول بنوقینقاع کا واقعہ ہے کہ جب انھوں نے بغاوت کی تو ان کے حلیفوں میں حضرت سعد بن عبادۃ اور منافق عبداللہ بن ابی بھی تھا، حضرت سعد بن عبادۃ نے بنوقینقاع سے اپنے تعلقات ختم کر لیے اور نبی کریم (ﷺ) کے فیصلہ پر راضی ہوئے، اور عبداللہ بن ابی نے بنوقینقاع سے بھاری مدد کا وعدہ کیا اور نبی کریم (ﷺ) کے پاس ان کی سفارش بھی کی، پیچھے کی آیت میں اسی طرف اشارہ ہے:

﴿ يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ آمَـنُـواْ لاَ تَتَّخِذُواْ الْيَهُودَ وَالنَّصَـارَى أَوْلِيَـاء بَـعْـضُـهُـمْ أَوْلِيَـاء بَـعْـضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللّهَ لاَ يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِيْنَ﴾ (المائدہ: ۵۱)

(اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں جو ان کو دوست بنائے گا تو وہ انہیں میں شمار ہوگا، یقیناً اللہ ناانصافوں کو راستہ نہیں دکھاتا)

۶-بالفرض اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ آیت حضرت علیؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے تو بھی اس سے حضرت علیؓ کی خلافت بلافصل ثابت نہیں ہوتی، بلکہ حضرت علیؓ کے بعد شیعوں کے تمام ائمہ کی امامت رد ہوتی ہے کیونکہ آیت میں "إنـمـا" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ حصر کے معنی پر دلالت کرتا ہے، یعنی اللہ کا دوست صرف وہی ہے جس نے رکوع کی حالت میں زکاۃ ادا کی، اور بلا شبہ حضرت علیؓ کے علاوہ دیگر ائمہ نے یہ عمل نہیں کیا اور نہ ہی ''امام غائب'' نے کیا جن کے ہاتھ پر حضرت علیؓ بھی بیعت کریں گے، اور نہ ظہور کے بعد وہ یہ عمل کریں گے۔ پس ثابت ہوا کہ یا تو یہ آیت حضرت علیؓ کی شان میں نہیں ہے یا حضرت علی کے علاوہ کسی شیعہ کی امامت درست نہیں ہے۔

آیت مباہلہ سے غلط استدلال

آیت مباہلہ سے مراد یہ آیت ہے:

﴿ فَمَنُ حَآجَّكَ فِيهِ مِن بَعُدِ مَا جَاءَ كَ مِنَ الُعِلُمِ فَقُلُ تَعَالَوُا نَدُعُ أَبُنَاءَ نَا وَأَبُنَاءَ كُمُ وَنِسَاءَ نَا وَنِسَاءَ كُمُ وَأَنفُسَنَا وأَنفُسَكُمُ ثُمَّ نَبُتَهِلُ فَنَجُعَل لَّعُنَةَ اللّٰهِ عَلَى الُكَاذِبِينَ﴾(آل عمران: ٦١)

(پھر جو (عیسیٰ کے) سلسلہ میں آپ کے پاس علم یقینی آجانے کے بعد بھی جھگڑا کریں تو ان سے کہہ دیجیے کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تم اپنے بیٹوں کو اور ہم اپنی عورتوں کو بلائیں اور تم اپنی عورتوں کو اور ہم اپنے لوگوں کو بلائیں اور تم اپنے لوگوں کو، پھر مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں)

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ مدینہ منورہ سے قریب نجران نام کی ایک بستی تھی جس میں عیسائی آباد تھے، جب انھیں آپ (ﷺ) کی بعثت اور پھر آپ کی فتوحات کی خبر ہوئی تو ایک وفد آپ (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوا، اس کا مقصد آپ (ﷺ) کی نبوت کو پرکھنا اور مستقبل میں اپنے لیے تحفظات کا حاصل کرنا تھا، انھوں نے حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے متعلق سوالات کیے، آپ (ﷺ) پر بذریعہ وحی حضرت عیسیٰ کے حالات نازل ہوئے، آپ نے ان کو جوابات دیے لیکن انھوں نے ماننے کے بجائے ڈھٹائی دکھائی جس پر اللہ کی جانب سے یہ ''آیت مباہلہ'' نازل ہوئی۔

جب عیسائی وفد واپس گیا تو ان کے بڑے بوڑھوں نے ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ تم بھی جانتے ہو کہ وہ نبی برحق ہیں، اور نبی سے مباہلہ کا نتیجہ ہماری پوری قوم کی ہلاکت ہے، یہ سن کر ان کی ہمت پست پڑ گئی، انھوں نے مباہلہ سے قطعی طور پر انکار کر دیا اور جزیہ دینے پر راضی ہو گئے۔

اعتراض :- شیعوں کا کہنا ہے کہ یہ آیت حضرت علی کی شان میں نازل ہوئی ہے، اور ''أَبْـنَـاء نَا'' سے مراد حضرات حسن و حسین ہیں، ''نِسَـاء نَا'' سے مراد حضرت فاطمہ ہیں، اور ''أَنفُسَنَا'' سے مراد حضرت علی ہیں۔

جواب:- اس بات کی کہیں صراحت نہیں ہے کہ یہ آیت حضرت علی کی شان میں نازل ہوئی ہے، اس کے علاوہ یہ تینوں الفاظ عیسائیوں کے لیے بھی مستعمل ہوئے ہیں، پس اگر مسلمانوں کے نزدیک ان الفاظ سے مراد اہم شخصیات اور ان کے فضائل ہیں تو اسی مقام و مرتبہ کی شخصیات ان کے یہاں بھی ماننی پڑے گی، جبکہ ایسا نہیں ہے۔ اسی لیے ان الفاظ کو ان کے عمومی مفہوم میں سمجھا جائے گا۔

''أَبْنَاء نَا و أبناء کم'' مراد یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے بیٹوں کو مباہلہ کے لیے ساتھ لائے، ایسے ہی أنفسنا و أنفسکم سے مراد ہم میں ہر شخص اور تم میں سے ہر شخص آئے۔ ''أنفسنا'' سے اگر حضرت علیؓ کو مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوا کہ وہ حضور (ﷺ) کے برابر اور ہم پلہ ہیں، اور نبوت و رسالت میں بھی شریک ہیں۔

اعتــراض:- رسول اللہ (ﷺ) نے حضرت علی و فاطمہ اور حضرات حسنین کو مباہلہ میں شریک کرنے کے لیے بلا لیا تھا، یہ ان کے مقام بلند کی واضح دلیل ہے جسے سنی علماء تسلیم نہیں کرتے۔

جواب:- بعض روایتوں میں اس کی صراحت موجود ہے کہ آنحضرت (ﷺ) کے ہمراہ بعض صحابہ کرام بھی اپنی اولاد کو لے کر آگئے تھے:

> ''ابن عساکر نے حضرت جعفر صادق سے، انھوں نے اپنے والد سے اس آیت ﴿تعـالـو ندعو أبناء نا و أبناء کم﴾ کے متعلق بیان کیا ہے کہ آپ (ﷺ) نے حضرت ابو بکر کو بھی ان کی اولاد کے ساتھ، اور حضرت عمر کو بھی مع ان کی اولاد کے، حضرت عثمان کو مع ان کی اولاد کے اور حضرت علی کو بھی ان کی اولاد کے ساتھ بلا لیا تھا۔''(۱)

---

(۱) روح المعانی: ۳/۱۹۰، طبع بیروت

واضح رہے کہ مباہلہ کے لیے آنحضرت (ﷺ) نے حضرت علی کو اپنے پاس ضرور بلایا تھا لیکن مباہلہ کی نوبت ہی نہیں آسکی، اور معاملہ پہلے ہی حل ہوگیا، اس لیے اس واقعہ کی کوئی خاص اہمیت نہیں، ہاں! اگر مباہلہ ہوتا اور عیسائی عذاب الٰہی کا شکار ہوتے تو اس واقعہ کی اہمیت ضرور ہوتی تاہم اس وقت بھی اس کا حضرت علی کی خلافت سے کوئی ربط نہ ہوتا، لہٰذا اس آیت سے کسی بھی صورت حضرت علیؓ کی ایسی فضیلت ظاہر نہیں ہوتی جس سے ان کو خلیفہ بلافصل تسلیم کیا جاسکتا، کیونکہ یہاں حضرت فاطمہ بھی شامل ہیں جنھیں شیعہ حضرات بالاتفاق اپنے اماموں کی فہرست میں شامل نہیں کرتے۔

آخری بات

شیعہ حضرات نے حضرت علی مرتضٰی کی خلفائے ثلاثہ پر افضلیت و اولیت ثابت کرنے کے لیے بہتیرے دلائل گڑھے، مفروضہ روایتیں پیش کیں، اور مسلمہ احادیث کے معانی و مطالب سے کھلواڑ کیا لیکن تاریخ گواہ ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علی مرتضیٰؓ نے اپنی پوری زندگی میں کہیں بھی اس بات کا حوالہ نہیں دیا کہ رسول اللہ (ﷺ) نے آپؓ کو اپنا خلیفہ یا جانشیں نامزد کیا تھا، اور نہ اپنی افضلیت و اولیت کے سلسلہ میں ان دلیلوں کو پیش کیا جن سے شیعوں کی کتابیں پٹی پڑی ہیں، بلکہ آپ نے ہمیشہ اس بات کا اعتراف کیا کہ تینوں خلفاء آپؓ سے افضل تھے، اور آپؓ کی بنسبت خلافت کے زیادہ مستحق تھے، آپؓ ان کا پورا ادب واحترام ملحوظ رکھتے اور ان کے دست و بازو بن کر خلافت کے امور میں ان کے بازؤوں کو مضبوط کرتے۔ حاشا وکلا اس میں کسی طرح کی نہ مداہنت تھی اور نہ کسی طرح کا تقیہ تھا، یہی وجہ ہے کہ جب آپؓ خلافت کے منصب پر فائز ہوئے اور حضرت امیر معاویہؓ سے اختلافات رونما ہوئے تو آپؓ نے ان کے مقابل اپنی افضلیت و اولیت کو بیان کیا اور اس کے دلائل بھی دیے، اور جب حالات ناگزیر ہوگئے تو ان کے خلاف ہتھیار بھی اٹھائے۔(۱)

(۱) اس کی تفصیلات نہج البلاغہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

خلفائے راشدین جس ترتیب سے منصب خلافت پر فائز ہوئے یہ خدائے ذوالجلال کی عین مرضی اوراس کی حکمتوں پر مبنی اورامت مسلمہ کے حق میں عین سودمند تھا، اگر یہ ترتیب نہ ہوتی اور حضرت علی مرتضٰی سب سے پہلے خلیفہ منتخب ہوجاتے تو امت بہت سے خیر سے محروم رہتی جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے لکھا ہے:

''آنحضور (ﷺ) کے صحیح تربیت یافتہ چاروں خلفائے راشدین میں حضرت علی مرتضٰیؓ سب سے کم عمر تھے، اگر وہ شروع ہی میں خلیفہ منتخب کرلیے جاتے تو ہم حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت عثمانؓ کی ذاتی خوبیوں اور صلاحیتوں کے استفادہ سے محروم رہ جاتے کیونکہ وہ اپنی خلافت شروع ہونے سے پہلے حضرت علیؓ کے دور خلافت میں وفات پاچکے ہوتے، اور یہ رب تعالٰی جل شانہ کی طرف سے ہوا ہے کہ ہم نے ان سب کی قابلیتوں اور صلاحیتوں سے فائدہ حاصل کیا ہے۔''(۱)

(۱) رسول اللہ (ﷺ) کی حکمرانی اور جانشینی۔ صفحہ:۱۹۹

شیعہ-اکابر امت کی نظر میں

اللہ کے رسول (ﷺ) نے فرمایا:

”جب تم دیکھو کہ لوگ میرے اصحاب کو برا کہہ رہے ہیں تو تم فوراً کہو کہ اللہ کی لعنت ہو تمہارے شر پر۔“

(جامع الترمذی:٣٨٦٦)

امیر المؤمنین حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا:

”اگر میں اپنے شیعوں کو جانچوں تو یہ زبانی دعویٰ کرنے اور باتیں بنانے والوں کے سوا کچھ نہ نکلیں گے، اور اگر ان کا امتحان لوں تو یہ سب کے سب مرتد نکلیں گے۔“(۱)

حضرت حسن (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا:

خدا کی قسم! میں معاویہؓ کو بہتر سمجھتا ہوں ان جیسے ہزاروں سے جن کا دعویٰ ہے کہ وہ میرے شیعہ ہیں، انھوں نے مجھے قتل کرنا چاہا، میرا مال چھین لیا۔ خدا کی قسم! وہ لوگ مجھے مار ڈالیں اور میرے گھر والے خانماں برباد ہو جائیں اس

---

(١)روضة الكافی ص:٧

سے بہتر ہے کہ میں اپنی جان اور اپنے گھر والوں کی حفاظت کے لیے معاویہؓ کی امان میں چلا جاؤں۔''(۱)

حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا:

''خدایا! اگر تو انھیں زندہ رکھ تو انھیں ٹکڑیوں میں بانٹ کر رکھ، ان کے درمیان پھوٹ ڈال دے، کبھی حکمرانوں کو ان سے مطمئن نہ رکھ، انھوں نے ہمیں بلایا تھا کہ ہماری مدد کریں گے مگر یہ دشمنی پر اتر آئے اور ہمارے قتل کے درپے ہو گئے۔''(۲)

حضرت باقر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''اگر سب لوگ ہمارے شیعہ ہو جائیں تو ان میں تین چوتھائی ہمارے لیے مشکوک ہیں، اور بقیہ ایک چوتھائی احمق۔''(۳)

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''میں تمھیں خواہشات کے غلام اور گمراہ رافضیوں سے اور ان کے شر سے بچنے کی نصیحت کرتا ہوں، کیونکہ یہ مسلمانوں سے نفرت اور بغض رکھتے ہیں۔''(۴)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''نہ شیعوں سے بات کیجیے اور نہ ان سے روایت لیجیے کیونکہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔''(۵)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''میں نے شیعہ سے زیادہ جھوٹی گواہی دینے والا کوئی نہیں دیکھا۔''(٦)

---

(١)الاحتجاج:٢/١٠(٢)الارشاد المفيد:١/٢٤١ (٣) رجال الكشي:١/٧٩
(٤)منهاج السنة:١/٧(٥)المنتقى من منهاج السنة النبوية:٣٤ (٦) ايضاً

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

’’جو شخص حضرت ابوبکر و عمر اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہم) پر سب وشتم کرے میں اسے اسلام میں نہیں سمجھتا۔‘‘(۱)

علامہ ابن حزم اندلسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

’’پورا فرقہ امامیہ چاہے اس کے متقدمین ہوں یا متاخرین اس بات کا قائل ہے کہ قرآن مجید بدل ڈالا گیا ہے۔اور اس میں وہ کچھ بڑھایا گیا ہے جو اس میں نہیں تھا، اور اس میں سے بہت کچھ کم بھی کر دیا گیا ہے۔‘‘(۲)

’’روافض مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔‘‘(۳)

قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

’’جو شخص ایسی بات کہے جس سے امت گمراہ قرار پائے، اور صحابہ کرام کی تکفیر ہو ہم اسے قطعیت کے ساتھ کافر قرار دیں گے۔

-اسی طرح ہم اس شخص کو بھی قطعیت کے ساتھ کافر قرار دیں گے جو قرآن کا یا اس کے کسی ایک حرف کا انکار کرے، یا اس میں کوئی تبدیلی کرے یا زیادتی کرے۔

-اسی طرح ہم غالی شیعوں کو ان کے اس قول کی وجہ سے قطعی کافر قرار دیتے ہیں کہ ان کے اماموں کا درجہ نبیوں سے اونچا ہے۔ (۴)

شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

’’شیعوں کے تمام گروہ اس بات پر متفق ہیں کہ امام کا تعین اللہ تعالیٰ کے واضح

---

(۱)الصارم المسلول: ۵۷۱ (۲)النحل فی الملل: ۱۸۱/۳

(۳)أیضا: ۷۸/۲ (٤)أیضا: ۸۲-۸۳۔ کتاب الشفاء: ۲۸۱/۲، ۲۸٦، ۲۹۰

حکم سے ہوتا ہے- امام معصوم ہوتا ہے- حضرت علی تمام صحابہ سے افضل ہیں-آنحضرت (ﷺ) کی وفات کے بعد حضرت علی کو امام وخلیفہ نہ ماننے کی وجہ سے چند ایک کے سوا تمام صحابہ مرتد ہو گئے- ان کا عقیدہ ہے کہ امام کو دین ودنیا کی تمام چیزوں کا علم ہوتا ہے۔"(۱)

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"عصر حاضر کے ان مرتدین سے اللہ کی پناہ! یہ لوگ کھلم کھلا اللہ، اس کے رسول، اس کی کتاب اور اس کے دین کے دشمن ہیں، یہ اسلام سے خارج ہیں، یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے ساتھیوں سے عداوت رکھنے والے ہیں اور اسی طرح مرتد اور کافر ہیں جسے وہ مرتدین تھے جن سے حضرت ابوبکرؓ نے جنگی کی تھی۔"(۲)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"ہمارے دور کے رافضی تمام اہل سنت والجماعت کی تکفیر کا اعتقاد رکھنے کے علاوہ اکثر صحابہ کرام کی تکفیر کرتے ہیں لہٰذا بغیر کسی اجماع کے بالاجماع وہ کافر ہیں۔"(۳)

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

صحابہ پر طعن کرنا درحقیقت پیغمبر پر طعن کرنا ہے، جس نے رسول اللہ (ﷺ) کے صحابہ کی توقیر نہ کی وہ رسول اللہ (ﷺ) پر ایمان لایا ہی کب؟ جو احکام شرعیہ قرآن واحادیث کی راہ سے ہم تک پہنچے ہیں، وہ صحابہ کے ذریعہ سے ہی

---

(۱)غنیۃ الطالبین: ۱۵۶ (۲)منہاج السنہ: ۲/۱۹۸

(۳)ارشاد الشیعۃ، از: مولانا سرفراز خان: ۲۰۹، وتتمہ مظاہر حق

تو پہنچے ہیں، صحابہ قابل طعن ہوں گے تو جو چیزیں انھوں نے نقل کی ہیں وہ بھی قابل طعن ہوں گی، ان میں کسی پر طعن وتبرا کرنا دین پر طعن کرنا ہے۔(۱)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

شیعوں کی اصطلاح میں امام معصوم ہوتا ہے، اس کی اطاعت فرض ہوتی ہے، اللہ کی طرف سے مخلوق کی ہدایت کے لیے مقرر کیا جاتا ہے، اس پر باطنی وحی آتی ہے، پس در حقیقت وہ ختم نبوت کے منکر ہیں، اگر چہ زبان سے آنحضرت (ﷺ) کو خاتم الانبیاء کہتے ہیں۔(۲)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''جو شیعہ حضرت عائشہؓ پر تہمت لگاتے ہیں وہ مؤمن نہیں ہیں۔''(۳)

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''جو سیدہ عائشہؓ پر تہمت لگائے، یا ابو بکر صدیقؓ کی صحابیت کا انکار کرے، تو اس کے کفر میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔''(۴)

مولانا عبد الباری فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''جو اہل اہواء دعویٰ اسلام کے باجود ضروریات دین میں سے کسی بات کے منکر ہیں خواہ ان کا انکار کسی رکیک تاویل ہی کی بنیاد پر ہو ان کے کفر میں اور ترکہ کے مستحق نہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں جیسے کہ غالی روافض کا معاملہ ہے، جو قطعیات دین کی تکذیب اور ادعاء تحریف قرآن وغیرہ کی وجہ سے خدا اور رسول اللہ (ﷺ) کی تکذیب کرتے ہیں۔(۵)

---

(۱) مکتوب امام ربانی بنام مرزا فتح اللہ شیرازی (۲) تفہیمات الہیہ :۲۴۴ (۳) تفسیر مظہری: ۳۰۶/۸ (۴) رد المختار: ۲۹۴/۲ (۵) تاریخی دستاویز از ابو ریحان ضیاء الرحمٰن فاروقی: ۶۰

مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

شیعہ بے ادب ہر چند کہ کلمۂ توحید زبان سے کہے لیکن مسلمان نہیں ہوسکتا، اگر ایک آیت قرآن شریف کا کوئی کلمہ گو منکر و مکذب ہے تو وہ کافر ہوتا ہے، کلمہ پڑھنے یا قبلہ کی طرف رخ کرنے سے مؤمن نہیں ہوسکتا، اذیت محبوب رسول خدا' اذیت رسول اللہ ہے، اور موذی رسول کا کافر ہے، ایسے شریروں کی تکفیر وتسفیق ہر مسلمان پر واجب ہے۔(۱)

فاضل بریلوی احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''بالجملہ ان رافضیوں تبرائیوں کے باب میں حکم قطعی اجماعی یہ ہے کہ وہ علی العموم کفار مرتدین ہیں، ان کے ہاتھ کا ذبیحہ مردار ہے، ان کے ساتھ مناکحت نہ صرف حرام بلکہ خالص زنا ہے، معاذ اللہ مرد رافضی اور عورت مسلمان ہوتو یہ سخت قہر الٰہی ہے، اگر مرد سنی اور عورت ان خبیثوں میں کی ہو جب بھی ہرگز نکاح نہ ہوگا، محض زنا ہوگا............ مسلمانوں پر فرض ہے کہ اس فتویٰ کو بگوش ہوش سنیں اور اس پر عمل کرکے سچے پکے مسلمان سنی بنیں۔''(۲)

مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوئی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''شیعہ اثنا عشری قطعاً خارج از اسلام ہیں، ہمارے علمائے سابقین کو چونکہ ان کے مذہب کی حقیقت کما حقہ معلوم نہ تھی بوجہ اس کے کہ یہ لوگ اپنے مذہب کو چھپاتے ہیں، اور کتابیں بھی ان کی نایاب تھیں، لہٰذا بعض محققین نے بنا بر احتیاط ان کی تکفیر نہیں کی تھی مگر آج ان کی کتابیں نایاب نہیں رہیں، اور ان کے مذہب کی حقیقت منکشف ہوگئی، اس لیے تمام محققین ان کی تکفیر پر متفق ہوگئے ہیں۔(۳)

---

(۱)ھدایة الشیعہ: ۱٤ (۲) ردالرفضہ: ۲۹

(۳) تاریخی دستاویز از ابوریحان ضیاء الرحمٰن فاروقی: ۶۰

حرف آخر

شیعیت کو عام طور پر اسلام کا ایک فرقہ یا مکتب فکر گردانا جاتا ہے، اور شیعہ ریاست ایران کو دنیائے اسلام کی ایک اکائی سمجھا جاتا ہے، اس انداز فکر کی معقولیت یا نامعقولیت کو سمجھنے کے لیے شیعیت کے حقیقی اور بنیادی نظریات، اس کے اغراض و مقاصد اور سیاسی تاریخ میں اس کے کردار کا گہرائی سے مطالعہ اور بے باک تجزیہ، نیز قرآن، رسالت اور صحابہ کرام سے متعلق ان کے عقائد کو ان کی مستند کتابوں کی روشنی میں جاننا ضروری ہے، اسی مقصد کے تحت زیر نظر کتاب میں شیعیت کی حقیقت، یہودیت سے وابستہ اس کے آنے بانے اور اس کے حقیقی خد و خال کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس تصنیف کا بنیادی مقصد امت مسلمہ کو اس دشمن سے باور و ہشیار کرانا ہے جو مار آستین سے کم نہیں، کیونکہ عصر حاضر میں امت مسلمہ جن اہم مسائل سے دوچار ہے ان میں ایک اہم مسئلہ دوست اور دشمن میں ادراک کا فقدان ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کی سیاسی اور نظریاتی پالیسیاں اکثر ناکامی کا شکار رہی ہیں، پس جب تک مسلمانان عالم اپنے درمیان اور اطراف میں رہنے والے دوست و دشمن کی شناخت نہیں کرتے یہ افسوس ناک سلسلہ جاری رہے گا۔

راقم اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب رہا ہے اس کا فیصلہ آپ معزز قارئین کے سپرد ہے، امید ہے کہ علم دوست حضرات راقم کی بے اعتدالیوں اور خامیوں سے ضرور مطلع کریں گے تاکہ نقائص کو دور کیا جاسکے اور احقاق حق کا فریضہ پورا ہو سکے۔

﴿وَالَّذِينَ جَاؤُوا مِن بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾